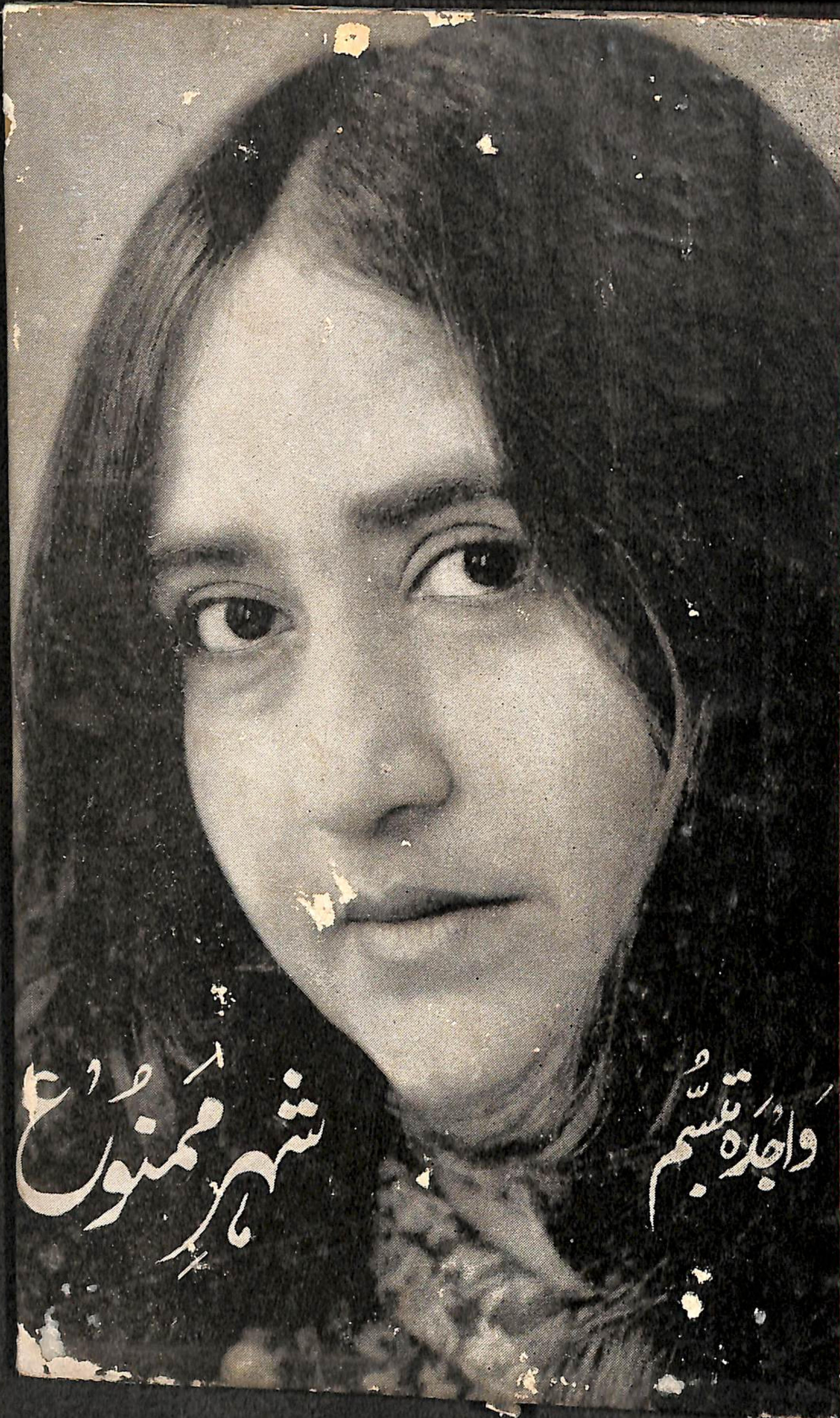

شہرِ ممنوع
واجدہ تبسم

شہر ممنوع

واجدہ تبسم

اورسیز بک سنٹر

سلسلہ مطبوعات نمبر ۶

بار چہارم

مئی ۱۹۷۸ء

قیمت .... ۲۵ روپے

تعداد اشاعت .... ایک ہزار ۱۰۰۰

ناشر:۔ سراج الدولہ

اورسینز بک سنٹر ۵۲ جوہو وِلے پارلا اسکیم

بمبئی نمبر ۵۸

کاتب ولی محمد خاں عفی عنہ

اپنی نانی امّاں کے نام

فہرست

ایک بات

"میری کہانی" لکھنے سے قبل میری آنکھوں کے سامنے داغ کا یہ مصرعہ تھا۔

"شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"!

میں نے بہت سوچا۔ بہت سوچا کہ مجھے اپنے حالاتِ زندگی لکھنے چاہئیں یا نہیں؟۔ کیا اس طرح کچھ کھو دینے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔؟ یا کچھ ملتا بھی ہے،؟ کچھ بھی ہو۔ میں نے سوچا۔ "کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی ہے اب"۔ اور جہاں تک "شرکت غم" کا سوال ہے، میں نے اپنے دکھڑے اس لئے نہیں روئے ہیں کہ کسی کو اپنے غم میں شریک کروں کیونکہ اب تو غم صرف ماضی بن گیا ہے۔ اور مجھے تو اس غم کی روداد بس یوں سُنانی تھی کہ کہ آپ نے میری افسانہ نگاری کے بارے میں پوچھا تھا۔ اسی لئے میں اپنے یہ مختصر سے حالاتِ زندگی سُنا کر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔

واجدہ تبسم

۲۹ر دسمبر ۱۹۵۹ء - حیدر آباد دکن

میری کہانی

مجھے افسانے لکھتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہونگی کہ میری چار برسوں کی محنت آپ کے سامنے ہے؟ کیونکہ جہانتک محنت کا سوال ہے میں نے افسانے لکھنے میں کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے تو افسانہ نگاری یوں شروع کی کہ محنت اور کاوش کا کوئی سوال ہی نہ اٹھا۔ مجھے ایک طرح سے اپنی افسانہ نگاری کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس کی وجہ سے میرے دل کا بوجھ ہلکا۔ میں آپ سے بتاؤں اگر میں افسانے نہ لکھتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن میرا دل پھٹ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ میں افسانے لکھنے لگی اور دل میں چھپے ہوئے غم اور احساسات جب ایک ایک کر کے لفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو میں نے جانا کہ اب میں کبھی نہ مر سکوں گی۔ یہاں میرے ایسا کہنے سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ اس طرح "میں کبھی نہ مر سکوں گی"۔ جیسے سیدھے سادے جملے میں جتانا چاہ رہی ہوں کہ "اب میں ایسی مانی ہوئی فنکار ہو گئی ہوں کہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مر گئی تو کیا ہوا میرا فن تو مجھے زندہ رکھے گا"؟

"جی نہیں" ایسی کوئی خوش فہمی مجھے اپنے متعلق نہیں ہے۔ اور خوش فہمی رہے بھی کیوں؟ ابھی میں نے لکھا ہی کیا ہے؟ ویسے جی چاہتا ضرور ہے کہ اتنی بڑی فنکار بن جاؤں کہ میرا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ دل میں لگن تو موجود ہے ہی۔ مگر اپنی افسانہ نگاری کا خیال آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بال سے بندھی دو دھاری تلوار سینے پر لٹک رہی ہے۔ اب گری کہ اب گری۔ یہ چار سال اسی دھکدھکاہٹ میں گزرے ہیں۔ کیا پتہ یہ تلوار کب گر جائے اور یوں قصہ پاک ہو جائے۔ کانٹوں بھری اس راہ پر چلتے ہوئے

کئی بار میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ ابھی ابھی گر پڑوں گی۔ مگر سخت جان ایسی تھی کہ کبھی نہ مر سکی۔ جی ہاں کہہ لیجئے کہ "بھئی واجدہ تم بڑی بزدل لڑکی ہو۔" لیکن آپ کے کہہ دینے سے کیا ہوگا؟۔ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفان لگایا جا سکا ہے؟۔ آپ نے مجھے بزدل کہہ دیا۔ اور میں نے مان بھی لیا۔ لیکن اس ایک لفظ بزدل کے پیچھے جو ایک لمبی چوڑی داستان چھپی ہے اسے سُنکر آپ کیا فیصلہ کریں گے؟۔

ان چار سالوں میں کئی کئی بار مجھ سے میرے حالاتِ زندگی جاننے کی فرمائش کی گئی۔ اس جذبے کی تلاش اور جستجو کی گئی جو میری افسانہ نگاری کا محرک بنا۔ ہمیشہ ٹالتی گئی، سوچتی ہوں آج موقع آیا ہے تو کہتی ہی چلوں۔ پھر آپ میں سے جو مجھے بزدل کہہ رہے ہیں خود ہی فیصلہ کریں گے کہ حق پر کون تھا۔ لیکن اب جب کہ اپنے حالات زندگی اور افسانہ نگاری کے بارے میں "کچھ" لکھنے بیٹھی ہوں تو بُری طرح ہنسی آ رہی ہے۔ مجھ ایسی لڑکی کے حالاتِ زندگی! اور پھر افسانہ نگاری؟ حالاتِ زندگی ہی تو کمبخت ایسے تھے جنھوں نے افسانہ نگاری پر مجبور کر دیا۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ اس طرح تو وہ راز بھی کھول دینے پڑیں گے جو دل بن کر سینے میں دھڑک رہے ہیں۔ آنسو بن کر آنکھوں میں مچلتے رہے ہیں۔ اور مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر بکھر گئے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آج ان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا حساب لے کر ہی رہیں گے ــــ!

اپنی چھاچھ کو کوئی گوالن کھٹا نہیں کہتی۔ مگر میں وہ بے رحم نقاد ہوں جو کبھی جانبداری سے کام نہیں لیتا۔ پھر میں آپ کے سامنے یہ کیوں کہوں کہ میرا ماحول میرے لئے بڑا ساز گار تھا؟ اگر میں یہ جھوٹ کہہ بھی دوں تو میری کہانیاں چغلی کھا دیں گی پھر میں سچائی سے کام کیوں نہ لوں۔

میرا گھرانا سیدوں کا وہ گھرانا تھا۔ (جی ہاں صیغۂ ماضی کیونکہ اب تو ہم نے بقول کسے "فارورڈ"

ہو کر بزرگوں کی ناک کٹا ڈالی ہے) جہاں پردے کی سخت قید و بند تھی اور لڑکیوں کی کسی قسم کی آزادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ حد یہ ہے کہ میرے ابّا نے ہم بہنوں کو اسی لئے اسکول میں داخل نہ کروایا کہ "لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں"۔ تین سال کی عمر میں جب ہمارے سروں سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا تو پھر چچا نے نانی اماں سے بڑی منتیں کیں اور یوں ہمیں اسکول میں داخلہ مل گیا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اس طرح تو ہماری نگرانی کی اور زیادہ ضرورت تھی۔ (کیا پتہ ہم کب پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتے) اور وہ حسب ضرورت کی بھی جاتی تھی۔ ہماری بہنوں میں جو بہن تیسرے نمبر پہ تھی وہ بڑی ذہین اور ذرا خودسر قسم کی تھی۔ اسے جب اسکول میں داخل کروایا تھا اس وقت اس کی عمر صرف تین سال تھی۔ ٹھیک سے بات کرنی بھی اسے نہ آتی تھی۔ مگر "قصّے کہانیاں" پڑھنے کا اسے وہ شوق تھا کہ پوچھئے نہیں۔ ظاہر ہے ابھی الف بے بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا مگر جوں جوں وہ پڑھنا سیکھتی گئی اس کا یہ شوق پختہ ہوتا گیا۔

ان دنوں ہمارے ہاں بہت سارے رسالے آیا کرتے تھے۔ 'شمع' سے لیکر 'جہالستان'، 'آریہ ورت'، 'اودھ کا میاب' تک۔ اور اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لیکر بے تک چاٹ جایا کرتی۔ جنوں یہیں پر ختم نہیں تھا۔ گھر کا ماہانہ سودا سلف جن کاغذوں میں، رسالوں کے پھٹے ہوئے صفحوں میں بند ہو کر آتا تھا وہ میرے لئے سب سے بڑی دلچسپی تھے۔ میں وہ سارے کاغذ سمیٹ کر کونے میں جا بیٹھتی اور ہر ادھورا اور مکمل مضمون پڑھ ڈالتی۔ میرا دل چاہا کرتا ساری دنیا کا علم گھول کر پی جاؤں۔ — جی نہیں میں نے غلط کہا، یہ "علم" والی ترکیب تو میں اب یعنی ایم۔اے ہو کر لکھا سکتی ہوں۔ ۹ ان دنوں میں چوتھی یا پانچویں میں پڑھتی تھی اور علم کا کوئی واضح تصور

اپنے ذہن میں نہ رکھتی تھی۔ یوں کہیے ہر تحریر پڑھ جانے کی دل میں تمنا رکھتی تھی۔ چاہے وہ کیسی ہی گری پڑی کیوں نہ ہوتی۔

ابھی تک تو میں آپ کو صرف اپنے شوق کے بارے میں بتاتی آرہی ہوں، ابھی میں نے آپ کو اپنے "حالات" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دونوں چیزوں کو، یعنی حالات زندگی اور افسانہ نگاری کو، الگ الگ کر بھی نہیں سکتی۔ میرا دل چاہا کرتا کہ کبھی بازار جاؤں اور اچھی اچھی کہانیوں، والی کتابیں خرید لاؤں مگر شاید آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا کہ پیسہ ان دنوں سورج ہوا کرتا تھا؟ دور سے جھلک دکھانے والا۔ جس کی کتنی ہی تمنا کریں ہاتھ نہیں آسکتا۔ بڑی عجیب بات تو یہ ہے جناب کہ (کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے) میری امی ایک نواب خاندان سے تھیں۔ ابّا شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مجھے نہیں پتہ۔ مگر میں بچپن سے سنتی آرہی ہوں کہ انہوں نے لاکھوں سے روپیہ کمایا۔ کمایا بھی اور گنوایا بھی۔ اور جب مرے ہیں اس وقت دفنانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ امی کی بات نہ پوچھیے وہ تو بڑی رئیس تھیں۔ جہیز میں ڈھیروں سونے کے علاوہ پانچ گاؤں ساتھ لائی تھیں۔ نانی اماں آج بھی کہتی ہیں کہ " اگر میں نے اس سونے کا آدھوں آدھ بھی اٹھا کر رکھ دیا ہوتا تو میری چاروں نواسیاں اور بہوئیں سونے میں پیلی رہتیں۔" (ہم آٹھ بہن بھائی ہیں) مگر نانی اماں نے تو ایک ماشے کا تار بھی اٹھا کر نہ رکھا۔ یہ کھیلا بچپن تک تو کبھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ مگر آج تو ہر بات آئینہ کی طرح روشن ہے پہلے میری امی مریں۔ (اس وقت میں ایک سال کی تھی) اس کے دو سال بعد میرے ابّا بھی چل دیئے (اچھے لوگ تھے بے چارے، جو ہر فکر سے آزاد ہو گئے) میں نے آپ سے ابھی بتایا ہے نا کہ میرے ابّا بہت فضول خرچ تھے۔ اپنی کمائی تو گنوائی ہی گنوائی۔ امی کا جہیز بھی گنوایا۔ قرضوں کے ڈھیر لے رکھے تھے۔ جانے کتنا قرضہ تھا

کہ ساری دولت چپ چپاتے غائب ہوگئی۔ نانی اماں یوں نہ کرتیں تو جانے اس عزت کا کیا حشر ہوجاتا جو برسوں سے "خاندانِ سادات" کے سر پرتاج بن کر جگمگاتی رہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ ''بابا مرے تو کفن بھی دوسروں نے پہنایا۔ جب یہ صورت حال نظر آئی تو ظاہر ہے سب رشتے دار سناٹے میں آ گئے اور ایک ایک کرکے کھسکنے لگے (رشتہ دار ناک بھوں نہ چڑھائیں میں تو صرف اپنی کہانی سنا رہی ہوں) جب گھر خالی رہ گیا تو صرف ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے جنہیں سوائے نانی اماں کے اور کسی کا آسرا اور سہارا نہ تھا۔

نانی اماں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر میں روپیوں پر چلتی تھیں (یہ مبالغہ نہیں، افسانوی تراشش نہیں، حقیقت ہے!) بے حساب تھیلیوں میں بے حساب روپے ہوتے اور انھیں جگہ نہ ہونے کے کارن کوٹھری میں اناج کے بوروں کی طرح اوپر تلے ٹھونس دیا جاتا۔ اب وہی نانی اماں رہے سہے زیورات کو توڑ توڑ کر ہماری تعلیم و تربیت کر رہی تھیں۔ گاؤں سے زمینوں کا پیسہ بھی آجاتا تھا اور یوں زندگی گزر رہی تھی بڑی بے رنگی اور بے دلی سے۔ عموماً ہم لوگ جوار کی روٹی اور دال کھاتے تھے۔ اور اپنے اپنے بستے لٹکائے انگریزی پڑھنے اسکول میں جاتے تھے تو لال گرجا کے پاس ایک بہت اونچا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے پھاٹک پر ہری بھری بیل جھومتی تھی جس میں سرخ رنگ کے پھولوں کے بے حساب گچھے لٹک رہے ہوتے۔ رنگ برنگے پھولوں کے گملوں کی دورویہ قطار دور تک چل کر پھاٹک سے مل جاتی۔ پورٹیکو میں گہرے نیلے رنگ کی لمبی سی کار کھڑی ہوا کرتی اور عین ہمارے وہاں سے گزرنے کے ٹائم تین چار بچے، ہنستے، اچھلتے پردے جھلاتے ڈرائنگ روم سے باہر آتے اور قہقہے لگاتے ہوئے کار میں چڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی آیا۔ ساروں کے بستے سمیٹے، فرنٹ سیٹ میں بیٹھ جاتی اور

کار زُوں زُوں کرتی یہ جا وہ جا۔ سڑک پر ہلکی سی گرد اڑتی اور وہ خاک ہمارے حلق میں پہنچتی۔ میرے بستے کا بوجھ میری جان لے ڈالتا۔ اور سیمنٹ روڈ پر چلتے چلتے میں سوچنے لگتی کہ مروں گی تو اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ دل دفن ہے جو زندگی بھر خوشی کے لئے روتا رہا"

تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ صورتِ حال یہ تھی تو کتابوں کے لئے روپے کہاں سے آتے؟ نانی اماں بے چاری کا تو ناطقہ بند تھا۔ کبھی نہ کبھی ایک آدھ بہن بھائی اڑ جاتا۔

"میں تو انڈا کھاؤں گا"

"اوں اوں ــــ میں تو گھی شکر کھاؤں گی"

نانی اماں کہتیں۔ "گھی شکر؟ یہ کون بڑی بات ہے! مگر بچو میں تو گھی شکر چوہے سے مانگ کر لایا کرتی ہوں۔ اور اس چوہے کو بچے بہت نا پسند ہیں۔ بس تم اوپر چلے جاؤ۔ یا پھر اپنی آنکھیں بند کر لو" ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے سچ مچ رکابی میں گھی شکر موجود۔ اگر ہم میں سے کبھی کسی نے گھی کھایا ہوتا تو اصلیت بھانپ جاتا۔ مگر ہم تو سچ مچ ہی بچے تھے پتہ نہیں کیسے۔ بہت دنوں بعد، ایک دن یہ بھید کھل گیا کہ وہ چوہے ماموں بے حد فراڈ تھے کمبخت ہمیشہ گھی کی بجائے پانی کھلاتے رہے۔ پتہ نہیں کتنا پانی اور شکر ہم گھی شکر کے دھوکے میں کھاتے رہے۔

میں تو کبھی ایک پیسے کی کتاب بھی اپنے لئے نہ خرید سکی۔!! کبھی نانی اماں سے کہا بھی تو انہوں نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ "اچھی بیٹیاں کتابیں نہیں پڑھا کرتیں"۔ اور یوں بھی ان کی تنبیہہ جاری ہی رہتی تھی کہ الا بلا نہ پڑھا کرو۔ لیکن یہ منا ہی ابھی ظالم نہ بنی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

ہماری ماما غائب ہوگئی۔ کھانا پکانے کی سخت مشکل جا رہی تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا کرتیں کہ "ایک ماما لا دو۔ مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی دیکھ بھال ہی نہیں ہوتی، کھانا کیسے پکاؤں؟"۔

مامائیں لائی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رجیکٹ کردی جاتیں۔ ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں صحن میں بیٹھی کی بھاجی توڑتی بیٹھی تھیں بھیا لوگ تخت پر ہوم ورک کرتے بیٹھے تھے۔ بہنیں پڑھ رہی تھیں۔ اور میں شطرنجی پر سر نیہوڑائے، پنسل منہ میں دبائے بہت انہماک سے بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ایک ماما کو باہر سے بھجوایا۔ نانی اماں حسبِ معمول جرح میں مشغول ہوگئیں۔ میں نے یونہی ایک بار سر اٹھا کر دیکھا، ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ میں پھر کاپی پر جھک گئی۔

نانی اماں نے اِدھر اُدھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا۔

"تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے؟"

"مرد تو چار سال ہوئے مر گیا"۔

میں نے لیمپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا۔ کاپی بند کی، پنسل نیچے رکھی اور برآمدے میں آکر بڑے معتبر انداز میں بولی۔

"کیوں جی! تمہارا مرد تو مر گیا، پھر یہ بچہ کہاں سے آیا؟"۔ (میری عمر اس وقت آٹھ یا نو سال رہی ہوگی)

پتہ نہیں اس سوال میں کون سے دھماکے کا اثر تھا کہ نانی اماں آکدم بھونچک رہ گئیں۔ پہلے تو انھوں نے دیدے ٹپ ٹپا کر اپنے نواسوں کو دیکھا پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر چلا کر کہا "اور پڑھنے دو اسے رسالے"۔

میں اکدم چکرا گئی۔ اپنے سوال کی نوعیت پر غور کیا تو کوئی برائی اس میں نظر نہ آئی۔ میں ابھی سراسیمہ سی کھڑی تھی کہ نانی اماں گرجیں۔

"آج سے تیرے ہاتھ میں کوئی رسالہ دیکھوں"!

میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا کہ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں ملی۔ نانی اماں بھائیوں سے الجھنے لگیں۔ میرے ایک بڑے بھیا ہمیشہ میری سائڈ میں رہتے تھے۔ اگر کبھی نانی اماں پڑھنے کو منع کرتیں تو ہمیشہ کہا کرتے۔ "نانی اماں اسے پڑھنے سے نہ روکئے بہت ذہین ہے۔ آگے چل کر یہ خود بھی کہانیاں لکھے گی" اب نانی اماں انھیں کے پیچھے پڑ گئیں کہ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چل کر کیا ہوگا۔؟ شاید وہ بھی لاجواب ہو گئے۔ مگر میں رات گئے تک بستر میں ساکت وصامت لیٹی رہی۔ میری سمجھ میں پھر بھی نہ آسکا کہ میں نے ایک جملہ میں کون سا گناہ کر ڈالا تھا۔؟ اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے (بچپن میں ہم کس قدر بیباک ہوتے ہیں!)

اس دن سے خوشیوں کے دروازے مجھ پر بند ہو گئے۔ اور میری خوشیاں ہی کیا تھیں؟ پڑھنا ——— پڑھنا ——— بس پڑھنا ——— اب یوں ہونے لگا کہ جہاں میں نظروں سے ذرا اوجھل ہوئی نانی اماں نے پکارنا شروع کیا۔

"وہ بدذات کدھر ہے؟ کہاں غائب ہو گئی؟"

میں نے ابھی آپ سے بتایا تھا نا کہ میں ان دنوں بہت سوچتی تھی کہ اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ پھول دفن ہے جو بھری بہار میں مرجھا گیا"

میں بچپن ہی سے غیر معمولی حساس ہوں جس بات کو آپ بھول کر بھی مائنڈ نہ کریں، میں اسی بات پر گھنٹوں روتی ہوں۔ آج بھی میری یہی فطرت اور عادت

ہے۔ اس دلِ حساس نے مجھے اتنا رلایا ہے مگر پھر بھی مجھے اپنی فطرت کا یہ پہلو پسند ہے۔ میں جیتی ہی اس کے سہارے ہوں (ایک دن میں یونہی غلطی سے ایک چیونٹی کو مار بیٹھی۔ قصور میرا تھا بھی نہیں۔ وہ میرے پیر تلے آ گئی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی پیر ہٹایا تو وہاں مری ہوئی چیونٹی پڑی تھی۔ اس حادثے نے مجھے تین دن تک ملول رکھا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے بچے ہوں؟ اس کے منہ میں شکر کا دانہ بھی تو تھا۔ اب کون اس کی جگہ لے سکے گا۔؟)

اب مجھے اپنے سائے سے بھی ڈر ڈر کر چلنا پڑتا تھا۔ میں جہاں بھی تنہائی پاتی فوراً اُدھر کا رُخ کر لیتی۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ تین منزلہ۔ اِدھر اُدھر بڑے بڑے آنگن، برآمدے، دالانے؟ کافی جگہیں ایسی تھیں جہاں میں چوری چھپے پڑھ سکتی۔ مگر اس دن کے بعد مجھے بہت کم موقعے ملتے کہ میں نانی اماں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتی۔ میرے ایک بھائی تھے سگریٹ کے شوقین۔ ان کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ نانی اماں کے ڈر سے وہ اس طرح سگریٹ نوشی کرتے کہ خود کو رضائی میں بالکل چھپا لیتے اور اندر مزے سے سگریٹ دھونکتے رہتے۔ (ان کی اس چوری کا راز یوں کھلا تھا کہ مہربان نے ایک نئی رضائی جلا ڈالی تھی۔) ایک دن میں نے غور سے انھیں دیکھا اور خود بھی اس ترکیب پر عمل کرنے لگی۔ مگر ہوتا یوں تھا کہ اس طرح سر سے پیر تک خود کو ڈھانک لینے سے ایک تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ دوسرے "کمرے" میں اندھیرا بہت ہو جاتا تھا۔ اور الفاظ نظر نہ آتے تھے۔ میں نے اس کے لیے ٹارچ کا انتظام کیا تھا۔ مگر ایک بار یوں ہوا کہ رضائی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ رضائی میں جگہ جگہ سے روئی ہٹ گئی تھی اور یوں روشنی چھن چھن کر باہر جانے لگی تو ـــــ انجام ظاہر ہے۔ مگر ایسی ویسی باتوں سے ہار جانا تو گویا میرے ذوق کی توہین تھی۔ میرا ذہن

نت نئے طریقے ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں مجھے کبھی کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ ہمیشہ سے میرا اصول رہا ہے کہ امتحان سے چند دنوں پہلے ایک دو بار گہری توجہ سے پوری کتابیں دیکھ ڈالیں اور بس معاملہ ختم۔ مگر میں گھر والوں پر یوں پوز کرتی تھی کہ جیسے میں بڑی بکش (BOOKish) بڑی ہی پڑھاکو ہوں۔ جب دیکھو تب کتاب منہ سے لگی ہے۔ (یہ مدتوں کا راز ایک دن کھل ہی گیا) میں کرتی یہ تھی کہ کورس کی کتابوں یا کاپیوں میں اندر ناول اور رسالے رکھ رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں، مگر میں تو دوسرے ہی امتحان کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ حد یہ ہے (ممکن ہے آپ میں سے بہت سے یقین کریں بھی ناں) کہ عین امتحان کے دنوں میں بھی ناول پڑھا کرتی۔ بدبختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن ایک رسالہ کاپی میں چھپا کر پڑھ رہی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کام بتایا۔ میں نے یونہی رسالہ اور کاپی زمین پر رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کاپی پتلی تھی۔ اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اڑ کر دور جا پڑی اور رسالہ نمایاں ہو گیا۔ کسی مہربان بھیا نے یہ واردات نانی اماں سے جا بتائی۔ نانی اماں نے اتنا مارا کہ میرا بے ہوش ہونا باقی رہ گیا۔ یہی میری زندگی تھی۔ یہی میرے ذوق و شوق کا انعام۔!!

میں ان دنوں زندگی سے سخت بددل ہو رہی تھی۔ انہی دنوں مجھ پر ٹائیفائڈ کا شدید حملہ ہوا۔

میرے ابا بہت ہی حسین و جمیل آدمی تھے۔ خاندان میں تو ان سا کوئی تھا ہی نہیں۔ سڑک پر بھی نکل جاتے تو لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ امی حسین نہیں تھیں۔ رنگ سانولا تھا۔ بال لمبے لمبے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ اتنی روشن آنکھیں

کہ آنکھوں کا اجالا گالوں پر پڑتا تھا۔ میں نے اپنی امی کو نہیں دیکھا، ان کی تصویر بھی نہیں ہے۔ ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی اچھی آنکھیں بس کہانی کی خیالی ہیروئن کی ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں کے میل سے جو بچے ہوئے وہ جیسے کچھ بھی تھے، مگر شاید میری بد نصیبی تھی کہ اپنے سب بہن بھائیوں میں معمولی میں تھی۔ اور مزید ستم یہ کہ بچپن ہی سے بیمار رہتی چلی آرہی تھی۔ تندرست اور نک سک سے درست بہن بھائیوں میں ایک میں بھی تھی جس کا رنگ سانولا تھا، جسم دبلا پتلا، کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال اور بجھی بجھی آنکھیں، قد کی مناسبت سے بال بہت لمبے نظر آتے۔ یوں سب لوگ مجھے چڑیل یا کالی بلّی کہہ کہہ کر ستایا کرتے۔ میں شدید احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم عمروں سے محبت نہ پا کر میں نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی کتابوں کو بنایا تھا۔ (یہ بات تو مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینی چاہئے تھی) بیماری جھیل کر اٹھی تو اور زیادہ چڑچڑی اور زود رنج ہو گئی۔ احساس دگنا ہو گیا۔ زندگی تلخ ہو گئی۔ میں آپ سے بتاؤں، ان دنوں کتابوں کا سہارا نہ ملا ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ لکھ رہی ہوتی۔

سب طرف سے ہار کر میں نے مطالعہ ہی جی لگایا۔ اس طرح لامحالہ میں کلاس میں فرسٹ رہنے لگی۔ استانیاں بہت خوش رہتیں۔ میں نے اپنی ذہانت سے ایک ناجائز فائدہ یہ اٹھایا کہ مس سے یہ پرمیشن حاصل کر لی کہ میں لائبریری سے جتنی چاہوں اتنی کتابیں لے لیا کروں۔ میری ریڈنگ ہمیشہ سے بے حد فاسٹ ہے۔ دو تین سو صفحوں کی کتاب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کر ڈالتی ہوں۔ مس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔! اور یہ میری زندگی کی سب سے پہلی خوشی تھی۔ معصوم مسرّت۔!

ہم لوگ چونکہ بہت غریب تھے اس لئے پیدل ہی اسکول جایا کرتے۔ غریبی میں لوگ اپنے بچاؤ کے کیسے کیسے جواز ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے پیروں میں درد کی شکایت

تو نانی اماں نے جھٹ کہہ دیا۔

"پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔"

کتابوں کا لالچ مجھے مارے ڈالتا۔ پاؤں پاؤں چلتے چلتے میرے چھوٹے چھوٹے پیر دکھ کر رہ جاتے۔ اس پر مزید کوشش یہ کہ جلد سے جلد اسکول پہنچ جاؤں تاکہ خوب پڑھ سکوں۔ سیمنٹ روڈ والے بنگلے سے جب کار چکر کھاتی نکلتی تو دل کو پختہ یقین ہو جاتا کہ اللہ میاں چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے انھیں اب دنیا کا انتظام چلانا نہیں سوجھتا۔ یہ تک یاد نہیں کہ کسے موٹر کی ضرورت ہے اور کسے نہیں۔ خوب ہیں اللہ میاں آپ بھی۔

میں تو بس یہی سوچتی ہوں کہ خداوند دو عالم نے میرے نصیب میں کتنی کم خوشیاں رکھی ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء کی آمد اور ہمارا وطن چھوڑ کر حیدر آباد آنا۔ یہ زندگی کا بڑا عجیب موڑ ہے۔ یہاں پہنچ کر تو زندگی کے ستم کچھ اور بھی سوا ہو گئے۔

اب ہم بہنوں نے مڈل اسکول پاس کر لیا تھا۔ بھیا لوگ کالجوں کو جاتے تھے۔ اخراجات پہلے سے زیادہ تھے اور ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں کم۔ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت نانی اماں کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کا بھرواں جوڑا تھا۔ ۶۰ تولے کا۔ ساٹھ تولے کی کوئی حقیقت نہیں۔ نانی اماں نے جب بھی ضرورت پڑی ایک ایک چوڑی توڑ ڈالی مجھے یاد ہے ہر بار جب سروتہ لیکر نانی اماں اندھیرے کمرے میں جایا کرتی تھیں تو ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا۔ مگر مجھے یوں لگتا تھا چوڑی کے ساتھ میرا دل بھی کٹ جائے گا۔ کتنی بار چوڑیاں ٹوٹیں۔ کتنی بار دل کٹا۔ مگر اب تو زیور بھی نہ تھا جس کو توڑ تاڑ کر اخراجات

پورے کیے جاتے۔ لے دے کر گاؤں اور زیبنات کی چند ہزار کی آمدنی رہ گئی تھی جس سے سال بھر تک خرچ چلتا۔ زمینداری سسٹم لاگو ہوا تو وہ زیبنات بھی حکومت کے بھاک میں چلی گئیں ـــ !

(سنتے ہیں زیور سنگھار کے کام آتا ہے۔ ہمارا زیور تو سدا رہن رکھنے یا توڑنے کے کام ہی آیا ـــ !)

پارٹیشن کے وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ امراؤتی سے حیدر آباد دکن کا سفر ہم نے تیرہ دن میں طے کیا۔ ان تیرہ دنوں میں میں نے تیرہ صدیوں کا تجربہ سمیٹا ہے۔ میں کس قدر بوڑھی ہوں اس کا احساس سوائے میرے اور کس کو ہو سکتا ہے؟ حیدر آباد آکر ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں اس کا اندازہ آپ یوں لگائیے کہ اب تک جیسے ہم شاہی زندگی گذارتے آرہے تھے۔! مصیبتیں کیا ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ یہاں آکر چلا۔ ہمارے پاس کھانے کو اناج نہ تھا پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ رہنے کو مکان نہ تھا۔ پھر بھی ہم جی رہے تھے اور خوش تھے۔ کتابیں خریدنے کو پیسے نہ ہوتے تھے۔ فیس کا وقت آتا تو ہم کلاسوں سے باہر کھڑے کر دیئے جاتے۔ ان دنوں میں نویں کلاس میں تھی کلاس کی سب سے ننھی طالبہ تھی اور سب سے ذہین۔ سب سے غریب اور سب سے زیادہ بدنصیب۔!!

حیدر آباد آکر سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ میرا مطالعہ جیسے ختم ہو کر رہ گیا۔ لائبریری میں اس قدر اچھی اچھی کتابیں تھیں !!

اے نئد تو حدا ننیمت دے۔

وہیں کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ اپنی آنکھوں لمبے بالوں، سانولی رنگت اور میٹھی آواز کی وجہ سے کلاس بھر میں وہ "بنگالی مینا" کے نام سے مشہور تھی۔ اُستانیاں

پیار سے اسے "خوش آواز پرندہ" کہا کرتیں۔ قریبی سہیلیاں اسے "بلبل" یا "کوئل" کہہ کر پکارتیں۔

وہ خوش آواز پرندہ میں تھی۔! میں نے اوروں سے اپنے بارے میں بہت سنا تھا لیکن کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک دن میں اپنی کرسی پر بیٹھی بے دلی سے کچھ گن گنا رہی تھی۔ میرے بازو والے ڈیسک پر ایک لڑکی بیٹھی لائبریری سے لی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گن گناتا سن اس نے کتاب بند کردی اور کہا۔

"واجدہ ذرا زور سے تو بھی گاؤ۔"

میری نگاہ کتاب سے جا ٹکرائی۔ وہ منشی پریم چندر کا ناول "گئو دان" تھا۔ میں نے ذرا جھجھک کر کہا۔

"ایک شرط پر۔"

"کون سی شرط؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"میں تمھیں گانا سناؤں گی اور تم بدلے کے طور پر مجھے یہ کتاب پڑھنے کو دو گی۔"

شرط ایسی کوئی کڑی نہ لگی اسے۔ میں نے اسے ایک فلمی گیت سنایا۔ نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی۔ اور پھر غالب کی وہ مشہور غزل۔

— تسکیں کو ہم نہ روئیں جو..... کتاب میرے ہاتھوں میں تھی۔!

یہ سودا مجھے بہت سستا پڑا۔ کیونکہ اس طرح گانا سنا دینے سے میرا کچھ نہ بگڑتا تھا مگر مجھے بدلے میں کتابیں مل جایا کرتیں۔ پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاس کی تمام لڑکیوں سے یہی سودا نپٹنے لگا۔ جتنی کتابیں میں نے ان دنوں پڑھیں ان کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ دنیا اتنی وسیع ہے؟ کتنے ہی رائٹر گذرے ہیں۔ جنھوں نے کیا کچھ نہیں لکھا ہے؟ میں نے کیا پڑھا؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ مگر

اپنے نامساعد حالات کے باوجود میں نے جتنا کچھ پڑھ لیا ہے اس پر فخر کرتی ہوں۔
(حالانکہ میں نے سمندر سے قطرہ بھی نہیں اٹھایا ہے۔)

پھر پولیس ایکشن ہوا۔ پھر سے شہر میں بھگدڑ مچی۔ ایک بھیا پاکستان چل دیئے ایک آگے ہی وطن میں تعلیم پوری کرنے چلے گئے تھے۔ نہ دماغی چین تھا، نہ جسمانی آرام۔ ہوا یہ کہ نتیجہ میں ہم بہنوں کو اسکول سے اٹھا لیا گیا۔

"کیا میں یونہی جاہل رہ جاؤں گی؟" یہ سوال رہ رہ کے میرے مجروح دل اور دماغ کو کچوکے دیتا۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا بچپن ہی سے اتنا شوق تھا کہ جہاں دوسری بہنیں گڑیاں اور ہنڈکلیا کھیلا کرتیں میں محلے کے بچّوں کو لے کر اسکول لگایا کرتی۔ پھر اللہ میاں کا یہ ستم کیسا تھا۔؟ نانی اماں سمجھاتیں۔

"بٹیا تم لوگ سیّد ہو۔ اللہ کے پیارے۔ اور اللہ انہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو انھیں پیارے ہوتے ہیں۔"

اللہ میاں سے اسی مارے بچپن سے ٹھنی رہی۔ نماز آج بھی پنجوقتہ پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ نماز پڑھ کر یوں محسوس ہوا گویا اللہ پر احسان فرمایا ہے۔

"دیکھ لیا نا آپ تو ہمارے لئے کچھ نہیں کرتے مگر ہم آپ کے حضور پر سر جھکائے جاتے ہیں۔"

نانی اماں حج کر آئی ہیں۔ جب کبھی خدا کو برا کہا انہوں نے کان پکڑوا کر توبہ کروائی اور ہمارے گناہوں کی معافی خود مانگی۔ مگر اللہ میاں کو "ناانصاف" کا خطاب جو میں نے بچپن میں دیا تھا کبھی واپس نہ لیا۔

"بس فیس"، میں دیر ہوئی تو اسکول کی بس آنی بند ہوئی۔ کلاس فیس میں دیر ہوئی تو پہلے کلاس باہر، پھر اسکول باہر۔ چلئے قصّہ ختم۔ میٹرک، پھر الیف، اے

بھر بی۔ اے اور اب ایم اے سب پرائیویٹ پڑھانے والا کوئی نہیں کبھی ایک مہینے تک کے لئے کسی کی ٹیوشن نہ لی۔ جو پڑھا دل سے پڑھا۔ امتحان دیا۔ پاس ہوئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔

الیف۔ اے کا امتحان جیسے دیا۔ دل ہی جانتا ہے۔ نہ کتابیں تھیں۔ نہ کھانے کو تھا ان دنوں راشن سے چنے اور پکی ہوئی کھجوریں ملتی تھیں۔ جن کے پاس تھا وہ تو خرید کر بلیک سے اناج حاصل کر بھی لیتے۔ ہم جیسے کہاں سے لاتے؟ جس دن امتحان دینے چلی یہ حال تھا کہ پیٹ میں اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ کتابیں بھی نہ مل سکی تھیں معاشیات کا پرچہ تھا۔ جو لکھا تھا آج بھی یاد ہے۔ سوشیالوجی کا پرچہ بھی یونہی کیا۔ پورے پرچے میں اشعار، سرمایہ داری کو گالیاں۔ ایک آپا قریب سے گذریں اور سوشیالوجی کے پرچے میں شعر لکھا پایا تو جھک کر پڑھا۔ ہنس کر بولیں۔

"کمیونسٹ ہو گئی ہو؟"

میں جل کر بولی تھی۔ "تن پر کپڑے نہ ہوں، پیٹ میں روٹی نہ ہو اور کوئی کہے کہ میں ننگا ہوں۔ بھوکا ہوں اور آپ اسے کمیونزم کہتی ہیں تو بے شک میں کمیونسٹ ہوں۔"

نتیجہ آیا۔ آج تک حیرت ہوتی ہے میں پاس کیسے ہوئی۔ . !

وہ نام نہاد سورج، جس کے دم سے روشنی کا تصور قائم ہے کبھی میرے آسمان پر نہ چمکا۔ میں نے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا وہاں گھٹائیں تنی ہوئی دکھائی دیں۔ بی۔ اے کے وقت بھائیوں نے کہا۔ "اردو بھی کوئی لینے جیسی چیز ہے۔ اکنامکس Main دو تاکہ کچھ قدر بھی رہے۔" بہکاوے میں آ گئی۔ جس وقت کو سیچن پیپر بانٹنے کی بیل بجی اور پیپر فلیسر نے کہا۔

"جس جس کا اکنامکس مین ہو کھڑی ہو جائیں۔" تو پورے ہال میں صرف

ایک لڑکی کھڑی تھی وہ بھی ایک پرائیویٹ کینڈیڈیٹ اور وہ ملی تھی۔ !
یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی۔ پہلی تعلیمی شکست۔ میں آج تک کبھی فیل نہ ہوئی تھی۔ بچپن سے اب تک ہمیشہ اونچے نمبرات لیئے تھے۔ اتنا غم ہوا کہ آنکھ نم بھی نہ ہوئی۔ مگر اس میں کیا میری اپنی ذہانت کا تصور تھا۔ مجھے تو ڈھنگ کی ایک کتاب بھی نہ مل سکی۔ پڑھنے والے بھلے ہی یقین نہ کریں۔ مگر میں نے زندگی میں کون بات جھوٹ کی ہے۔! دوسری بار پھر لی۔ اے میں بیٹھی، پھر لڑھکی۔ میرے خدا! "مجھ میں بہت ہمت ہے کم از کم تعلیم تو ضرور پوری کر دوں گی اپنی"۔ میں نے اپنے دل کو سنایا۔ ان دنوں کی بات بتاؤں، تن پر صرف ایک جوڑا ہوا کرتا تھا۔ بھائیوں کی قمیص پتلون پہن، ہیم صاحب بنی، وہ جوڑا دھوتی اور پھر امتحان دینے مزے سے دُھلی دھلائی ساڑھی پہن کر جاتی۔ غریبی کے داغ کس نے دیکھے ہیں ؟

اچھی طرح یاد ہے صبح پرچہ تھا۔ رات کو ہم لوگ بھوکے ہی سوئے تھے۔ اچانک دہلی سے ایک کزن بھائی آ ٹپکے۔ یہ بھائی بڑے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ آتے ہی کہا۔

"بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا لاؤ"۔

میں رضائی سے چہرہ باہر نکالے چھت کو دیکھتی پڑی تھی۔ ان کی بات سن کر میں نے چہرہ بھی رضائی میں چھپالیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے، پھر جانے کیا سمجھ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔ باہر سے آئے تو ہاتھوں میں کیک، پیسٹری اور سالٹی اسنیکس کے پیکٹ تھے۔ میں نے آہٹ پاکر آنکھیں کھولیں انھیں لدا پھندا دیکھا تو پھر سے سوگئی۔ صبح میری آنکھیں خون رنگ تھیں۔ سب کہتے ہیں میں اپنی ماں پر گئی ہوں۔ میرا رنگ سانولا ہے مگر اس صبح میں نے آئینہ دیکھا تو چہرہ زرد چاند ہو رہا تھا۔

میں نے امتحان دیا۔ نتیجہ آیا۔ پاس بھی ہوگئی۔ زندگی کی کافی بڑی تمنا تھی کہ گریجویٹ ہو جاؤں۔ ہو بھی گئی۔ مگر دل کو جیسے گھن لگ گیا۔ زندگی سے دل بھر گیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ایک بار زہر کی بوتل منہ تک لے بھی گئی۔ مگر افروز (میری چھوٹی بہن میری دوست) نے دیکھ لیا۔ روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ میرے انتہائی لمبے لمبے بال، جن کی وجہ سے میں بچپن میں چڑیل اور پھر بعد میں "لمبے بالوں والی واجدہ" کے نام سے مشہور تھی۔ جھڑ جھڑا کر ڈیڑھ ہاتھ کے رہ گئے۔ کھانسی رہنے لگی اور وزن دن بدن گھٹنے لگا۔ نانی اماں ایک دن ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اس نے صاف کہہ دیا۔

"اگر بٹیا کے علاج پر توجہ نہ دی تو خطرہ ہے۔ یہ راستہ ایک خطرناک گھاٹی میں جاکر ختم ہوتا ہے"۔ نانی اماں سہم گئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ "مرغی کے چوزوں کا سوپ پلائیے۔ پھل دیجیے۔ دودھ پلائیے۔ اور۔ اور۔ اور" اب میں یہ آپ سے بتا رہی ہوں کہ ڈاکٹر نے ٹانک اور گولیاں لکھ کر دیں غذا کے بعد لوں یا پہلے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کبھی کبھار ہی کھانا پکتا تھا۔ پہلے یا بعد کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ وہ ٹانک اور گولیاں مدتوں پڑی رہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں، افروز اور آپی مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھیں تو میں نے وہ ٹانک اور گولیاں پھینکی ہیں۔ (مگر ان یادوں اور آہوں کو نہ پھینک سکی جو اتنے ہی دنوں سے دل کو چھیدے ہوئے ہیں۔)

انہی دنوں دلی سے ایک ویکلی "آئینہ" شائع ہونے لگا۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا۔ "میری یادداشت سے" اس کے تحت کوئی ناقابل فراموش واقعہ اپنی یادداشت سے چن کر لکھنا پڑتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ایک دن یونہی وہ واقعہ لکھ ڈالا جو مجھے انٹر کا امتحان دیتے وقت پیش آیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا سکون ملا جو میں کبھی لفظوں میں بیان نہ کرسکوں گی۔ اس احساس کو، اس کیفیت کو

بیان کرنے کے لئے شاید مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے۔ جو میرے اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس رات جب وہ روداد لکھنے کے بعد میں اپنے بستر پر لیٹی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں، جو ایک مدت سے کڑی دھوپ میں چلتی آ رہی ہوں۔ آج ٹھنڈے سائے تلے آ گئی ہوں۔!

یوں میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

میرے اپنے ذاتی دکھ کے علاوہ بھی کئی واقعے اور حادثے ایسے تھے جنھوں نے میرے دل کو کرچی کرچی کر رکھا تھا۔ اب میں بڑے انہماک سے انھیں لفظوں کا روپ دیتی اور چھپوانے کو بھیج دیتی۔ ابھی میری چند کہانیاں ہی چھپی ہوں گی کہ اکدم سے جیسے تہلکہ مچ گیا۔ ادبی حلقوں کا ذکر میں یہاں نہیں کر رہی ہوں، اپنے خاندان والوں کی بات سنا رہی ہوں۔ ممکن ہے آپ سوچیں کہ خاندان والے اب اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے جتنی گنا رہی ہوں۔ مگر یہ سوچئے! ہم آٹھ بہن بھائیوں کو نانی اماں نے پالا اکیلی جان اور آٹھ وجود۔ ماں باپ مرے اس وقت سب سے بڑی اولاد دس برس کی تھی۔ اتنے سارے روتے تلملاتے بچے، جن کی تعلیم و تربیت، دکھ درد، اچھے بُرے میں بس نانی اماں ہی تھیں۔ کوئی کسی کا سگی ساتھی نہیں ہوتا اس لئے میں خواہ مخواہ رشتے داروں، خاندان والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کروں کہ انھوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا؟ ہر انسان کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ اور اس کے اعمال اس کے اپنے ساتھ۔ کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ کسی کا ساتھ دے۔ اس کی قسمت بنائے۔ مگر نانی اماں خاندان والوں سے یوں ڈرتی تھیں کہ اگر کل کلاں کو ہم جاہل رہ جاتے اور بری صحبت میں پڑ کر ناکارہ ہو جاتے تو یہی خاندان والے طعنے دیتے کہ "دیکھا!؟ کیسے اولاد کی تربیت کی ہے؟" اس ایک طعنے سے بچنے کے لئے نانی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے؟ نانی اماں

خدا نہ تھیں مگر میں نے انھیں سجدے کیے ہیں۔) تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ اب اِدھر اُدھر سے جو دو چار میری کہانیاں چھپیں تو گویا زلزلہ ہی آ گیا۔

"واجدہ بیگم نے تو عصمت کو بھی مات دیدی۔"

"ارے یہ افسانے کہیں شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں۔؟"

"اس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں۔"

"دیکھنا ایک دن باپ کی ناک کٹوا کر رہے گی۔"

"میری بیٹی ایسے افسانے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی۔"

یہ مقدمے دھیرے دھیرے نانی اماں کی عدالت میں آنے شروع ہوئے۔ پہلے تو بات دبی دبی سی رہی۔ پھر زور شور سے میرے خلاف محاذ بننے لگا۔ کسی سلسلے میں نانی اماں وطن گئیں۔ وہاں لوگوں نے خوب کان بھرے۔ واپس آئیں تو نانی اماں مجھ سے سخت برہم تھیں۔

انہی دنوں میری کہانی "تین جنازے" چھپ کر آئی تھی۔ نانی اماں پرچہ لیکر آئیں اور ڈٹ گئیں کہ "میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی۔ بتا تو کیا لکھتی ہے؟" کہانی آپ کے سامنے ہے، بتائیے بھلا میں یہ کہانی سنا سکتی تھی۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اس سچی حقیقت کو کہانی کا روپ دیا۔ اب میرا کام یہ تو نہ تھا کہ کہانیاں سناتی پھرتی۔ میرے نہ سنانے پر نانی اماں کو شبہ ہو گیا۔ بلکہ یقین ہو گیا کہ یقیناً "ایسی ویسی" کہانیاں یہ لکھتی ہے تب ہی تو سنا نہیں سکتی۔ میں نے گھبرا گھبرا کر اپنے ڈیفنس میں کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اب جناب یہ مصیبت کہ جہاں میں نے قلم کاغذ ہاتھ میں لیا نانی اماں آموجود ہوئیں۔ "بتا کیا لکھ رہی ہے؟ سنا کیا لکھ رہی ہے؟" نانی اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں مگر انھیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر میرے ہاتھوں میں

لمبا چوڑا کاغذ ہے یا کاغذوں کا پلندہ ہے اور میں نے کہہ دیا کہ خط لکھ رہی ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کریں گی۔

"خط اتنے بڑے بڑے لکھے جاتے ہیں؟ ضرور کہانی لکھ رہی ہے۔

اب مصیبت یہ رہی کہ ایڈیٹروں کے جو خط آتے اور جاتے سب کچھ نانی اماں سنسر کرتیں۔

محترمی ایڈیٹر صاحب۔

آپ نے کہانی مانگی ہے۔ اس وقت تو نہیں ہے۔

جب لکھوں گی فوراً بھجوا دوں گی۔

"کیا لکھا۔ جب لکھوں گی۔! مگر یہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔؟"

پھر کسی نامراد نکمے۔ بیوقوف ایڈیٹر کا خط آگیا کہ کہانی مل گئی۔ ارے کمبخت مل گئی تو اطلاع دینا کوئی ضرور تھا۔ لیجئے اب نانی اماں سُن رہی ہیں۔

"کہانی مل گئی۔ آپ نے کمال کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب آپ آسمانِ ادب کا سورج بن کر چمکیں گی۔"

"یہ کہانی کب بھجوائی تھی۔؟"

یہ گھڑا اچھا سبھ! بخدا زندگی اجیرن ہوگئی۔ میں نے دل سے، حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ "اب سے کبھی کوئی چیز نہ لکھوں گی۔ کون یہ جوکھم مول لے۔ کوئی زندگی سی زندگی ہے؟"

کئی دن گذر گئے، میں نے کچھ نہ لکھا۔ ایک دن ایک ماموں تشریف لائے۔ پامسٹری سے بڑا لگاؤ ہے انھیں۔ میرا ہاتھ دیکھا۔ پہلے تو خاصی بکواس فرماتے رہے۔ پھر سیریس ہو کر بولے۔

"اری سچ ملکہ تیرے ہاتھوں میں ایک خاص بات ہے۔ تجھے ضرور شہرت ملے گی۔

اور خوب ساری۔"

میں نے آزردہ ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "ماموں میرا دل نہ جلائیے۔ ہاتھ آیا موقع تو کھو گیا۔ اب کون شہرت کا تنک ہے۔"

اس شام نانی اماں کہیں مہمان گئیں تو میں اپنی قسم بھول گئی اور ایک کہانی فوراً لکھ ڈالی۔ "آگ میں پھول"۔ لفافے میں بند کر کے رکھ بھی لی۔ دوسرے دن چوری سے نوکر کے ہاتھ میں لفافہ دیا تو جانے کیسے نانی اماں کی نظر پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے۔؟" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

وہ جھوٹ کیوں بولتا؟ صاف کہہ گیا۔" ملکو بی بی نے خط دیئے۔ بولے غپ چپ ڈال کر آجا۔"

اس کمبخت "غپ چپ" نے وہ آگ لگائی کہ پوچھئے نہیں۔ دوسرے ہی لمحے آنگن میں آگ اور پھول بکھرے نظر آرہے تھے۔ میرے خدا۔

میں سہم کر رہ گئی۔ بزدل لڑکی۔

پھر ایک پھوپھی آئیں۔ میرا ذکر بیچ میں آیا۔ میرا نام زیر بحث آیا۔

"اچھا تو اسی کا نام واجدہ تبسم ہے۔"

ابو نے میرا نام واجدہ بیگم رکھا۔ امی کو جانے مجھ میں کیا پایا ہونے کے آثار نظر آئے۔ کہا کہ میں تو اپنی اس بیٹی کا نام ملکہ رکھوں گی۔ بچہ ماں کا زیادہ ہوتا ہے۔ باپ کا کم۔ امی کا رکھا نام چل نکلا۔ بگڑا تو کسی نے ملکہ کہنا شروع کیا۔ کسی نے ملکو اور کسی نے ملکی۔ مگر جب اسکول میں داخلے کی نوبت آئی تو ابا والا نام لکھایا گیا۔ " واجدہ بیگم" مگر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو خود کو واجدہ تبسم بنالیا۔ صاف سیدھی بات ہے، زندگی نے مجھے غم ہی غم دیئے۔ میں اپنی زندگی میں مسکراہٹیں بھر لینا چاہتی تھی۔

اور یہی کیا بھی ۔ اس طرح خود میرے خاندان میں بھی پہلے پہل بہت کم لوگوں کو پتہ چلا کہ میرا ہی نام، "واجدہ تبسم" ہے۔

باتوں باتوں میں "تین جنازے" کا ذکر آگیا۔ کہنے لگیں۔ "یہ کہانی تم نے ہی لکھی ہے نا۔"

میں ڈر کر صاف جھوٹ بول گئی۔ "جی نہیں وہ تو فکر تونسوی نے لکھی ہے۔"

جس زمانے میں شاہراہ میں وہ کہانی چھپی اسے فکر صاحب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔

گھبراہٹ میں جو منہ سے نکلا وہی کہہ گئی۔ "مگر کہانی پر نام تو تمہارا دیا ہوا ہے۔"

اب کے میں بہت معتبر انداز سے جھوٹ بنھانے لگی۔ "دیکھئے نا دراصل ہوتا یوں ہے ۔۔۔۔" میں نے اس قدر الٹ پلٹ باتیں کیں کہ بعد میں خود اپنی بے بسی پر مجھی کو رونا آگیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اپنی کہانی کو اپنی نہیں کہہ سکتی تھی ۔ دل کا سارا غبار آنکھوں کے راستے نکل پڑا ۔ جاتے جاتے جب وہ سمجھانے لگیں تو یہ بھی کہا۔ "دیکھو بٹیا ہم تمہارے ہی بھلے کی کہتے ہیں۔ تمہارا خاندان دیکھو۔"

ابھی وہ کچھ کہتی ہی تھیں کہ اکدم واجدہ زور سے بول پڑی۔ "کٹے گی تو میرے باپ کی ناک کٹے گی، آپ کا کیا بگڑے گا ؟ جب میرا باپ مرا تھا اور نانی اماں اکیلی رہ گئیں تھیں، تب آپ کو ہمارے بھلے کی نہ سوجھی۔ اب ہم کسی قابل ہوئے ہیں تو آپ کیوں اپنائیت جتانے آن پہنچی ہیں ؟"

وہ یقیناً میں نہ تھی ۔ واجدہ تھی ۔ جو ایک کہانی لکھنے والی تھی ۔ جو اپنے مستقبل کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی ۔ کیونکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں جو ہوں تو ایک بہت ہی بزدل لڑکی ہوں ۔ ہاں جناب ! اس دن ڈول چھلکا اور ایسا چھلکا کہ پھر کسی نے میرے سامنے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے پیچھے تو کہتے ہی رہے۔

وہ بھی جو کہنا چاہیئے۔ اور وہ بھی جو نہ کہنا چاہیئے۔
(میں پہلے واجدہ تھی۔ پھر تبسم بنی۔ مگر اس ایک مسکراہٹ کے لئے کتنے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکے۔؟)

ایک بار ایسے ہی کسی موقعے پر میں نے ایک اور نام نہاد عزیز سے کہا تھا۔
"جی آپ تو آپ ہیں۔ اگر قبر سے میرا باپ بھی اٹھ کر آجائے تو بھی میں افسانے لکھنا نہیں چھوڑوں گی۔"

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں چار سال پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈرتے تھے کہ واجدہ خاندان کی، رشتہ داروں کی ناک کٹا دے گی۔ اب میرے پیچھے اپنے ملنے والوں سے فخریہ کہتے پھرتے ہیں کہ "ارے وہ واجدہ تبسم! میری بھتیجی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے ــــ ہاں ہاں وہ واجدہ نا ــــ میری عزیز ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔ اس کے باپ تو میرے دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بٹیا نے۔"

آپ یقین کریں مجھے ان باتوں سے نہ خوشی ہوتی ہے نہ فخر محسوس ہوتا ہے۔ رنج بھی نہیں ہوتا، غصہ ضرور آتا ہے۔ اور میں تو بچپن ہی سے تنک مزاج ہوں۔ بس جی چاہتا ہے جو لوگ میرا نام لے کر فخر محسوس کرتے ہیں ان سے کہہ دوں
" معاف کیجئے آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے!"

پہلے کے مقابل اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ مگر پھر بھی نانی اماں مجھ سے تھوڑی بہت بدگمان ضرور ہیں۔ انھیں ایک شکایت یہ ہے کہ میں انھیں اپنی کہانیاں نہیں سناتی۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ ہے بھئی اپنا بوتا نہیں جو نانی اماں کو کہانی سنا سکیں۔ ایک بار بار بار کے کہنے پر۔ افروز نانی اماں کو

میری کہانی سنانے بیٹھی۔ اس میں لفظ محبت اس انداز سے آیا کہ نانی اماں گڑبڑا گئیں۔

"ہیں۔ کیا پڑھا۔؟ محبت ۔۔ کس کو محبت ۔۔ کس سے۔؟ اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ عشق عاشقی کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ ہوں تو یوں کہو"

اسی لئے میں کہانیاں سب سے چھپ کر لکھتی ہوں۔ ایک بے حد نازک اور اندھیارے کونے میں۔ اگر آنگن سے ہو کر کوئی اس کمرے میں آئے تو دکھائی بھی نہیں دے سکتا کہ کونے میں کوئی متنفس بھی ہے۔ بانو (جیلانی بانو) جب پہلی پہلی بار مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تو اس نے وہ جگہ دیکھنی چاہی، جہاں بیٹھ کر میں "ادب تخلیق" کیا کرتی تھی۔ پہلے تو اُسے یقین ہی نہ آیا کہ ایسی واہیات جگہ بیٹھ کر کوئی سانس بھی لے سکتا ہے۔ مگر جب میں نے اسے ٹوٹا ہوا پین، زنگ آلود چاقو، چھوٹی سی دوات لال آدھی پنسل کا ٹکڑا اور تازے آئے ہوئے رسالوں کے ساتھ فرش پر بے شمار سیاہی کے چھینٹے پڑے ہوئے دکھائے تو اسے یقین کرنا پڑا۔ گھر جا کر اس نے لکھا تھا۔

"وجو چندا۔

میرا مشورہ ہے کہ تم اس کونے سے نکل کر آسمان تلے آجاؤ
اگر سورج کا اجالا بھی تمہاری کہانیوں میں آجائے تو
کیا کہنے ؟"

میں نے اس سے کہا تھا۔

"میں کسی سورج کی مرہون منت نہیں ہونا چاہتی۔ میں خود سورج بنکر اس کونے کو منور کر دوں گی۔" سورج بن جانے کی یہ تمنا میرے دل

میں آج بھی موجود ہے۔ بانو کے علاوہ اور بھی بہتوں نے مجھ سے یہ بات کہی ہے، میں صرف گھریلو کہانیاں لکھتی ہوں۔ میری کہانیوں میں کوئی خارجی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آخر دنیا میں اور بھی تو موضوع ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مجھے عورتوں کا ایسی کہانیاں لکھنا پسند نہیں جن میں کسی بڑے اہم موضوع کو سمیٹا گیا ہو۔ جیسے امن، جنگ، ہڑتال۔ یہاں کسی موضوع کی قید نہیں۔ ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کرنے والی عورتیں، جنہوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی، یوں ایسی کہانیاں لکھنے لگیں جن میں امن کا ذکر ہو۔ کسی جنگ کی تفصیل ہو یا کمیونزم یا کسی اور ازم کا پروپیگنڈہ ہو تو کس قدر غلط سی بات ہوگی۔ یہ بات طے ہے کہ آپ اس وقت تک کسی مسئلے پر کامیابی سے نہیں لکھ سکیں گے۔ جب تک کہ آپ نے شئے متعلقہ سے گہری واقفیت نہ حاصل کرلی ہو۔ اگر میں یہاں حیدرآباد دکن میں بیٹھ کر کراچی کے غنڈوں پر کوئی کہانی لکھنا چاہوں تو کیسی بھونڈی بات ہوگی۔ میں کسی کے میدان کو محدود نہیں کرنا چاہتی، صرف اپنے متعلق کہہ رہی ہوں کہ میں ایسے کردار کبھی نہیں چنوں گی جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ کرشن چندر "مہالکشمی کا پل" ایسی کہانی بڑی خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے نہ صرف بمبئی دیکھی ہے، بلکہ وہ مرد ہے اور اس نے باہر کی سیر بھی کی ہے۔ ایسے میں اس کے قلم سے جو کہانی نکلے گی بڑی پختہ ہوگی۔ کوئی بات ایسی نہ ہوگی جس کے متعلق کہا جا سکے کہ "مسٹر آپ نے کبھی بمبئی کی گلیاں دیکھی ہیں؟ کبھی نعرے لگاتے ہوئے جلوسوں کے ساتھ گھومے ہیں۔؟" برخلاف اس کے اگر آپ کرشن سے پوچھیں کہ "بریانی میں کتنی سرخ

مرچیں ڈالتے ہیں۔؟" اور وہ یہ جواب دیں کہ "سیر بھر کی بریانی میں آدھ پاؤ مرچیں" تو یہاں ان کے "مشاہدے اور تجربے" کی پول کھل جائے گی۔ آپ جانیں بریانی میں مرچ تو پڑتی ہی نہیں۔ کرشن بریانی نہیں پکا سکتا۔ میں مہا لکشمی کے پل پر کوئی کہانی نہیں کھڑی کر سکتی۔ کیونکہ ہم دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ خود اپنے سے بھی، اور پڑھنے والوں سے بھی، یوں بے ایمانی کر کے فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ ہم صرف انہی موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمارے دل کو یہ ڈبکا بھی نہیں لگا رہتا کہ کہیں ہم ادب کے نام پر دھوکہ بازی تو نہیں کر رہے ہیں۔؟

لوگ مجھ سے کہتے ہیں۔ "تم کب تک گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہو گی۔؟ باہر نکلو، دنیا میں گھوم پھر کے دیکھو کیا ہو رہا ہے اور پھر اچھی اچھی کہانیاں لکھو۔ تمہاری کہانیوں میں تو آجا کے وہی ایک سی باتیں ہیں۔" چلئے مان لیا کہ میری کہانیوں میں وہی ایک سی باتیں ہیں۔ مگر ذرا یہ بھی سنئے ـــ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں ہوش و حواس کے عالم میں، ریل میں پہلی بار، صرف تین سال پہلے بیٹھی ہوں؟ پارٹیشن کے وقت تو پتہ نہیں کیسے ہم حیدرآباد تک آ پہنچے، مگر جہاں تک ہوش و حواس کا سوال ہے میں نے ریل کی شکل صرف تین سال پہلے دیکھی ہے۔ یہ سوال آپ کو قطعی غیر ضروری نظر آئیگا۔ مگر آپ یوں بھی تو سوچیں کہ وہ لڑکی، جو خود کو ڈبڑھیا لکھتی ہے، جو پہلی بار بڑھاپے میں ریل میں بیٹھی ہو۔ وہ دنیا کے متعلق کیا سوچ سکتی ہے۔؟ کیا لکھ سکتی ہے۔ شاید ریل میں بیٹھنا نصیب ہوتا بھی نہ، مگر بھیا کی شادی ناگپور میں ٹھیری۔ برات لیکر تو جانا ہی تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کے بارے میں بڑے بڑے اندازے لگا رکھے تھے۔ لیکن جب دیکھا تو سخت

مایوسی ہوتی۔" ارے باس اسی واہیات سی چیز کے اتنے ڈھنڈورے تھے؟
پلیٹ فارم ایسا اور پلیٹ فارم ویسا۔ خاک بھی گلیمر نہ تھا کمبخت میں!" اب ریل
میں بیٹھی ہوں تو یہ عالم ہے کہ مارے ڈر کے دم نکلا جارہا ہے۔ کیونکہ ریل پل پر سے
گذر رہی ہے گھڑ گھڑ دھڑ دھڑ کی وحشت ناک آوازیں! اور مجھے ہر لمحہ یہ ڈر
محسوس ہو رہا ہے کہ بس ابھی ابھی ریل پانی میں گر پڑے گی۔ قریب بیٹھا ہوا ایک
کرسچین جھلا کر بولا۔

"OGosh! The most coward creture give ever seen!"

(" اوگاش ــــ دی موسٹ کاورڈ کریچر آئیو ایور سین!")

جس لڑکی کے بارے میں ایک غیر ملکی یہ ریمارک پاس کرتا ہے، اس سے آپ
یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا پر کہانیاں لکھے۔؟ نا بابا نا۔ یہ ہم سے نہ ہوگا۔ ایسا
کیا ہم مرے جا رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھیں گے، تب
لکھیں گے ایسی کہانیاں۔ جب مرنے کا سیزن تھا۔ تب تو نہ مرے، اب کیا
مریں گے۔؟ اب تو جینے کے دن آرہے ہیں۔

ویسے آپ یقین مانئے آپ میں سے کوئی میری کہانیوں کو برا کہتا ہے
تو مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ (اور آپ میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے میری
کہانیوں کو برا کہا ہے۔!) اگر آپ اچھا کہہ دیتے ہیں تو خوشی بہت مل جاتی ہے۔ اور
یہ خوشی مجھے یوں ملتی ہے کہ میں نے جن کرداروں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے
انھوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو متاثر ضرور کیا ہے۔ ایسے میں مَیں اس دکھ اور کرب
کو بھول جاتی ہوں جو کہانی لکھنے میں مجھے پیش آیا تھا۔؟ دلیپ نے آپ سے کہا ہے ناکہ

مجھے کہانیاں لکھنے میں کسی قسم کی "محنت" نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے اپنی طویل سے طویل کہانیاں بھی ایک ہی Sitting میں لکھی ہیں!) "شہر ممنوع" میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ شاید نہ لگا سکیں کہ جب یہ کہانی لکھ رہی تھی۔ میرا دل کیسے کیسے روتا تھا۔؟ پڑھنے والوں نے مجھ سے کہا کہ "ایسی کہانی شاید اب تم کبھی نہ لکھ سکو گی"؛ (مگر مجھے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور خون رلانے والی کہانی جو محسوس ہوتی ہے وہ "گلستان سے قبرستان تک" ہے)۔

"کالے بادل" لکھتے سمے میں جس کرب اور امتحان سے گزری اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ پیسہ کتنی حقیر شے ہے۔ مگر پھر بھی اس کو سجدے کیئے جاتے ہیں۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے خدا نے خود ہی انسان کو پیدا کیا۔ اور خود ہی اس کی زندگی میں غم ہی غم بھر دیئے۔ ہم کون ہیں۔؟ کیوں ہیں؟۔ کہاں سے آئے ہیں۔؟ اس دنیا میں کس لیئے بھیجے گئے ہیں۔!؟ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں [illegible] ہونے لگتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں اگر میں خدا ہوتی، تو۔؟ شاید میں دنیا کو اتنی تباہ حال نہ رکھتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ حالات سے مغلوب ہو کر ہر دکھی دل ایک نہ ایک بار خدا بن جانے کے بارے میں سوچتا ضرور ہوگا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ بڑی اچھی بات ہے جو میں خدا نہیں ہوں، ورنہ مجھے ایسے دکھی دلوں کی اتنی باتیں سننی پڑتیں کہ چوتھے ہی دن آسمان سے اتر آتی اور سیدھی سادی واجدہ، واجدہ تبسم بن جاتی۔ مگر انسان بن کر تو کہیں جائے فرار نہیں۔ اس دنیا میں اپنی جملہ محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود رہنا ہی پڑتا ہے۔

جینا ہی پڑتا ہے۔ مسکرانا ہی پڑتا ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں تو یہی کہہ رہی تھی جناب کہ مجھے کہانی لکھنے میں محنت تو نہیں کرنی پڑتی۔ ہاں شدید کرب سے اکثر گذرنا پڑتا ہے۔ "شہر ممنوع"۔ "گلستان سے قبرستان تک"۔ "ساتواں شہزادہ"۔ "کالے بادل"۔ "پاندان"۔ "گناہوں کی پاداش"۔ "آگ میں پھول" یہ اور ایسی کتنی ہی کہانیاں، کہانیاں نہیں جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں جنہیں میں نے لفظوں کا جامہ پہنایا اور آپ نے کہانیوں کا نام دیا۔

ابھی چار سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ ۲۶ ستمبر ۱۹۵۵ء کو میری پہلی کہانی چھپی تھی۔ اور اب چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں داد بہت ملی۔ "بے داد" کچھ نہیں۔ خودستائی نہیں کر رہی ہوں۔ لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جانتی ہوں کہ میں نے ابھی کچھ نہیں لکھا ہے، کچھ بھی نام پیدا نہیں کر سکی ہوں۔ لیکن سوچتی ہوں کہ ناکامی کی اینٹوں سے ہی تو کامیابی کا محل کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو اتنی ساری کٹھنائیاں اور مصیبتیں جھیل کر بڑھے چلے آنے کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ اب میں زندگی سے کبھی ہار نہیں مان سکتی۔

رہی آپ کی یہ بات کہ مجھے اور دوسرے موضوعات پر بھی لکھنا چاہئے تو میں آپ سے بتاؤں، دنیا کو قریب سے دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی تمنا تو میری بہت پرانی تمنا ہے۔ میری یہ تمنا پوری ہو جائے، میں آپ کی خواہش کا ضرور احترام کروں گی۔ ابھی ابھی تو ایک پنچھی نے اڑنا سیکھا ہے۔ اگر آپ ابھی سے اس سے یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ آسمان تک پرواز کرنے لگ جائے تو بیچارا تھک کر زمین پر نہ آ پڑے گا۔؟

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ "عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔ اپنے تعلق سے جو کچھ کہلوانا تھا، سب خود ہی کہہ ڈالا۔"

جی ہاں بس میں یہی نہیں چاہتی کہ کوئی میرے متعلق وہ سب کچھ کہے جو بہت ہی فارمل ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں 'پیش لفظ' کی وبا بہت عام رہی ہے مجھے ہمیشہ سے پیش لفظ پڑھنے سے چڑ رہی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح قاری کی رائے ہمیشہ متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی نہج سے الگ ہٹ کر سوچنے لگتا ہے۔ اور یوں قاری کی بات جانے بھی دیجئے تو مجھے سرے سے یہ سلسلہ ہی ناپسند ہے۔ بھئی آخر کیا ضرور ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر کسی نہ کسی "بڑے آدمی" کے نام کا لیبل بھی ضرور لگا ہو۔ میں نے تو ان "رایوں" کو بھی روا نہیں رکھا ہے جو ڈسٹ کور پر بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے چپکا دی جاتی ہیں۔ ویسے آپ یقین مانیں کہ میرے پاس کئی "بڑے لوگوں" کے ایسے ایسے خط موجود ہیں جن میں میری افسانہ نگاری کے تعلق سے بڑی خوبصورت باتیں کہی گئی ہیں۔ یوں بھی میرے آس پاس اتنے سارے شفیق اور مہربان چہرے موجود ہیں کہ ان سے اگر جھوٹوں بھی "کچھ" لکھنے کو کہہ دیتی تو بلا مبالغہ وہ ایک طویل سا پیش لفظ میرے لئے لکھ دیتے لیکن مجھے اس تصور سے ہی الجھن ہوتی ہے۔ پیش لفظ دراصل پڑھنے والوں کو بہکانے کا خوبصورت طریقہ ہے، اور مجھے چیپ قسم کی پبلسٹی سے ہمیشہ سے بڑی نفرت رہی ہے۔ انسان میں اگر آگے بڑھنے کی دھن ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے ہی بل بوتے پر بڑھے۔ کسی کی کار میں بیٹھ کر راستہ طے کرنے کی بجائے میں اس چیز کو کہیں زیادہ پسند کروں گی کہ لڑکھڑاتے قدموں سے خود ہی اپنی منزل کو پہنچوں!!

واجدہ تبسم

۲۹ نومبر ۱۹۵۹ء، حیدرآباد دکن۔

فاختہ

بینا ابھی ابھی بستر پر سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

شبیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اکدم انھیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اُسے بڑا نرم نرم، گرم گرم سا پایا۔ جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے انھوں نے زور سے سانس لی اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو اُن کے دل تک اُتر گئی۔ اکدم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو اُن پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ انھوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا۔

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی۔

"تمہیں بلایا ابا میاں ۔؟"

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں ۔!" انھوں نے سدرہ جیر رازدارانہ لہجہ میں پوچھا۔

"نہیں جی ۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں ۔"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا۔" اور انھوں نے ارشد کو پکارا۔ "واہ جی ۔ ہم تو ایکساں منی کے ساتھ کھیل رہے ہیں ۔ ہم نے تھوڑے ہی دھرے گندے پیر آپ کے بستر پر ۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں ۔"

شبیر میاں سن ہو گئے ۔؟ بستر پہ مچلتی ہوئی خوشبو نے انھیں آپ ہی بتا دیا تھا۔ "میں مینا کے پاس سے آئی ہوں ۔!"

انھیں یاد آیا ممانی بی سدا مینا کے لئے بکھا ئیں خوشبو دار مصالحے پسوایا کرتی تھیں ۔ اور مینا ہمیشہ صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے ۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلنے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے ۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی، ملائم سی، میٹھی آواز آئی ۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو ۔ میاں آ گئے ۔"

آج شبیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی ۔ لہجہ بالکل نیا لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے ۔ "اے خانساماں کھانا لگا دو ۔ میاں آ گئے ۔" ممانی بی مینا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بٹیا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں ۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا مینا کی زبان ہکلا گئی ۔

شبیر میاں ممانی بی کے سگے ایسے ہوتے تھے ۔ ایسا بہت دور کا

رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دوہرا رشتہ ہوگیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی، کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کارِ ہو یا گھر کی کاج ہر کام میں شبیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے، شبیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی سی چیز پکی رکابیوں میں لگا۔ سرپوش ڈھک، جھٹ سے نصیبن بوا کے حوالے کشتی کی کہ "جا جلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہنچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی بی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا۔ وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے۔ شریف خاندانی بیوی تھی، دو بچے، مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رفیعہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملنے میں کیا دیر لگتی ہے۔؟ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولہویں سترہویں میں ہی تھی۔ پھر بھی دونوں ایسی گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے ہی "نہ" ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی کہتی ہیں۔

"واہی۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے۔ گن کا، ڈھنگ کا، اور اب اور کیا دیکھیں گے؟"

مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ ممانی بی نے کہا بھی۔ "اے تم ایسی جنم جنم کی دشمن کاہے سے ہوگئی ہو لڑکی کہ منہ توڑ انکار کئے جاتی ہو۔" ہنس کے بولیں "اے ممانی بی! ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کریں ہیں۔"

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ بس نہیں تھی۔ اڑتے اڑتے

اتنا ضرور سُنا تھا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹے کے منہ سے صاف "نہیں" سُن سکتیں، اسی لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنا دی۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں۔ سوچا۔ "اپنی طرف سے تو یہ زور ا زوری سے کہہ نہیں سکتی، ہو گی دونوں کی ملی بھگت۔" خاموش رہ گئیں۔

ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں۔ انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرا دی تھیں۔ "عصمت" تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا۔ اب تو رسالوں کی ڈور بندھ گئی تھی۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سُنا اور مینا نے چندہ بھیجا۔ اتنا یقین تو انھیں بیٹی پر ضرور تھا۔ اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں، مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ ایک مضمون لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرے؟ وہ چھپ بھی گیا۔ سارے خانوادے میں وہ لے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی نہ بن پڑ سکا۔ پانی ایک ہی بار زور توڑ کے راہ بنا لے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے۔ پہلی بات تھی۔ سبھوں میں دھوم سی ہو گئی۔ مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے، الٹے سیدھے ناول، کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی "دولت پر قربانیاں" تھی۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے سرے سے ناک کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنا لیا ساتھ ہی ساتھ

پرانی باتوں کا توڑ بھی اسی نے توڑا۔ چار کلی کے کھڑے پائنچوں کے پاجاموں اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں۔ جگ مگ جگ مگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی۔ جھمکا جھول چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا نکلس ڈال لیتی، اور یہ بھی روز روز نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پر پہن لیا۔ نہ ، د ، بی اپنے کھونڈے ہاتھ، بھونڈا گلا، آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی۔

”اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھونٹھے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی“۔ یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے ہیں کہ ”اے بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے“۔

گھپ اندھیرے میں زور دار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو بیچ بیچ کرنے لگتی ہیں، پھر اسی چھکا چھک اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے الگ ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی، اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔ مینا کو بھی حسبِ قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رقیہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گذر ہوتا، محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر گوناڑی نکلی کچھ سمجھ پڑا۔ کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑے ٹیڑھے ہاتھوں سے

کچی زچہ کو ایسے جھنجھوٹے دیئے کہ الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ ممانی بی کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ بینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا؟ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بڑیا بانی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ چھنو خالہ کا بیٹا حوض میں گر پڑا تھا تو انہوں نے اوندھا لٹا کے سارا پانی نکلوایا تھا۔ مہتو مالی کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رفیعہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اسے مان لیا۔ کہ ڈاکٹرنی نہیں تھیں پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دی تو آتی ہی تھی۔ دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا۔

"چھوٹی بی بی سے کہیو بیوی کی طبیعت اچھی نہیں۔" ساری باتیں پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا چیخ اٹھی۔ "اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے؟ بالی چھوکری سے۔"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی بینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی۔ "میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجئے۔" اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی پھر لوٹ کر آئے، آواز دی اور کہا۔

"میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی؟" ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے۔ "اور فیس کا کیا ہے! جان سے بڑھ کر تو پیسہ نہیں ہوتا۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں؟ پھر میں کیا کروں گا؟"

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بیوی ان کا کہنا ذرا کم مانتیں اور بات پیچھے منہ کو منہ دیئے چلی جاتیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہی منہ پیار سے اٹھاتا ہے اور یہی منہ لیار میں بیٹھاتا ہے۔ مگر اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لیکر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ "جاؤ بی بی ہیں نے تین بار تمہیں طلاق دی"۔ میاں بی بی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا، ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ "کھیل ختم، پیسہ ہضم"۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ بغیر دھویں کے لکڑی جلے۔

ضیا کو بھی خیال آگیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہوگا؟ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی۔

"چلئے دونوں مل کر اسے بلا لائیے" اور اسی جھپک کے ہیں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی گئی، چلہ بھی نہا لیا، بات پرانی پڑ گئی، مگر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے۔ لیکن بینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ ممانی بی نے البتہ دو چار دن بٹیا سے بول چال ضرور بند رکھی۔ مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟ اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا اور بینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ اٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ چاندا ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ ممانی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹتیں بھی۔ "پڑھ لکھ کر بالکل ہی چلن بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا!" بینا ہنس پڑتی۔

رفیعہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا۔ ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا قیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفیعہ بیگم امید سے رہیں، اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

چہلم پر ممانی نے بھی بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت ہڑک رہا تھا۔ مگر کرتی بھی کیا بیچاری؟ جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہے۔ دنیا دکھاوے کو منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں، ہمارے ہاں اٹھ آؤنا۔ مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ سر ہلا کر انکار کر دیا۔

بینا کو ان پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے۔ اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے۔ دونوں بچے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔ بینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا دیتی۔ ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے ہیر پھیر سے ذکر چھیڑا۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یونہی رہو گے؟ ماشاءاللہ خود بھی جان جوان ہو، ننھے ننھے بچے ہیں، کوئی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا۔"

شبیر میاں بولے۔ "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے ہی دیجئے میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں کا سا برتاؤ نہیں کر سکے گی اور ہیں یہ سب کچھ

برداشت نہیں کرسکوں گا۔" ان کی آواز بھیگ سی گئی۔ پھر ٹھہر کر بولے۔

"کیا گھر کا گھر وا ہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اڑتی ہے ہر طرف باہر سے آؤں تو کوئی منہ دھلانے والا بھی نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو خود اٹھ کر لوں تو لوں، ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں کہ پیاس ہی بجھادے بچے الگ تباہ حال۔!"

منیا کا دل اندر سے پگھل اٹھا، بولی۔

"آپ ہمارے ہاں آجایئے نا، یہاں اماں بھی ہیں، بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آتو جاؤں مگر۔۔۔۔" شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔ ممانی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ منیا پھر بولی۔ "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام رکھیئے۔ کتوں کا کام بھونکنا ہے۔ بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی۔ پھر ممانی بی نے بھی زور دیا۔ تو شبیر میاں اسی دن اٹھ آئے۔ منیا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ جاتا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے۔ کبھی کبھار ایسے ہی منیا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے۔

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور۔ مگر یوں، جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔

نہ چیٹ نہ پٹ، کبھی اونچی آواز سے بولتے۔ نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انھیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں۔ "بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی، بس میں نے یہی نام ڈال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور اسے دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے۔

"واقعی اچھا نام دیا آپ نے مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجہ میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے، کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا نے تازہ تازہ دودھ ابالنے کے لئے چولھے پر چڑھایا تو وہ آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں، مگر مولا کی دہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی بی چٹ پٹ ہو گئیں۔ اور مینا سے اُلو بن گئی۔ اندھیاروں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ بیسیوں ہی تو پیام اچھے بھلے آئے ہونگے گھر والوں کو پسند نہ آئے۔ اور جو ماں کو پسند آیا، بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی میں ہی لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی سیدھی،

جھوٹی سچی ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول ہو جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا؟ ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، مگر روپے پیسے ہی سے سب کام تو نہیں چلتے۔
بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔
شبیر میاں اب بھی مینا کے ہاں رہتے۔ باہر سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہی گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے نہ ان کے دل میں ان کے لئے، کوئی جگہ بنی، نہ انھوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔
ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور منمنا کر بولا۔
"ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔"
"ارے رے۔" مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ "تو بھئی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل؟"
مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دیکر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتنا بڑا کاجل جم گیا۔ مینا نے ڈبیہ میں کاجل پکڑا اور منے کو گود میں بٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی۔

"آں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں لوہا نہیں پھیرنا چاہیئے۔" مینا ہنس پڑی۔ "اچھا تو انگلی سے لگا دیں"

"ہاں" ارشد نے سر ہلا دیا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ تھوڑا سا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔ اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگایا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر میٹھے لہجہ میں آواز آئی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

دستر خوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

"ابا میاں آپا نے ہماری آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے"

"ہاں۔ ہاں۔ بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا" اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آ گئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی۔

"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھا لیا"

شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے مگر اکدم رک کر سادگی سے بولے۔

"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں" اور اخبار لے کر یوں پڑھنے میں منہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت

آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو۔ موسم کی تعریف کی ہو۔" واہ بھئی کیا اچھا موسم ہے۔!"
مینا بوکھلا کر الٹے پاؤں بھاگی۔ اس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔
شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم، گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔ سادگی سے بولے۔

"ذرا سنبھل کے نہیں چلتیں، ابھی ہڈی چورا ہوگئی ہوتی!" اور اٹھاتے ملی مینا کا سر ان کی ناک سے اتنا قریب ہو گیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور لیکن اگر کوئی پوچھتا۔"خالو میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟" تو وہ سٹ پٹا کے رہ جاتے۔

مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سنائی نہ دی تھی انھوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں۔ مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ نرم نرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آئے۔

"اونہہ زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن بھن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تو مینا نے انھیں مشورہ دیا تھا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے۔"

"اب انھیں خیال آیا یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا!" پھر انھیں مینا اور ممانی بی کے احسان یاد آ گئے۔ انھوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق بر ڈھونڈھ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری

اتنی خوبصورت، اتنی سگھڑ، اتنی تعلیم یافتہ ہے۔ اس کے جوڑ کو جوڑ تو لیے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی بچوں سے اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسورتے نہ تھے اور صورت پر بہار آگئی تھی۔

"لاحول ولا۔" شبیر میاں نے سوچا۔ "میں بھی کتنا کور اخلاق ہوں کہ وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔" اخبار مونڈھے پر رکھ کر اٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سوئٹر چڑھا لیا تھا۔ اب جو گرمی ہوئی تو اسے اتار پھینکنا چاہا۔ سوئٹر کھلے گلے کا نہ تھا گردن میں سے اتارنا پڑھتا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے، زور لگا کر سوئٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر اندھا دھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں، مگر یہاں ایک جگہ گالی وصبح دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پردوں میں ان کو اپنا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئٹر کھینچ کر پھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

تین دن سے تو بخار ہی تھا —— اور —— تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے

باہر آئی تو سہی۔ مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولہا سے شرمائے اور موقع ملنے پر رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے بھی انھیں یہ خوشبو اپنے تکئے پر، بستر پر مل چکی تھی۔ جو اپنے منہ سے کہتی تھی۔

"میں مینا کے پاس سے آئی ہوں"۔

اب مینا اتنی گئی گذری نہ تھی کہ کسی کے بستر پر لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اسے بھی گھسیٹ لیتے۔ "آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے"۔

تب تک وہ سوئیں سوئیں، یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ اُنہی کا پلنگ اسوقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی، برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی دلنسیی، وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم، ملائم، گھلی گھلی سی آواز

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔!"

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے۔ "مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا، کیڑا نہ لگ جائے"۔

اس دن تو مینا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر ہی پر

تھے تو سارا سامان لیکر بیٹھ گئی۔ کپڑے کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آدھمکے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے لے کر افشاں تک، بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال انھوں نے اپنی ماں سے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول اٹھی۔

"امی کی یاد آتی ہے منے؟" ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے۔

"اوں ہوں۔ آپ جو اتنی اچھی ہیں!"

"مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اوں" ارشد بولا۔ "ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں!" مینا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی۔ "سچ؟"

"ہاں اور کیا!" ارشد بولا۔

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی بوت کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا۔ اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔ مٹھی کھولی اور پھر دوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سنئے" وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے اور ایک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑی

میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"سنگھاردان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ مگر مسّی نہیں ہے۔!"

اور وہ منہ پلو میں چھپا کر شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔

شام کو جب وہ ہاتھ میں مسّی کی دوہری پوڑی سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ہوئی اور نرم، ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دے، "وہ" آ گئے ہیں!"

آدم اور حوّا

چھک ۔ چھک ۔ چھک ۔ ریل چلی جا رہی تھی ۔

"ہاں جی ۔ اگر میں اس چلتی گاڑی سے گر پڑی تو ۔ ؟ "

عورت نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

مرد نے اخبار سے نگاہیں ہٹائے بغیر ، ناگواری سے کہا ۔

" اونہہ ۔ وقت پڑنے پر دیکھا جائے گا ۔"

تھوڑی دیر بعد مرد نے اخبار کو تہہ کر کے رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

" ہاں جی ــــ اگر میں اس چلتی گاڑی سے گر پڑا تو ۔ ؟"

عورت نے ایک لمحہ کو مرد کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ چلتی گاڑی سے کود پڑی ۔

ــــــــ ٭ ــــــــ

پاندان

"بنّے میاں کل پھر آئے تھے۔" بڑی بیگم نے چھالیہ کترتے کترتے آہستہ سے کہا۔

اشرف میاں اخبار میں ایسے منہمک تھے کہ انھوں نے بڑی بیگم کی بات پر کان ہی نہ دئے۔ بڑی دیر بعد پڑھتے پڑھتے اکدم اچھل کر بولے "ابھی تم نے بنّے کا نام لیا تھا؟"

بڑی بیگم نے سر اس انداز سے جھکا لیا، جیسے کہتی ہوں۔ "جی ہاں"

"اور صاحبزادی کہاں تھیں؟" انھوں نے تیز ہو کر پوچھا۔

اب بڑی بیگم کی ہل گئی۔ "دولی صاحبزادی کہاں تھیں؟ خود انھوں نے ہی بنّے میاں کو لا کر اپنے کمرے میں بٹھایا کریمن سے کہہ کر چائے بنوائی اور خود ہی ان کے سامنے کھڑے ہو کر پیالیوں میں انڈیلی۔ میں ادھر سے گذری تو کیا دیکھتی ہوں۔ کہ چائے کی چسکیاں بھری جا رہی ہیں اور مزے مزے میں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی ہیں۔"

اشرف میاں نے بھنا کر اخبار اتنی دور پھینکا کہ وہ بجائے میز پر ٹکنے کے زمین پر جا پڑا۔

"اور تم نے کچھ بھی نہ کہا۔"

"اے لو۔ بھلا میں کیا کہتی۔ کچھ صاحبزادی میرے ہاتھ کی ہیں۔ اب تو زمانہ ہی الٹا ہو گیا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ چھوٹے بڑوں سے ڈریں الٹے بڑے چھوٹوں سے کانپتے ہیں۔ کیا میری مت ماری گئی تھی کہ دو بول بول کر ان سے سترہ باتیں سنتی؟"

"سترہ باتیں کیوں سنتیں؟ کیا تم ان کی ...." وہ کچھ دیر رکے، پھر اسی تیزی سے بولنے لگے۔ "کیا تم ان کی بزرگ نہیں ہو؟"

"اے ڈالو چولھے میں ایسی بزرگی کو۔ جب وہ باپ کا ڈر نہیں مانتیں تو ہم تو تیسرے کونے پڑے ہیں"

"تیسرے کونے کیوں؟ کیا تم اس کی خالہ نہیں ہو؟"

"اونہہ" انھوں نے زور سے سروتہ پٹخ دیا۔ "ایسا ہی بڑا خالہ کا مان ہوتا تو یوں کھلے خزانے ......" وہ بڑے ڈرامائی انداز سے جملہ ادھورا چھوڑ خاموش رہ گئیں۔

"کیا؟ کیا بات ہے؟" اشرف میاں بڑی بے تابی سے بولے۔

"کوئی بات کیا ہوتی۔ ہمارا تمھارا ڈر ہوتا تو یوں آپو آپ اپنے دیدوں اپنا بر نہ ڈھونڈتیں"

سارا معاملہ اشرف میاں کی سمجھ میں آگیا۔ پٹھانی خون جوش کھا گیا۔ سرخ پڑ کر بولے۔

"یہ بالشت بھر کی چھوکری سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟ اس کا دانہ پانی نہ بند کر دیا تو کہنا۔ سنو جی! اب سے بڑے دروازے کو قفل ڈال کے رکھنا۔ ایک چابی تمہارے پاس۔ ایک چابی میرے پاس۔

جس کو بھی باہر جانے کا کام پڑے ہم دونوں میں سے کسی سے پوچھ کر جائے۔ سمجھ گئیں نا۔"

بڑی بیگم بول گئیں۔ "وہ ئی کیسی بات کرتے ہیں آپ؟ جوان بچی پہ یوں پابندی۔ کبھی جان پر کھیل گئی تو؟"

"اجی بہت دیکھے ایسے جان پر کھیلنے والے۔" اشرف میاں تاؤ میں آکر بولے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ ذرا رک گئے۔

"کیا کہا تم نے ابھی؟" وہ انگلی اٹھا کر بولے۔

"کہتی کیا؟ یہی کہ جان وان پر نہ کھیل جائے۔"

اشرف میاں کو خیال آیا کہ رضیہ ان کی کتنی لاڈلی ہے۔ کیسے اس کی زندگی سے ان کی اپنی زندگی ہے۔ اور رضیہ کی ماں کی موت کے بعد سے تو وہ رضیہ پہ یوں بھی زیادہ ہی جان چھڑکنے لگے تھے۔ ویسے پہلے ہی رضو سے وہ کیا کم محبت کرتے تھے۔ مگر اس کی ماں کی موت نے تو انہیں رضیہ کا ہی بنا کے رکھ دیا۔ اور یوں تو چار بیٹوں پر بیٹی ہو تو اس کے لاڈ پیار کا کیا کہنا؟۔ رضیہ جب ایک ماہ کی تھی تو یہ اس کی ننھی ننھی گلابی انگلیاں اپنے ہونٹوں میں دبا لیتے اور کھل کھلا کر ہنسے جاتے۔ اور جب چھ ماہ کی ہوئی تو اسے تکیوں کا سہارا دے کر مونڈھے میں بٹھا دیتے اور خود اس کے سامنے شیر بن کر ہاتھوں پیروں کے سہارے چلا کرتے۔ اس کے معصوم قہقہوں سے سارا گھر کھل کھلانے لگتا۔ پھر ایک سال کی ہوئی تو یہ اپنے ہاتھوں اسے سہارا دے کر چلایا کرتے۔

"پاؤں پاؤں، سونے کے پاؤں
رانی جاتی راجہ کے گاؤں"

وہ تھرک تھرک کر چلتی اور ان کے دل میں پھول چٹکتے جاتے۔ پھر یونہی ماہ و سال گزرتے رہے۔ اور پھول چٹک چٹک کر گلزار ہوتے رہے۔ جب رضیہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو ایک دن چپکے سے اس کی ماں نے آنکھیں موند لیں۔ معمولی سا میعادی بخار تھا۔ مگر جس کی پوری ہو گئی ہو اُسے تو معمولی سا بہانہ ہی کارگر ہو جاتا ہے۔

اشرف میاں کی دنیا لٹ گئی۔

کہاں تو وہ زندگی کہ بھرے گھر میں خوشیاں ہمکتی تھیں۔ دن رات قہقہے اُچھلتے تھے۔ یا اب یہ عالم کہ رضیہ گھٹنوں میں سر دبائے جو بیٹھی ہے تو اُدھر کا سورج اُدھر ڈھل جائے اور اس کا سر نہ اٹھے۔ باپ اپنے دفتر کچہری کے کاموں کو بھول بھال جو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بیٹھے تو نہ کھانے کا خیال نہ پینے کی فکر!

ذکیہ بیگم کی اچانک موت نے رضیہ کی محبت ان کے دل میں دگنی تگنی کر دی۔ ہر بات میں رضیہ کا خیال، ہر وقت رضیہ کی فکر۔ خود اپنا یہ حال کہ سوکھ کے کانٹا ہوئے جا رہے ہیں مگر رضو بی ہیں تو زندگی ہے ورنہ کچھ نہیں۔

رضیہ بی کا بی۔ اے کا پہلا سال تھا۔ ابھی پڑھائی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ماں کا غم سر پر آ پڑا۔ تعلیم و علیم کو بھول بھال بس اپنے کمرے میں پڑی جھکو پھکو رو جاتیں اُدھر باپ بے حال اُدھر بیٹی تباہ۔ جانے بڑی بیگم نہ ہوتیں تو اس گھر دار کا کیا حشر ہوتا؟

پُرسے کے لئے گاؤں سے ذکیہ بیگم کی رشتوں کی بہن رفیعہ بیگم آئی تھیں۔ شادی اور سہاگ کے کوئی سترہ سال بڑی اُمنگوں اور خوشیوں میں گزارے تھے۔ سات آٹھ سال بعد خدا نے ایک بیٹا بھی دیا تھا۔

اور بیٹیا دیکر میاں چھین لیا تھا۔ کوکھ ٹھنڈی کی تو سہاگ کی سرخی چھین لی۔ اوپر ڈالا جو چاہے سو کرے آج کل کی بات بھی نہ تھی۔ برس گذر گئے تھے۔ مگر غموں کی ماندی ہوئی تھیں۔ موت کی چوٹ ان کا دل بھی کھا چکا تھا۔ رضیہ کا غم بھی دیکھا نہ جاتا۔ نہ وہ ہوتیں، نہ رضیہ اور اشرف میاں کی زندگی ہوتی۔ ان دونوں باپ بیٹی کا کیا تھا۔ کچھ خبر بھی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا نہیں۔ اگر یہ کھانا پکوائیں تو پکے، نہ کہیں تو دن بھر چولھے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ کھانا میز پر لگ کر ٹھنڈا ہو چکا ہے مگر نہ یہ اپنی جگہ سے ہلتی ہیں نہ وہ۔ چلو میز پر آکر بیٹھ بھی گئے مگر یہ نوالہ توڑتی ہیں نہ وہ۔

ایسے بھی کہیں زندگی گزاری جاتی ہے؟ وہ ہوتیں نہ دوبارہ سے اس گھر میں زندگی لوٹ کر آتی۔ ایسے غیر محسوس طریقے پر وہ اس گھر کے ماحول میں رچ بس گئیں کہ ان کے بغیر اب پتہ بھی نہ ہلتا۔ گھر کا انتظام آپ ہی آپ ان کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اور ادھر رضیہ کا دل بھی چنو کے ساتھ بہلتا گیا۔

دن اور رات کی سنگت نے اب یہ احساس مٹا دیا تھا کہ رضیہ کی کوئی ماں نہیں۔ بڑی بیگم ماں تھیں، اور ایسی ماں تھیں کہ اب ایک کی بجائے انھیں چھ چھ بچے تھے۔ لڑکوں کے دل میں بھیجر تو نہیں ہوتا مگر لڑکیوں کے مقابلے میں ان کے دل ذرا سخت ہی ہوتے ہیں۔ بھائی پھر بھی بڑے بڑے تھے اور دنیا کی اچھی خاصی سمجھ رکھتے تھے۔ ماں کا غم تو بس کچھ رضیہ کے جی کو ہی لگا۔ بڑے دو بیٹے تو ماں کی زندگی میں ہی پاکستان سدھار چکے تھے۔ دو چھوٹے علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے۔ جس وقت ماں مریں بڑے بیٹے کوئٹہ میں تھے اور چھوٹے مری میں۔ تار بھجوائے ضرور گئے مگر ماں کو مٹی دینا نصیب نہ ہوا۔

رضیہ نے دل توڑ غم سے آنکھیں کھولیں تو سامنے بس بڑی بیگم کو پایا۔ اور اب دن گزرنے پر تو وہ یوں سمجھنے لگی کہ گویا وہی اس کی ماں ہو۔ کبھی بھول کر بھی خیال نہ آتا کہ ایک ماں تو خیر چھوڑ کر چلتی بنیں۔ یہ بھی کبھی دور ہو سکتی ہیں۔ مگر ایک دن جب بڑی بیگم نے اپنا بستر باندھتے ہوئے جانے کا اعلان کر دیا تو رضیہ کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گری۔

"آپ جا رہی ہیں خالہ بی۔" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"اور کیا بٹیا کوئی کسی کا عمر بھر کا ساتھ تھوڑے ہی دے سکتا ہے۔ انھوں نے ہولڈال کے بند کستے ہوئے بڑی رقت بھری آواز سے کہا۔

"اور پھر یہاں ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟" رضیہ نے بڑے دکھ سے سوال کیا۔

بڑی بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔

رضیہ نے اپنے آپ میں کہنا شروع کیا۔ "اچھا ہے، بھائی صاحب اور بھائی جان تو پاکستان میں خوش ہیں۔ الطاف بھائی اور چھوٹے بھیا ہوسٹل میں مگن۔ ایک ہم بدنصیب ہیں۔ اونہہ۔! مرے تو کیا، جئے تو کیا۔"

بڑی بیگم نے ذرا کرب سے اس کی طرف دیکھا۔

"دوئی بی بی یہ منحوس باتیں کیسی کر رہی ہو؟!"

جینو پاس بیٹھا اپنے چھوٹے ٹرنک میں کپڑے ٹھونس رہا تھا۔ وہیں سے چلا کر بولا۔

"تو پھر آپ رک کیوں نہیں جاتیں۔"

رضیہ جینو سے مخاطب ہوگئی۔ "خالہ بی کو ہم سے محبت ہوتی تب رکتیں وہ تو......"

بڑی بیگم نے لپک کر اس کا منہ بند کر دیا۔ "تمھاری باتیں بھی نرالی ہوتی ہیں بی ــــ میرا کون ہوتا سوتا بیٹھا ہے جس میں اپنا جی اٹکاؤں گی۔"

ماں کی موت کے بعد سے رضیہ کے منہ پر ہنسی نہ آتی تھی۔ بس آنسو ہی آنسو تھے کہ امڈے آتے
بڑی بیگم نے بڑے دکھ سے رضیہ کو دیکھا۔
"میں چلی تو جاؤں، مگر پھر کوئی تو نہ ہوگا کہ آنسو ہی پونچھ دے۔"
انھوں نے ہولڈال کے بند کھول دیئے۔
دن چیونٹی کی چال گزرنے لگے۔
بڑی بیگم رکنے کو تو رک گئیں، مگر اپنے آپ میں کھسیائے جاتیں۔ اگر رضیہ کے آنسوؤں کا واسطہ نہ ہوتا تو کبھی کا گھر چھوڑ چھاڑ کر چلی جاتیں۔ اشرف میاں ویسی سیلڈی ناک کے تھے کہ کوئی چیز میاں کے من نہ بھاتی۔ پٹھان تھے اور گورے چٹے بھی۔ بات بات پر سرخ پڑ جاتے۔ خون جوش کھانے لگتا۔ بڑی بیگم کی مروت، ممتا کو تو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے یوں ان سے برتاؤ کرتے جیسے یہ تو ان کا حق ہی تھا۔ انسان کچھ تو غیر اور اپنے والے میں تمیز رکھتا ہے مگر وہ تو ان پر اپنا حق سمجھے بیٹھے تھے۔ مگر دن گذرے تو وہ بھی ان کے مزاج کی عادی ہوتی گئیں اور اب تو یوں ہونے لگا کہ وقت پڑنے پر خود اشرف میاں سے ضد کر کے اپنی بات منوا لیتیں۔

اشرف میاں شہر میں وکیل تھے۔ نام بھی بڑا تھا اور ساکھ بھی۔ خود بھی تعلیم یافتہ تھے۔ بیٹوں کو بھی تعلیم دلوائی اور بیٹی کو بھی۔ پردہ جھردہ برائے نام تھا۔ روشن خیال لوگ تھے۔ پرانی باتوں کا چلن ان کے ہاں نہ تھا۔ نہ رضیہ کسی بات پر پابندی تھی، نہ کہیں آنے جانے پر روک ٹوک۔ کالج بھی جاتی تو کلاموٹر تھیا۔ یوں خوبصورتی اور دکھاوے کو ریشمی پردے بھی پھڑپھڑاتے تھے۔

مگر ان سے پردوں کا م نہ لیا جاتا۔

ذکیہ بیگم شہر میں بیاہی گئی تھیں۔ جیسا ماحول انسان کو ملتا ہے۔ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ ذکیہ بیگم کا بھی وہی چلن ہو گیا جو ان کی سسرال کا تھا۔ بڑی بیگم رہیں گاؤں والی، یہاں آئیں تو عجب ترقی پسندی دیکھی۔ بولیں تو کیا؟ کچھ اپنے گھر کی سی بات تو نہ تھی۔ پرسے کو آئی تھیں، خواہ مخواہ گھر کے معاملات میں دخل اندازی کر کے نکو کیوں بنتیں۔

ایک دن بڑی بیگم پورچ میں کھڑی تھیں کوئی چار ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ ایکدم موٹر آکے رکی۔ رضیہ اتری چہرے پر ہنسی بکھری ہوئی۔ منہ تمتما رہا تھا۔ بڑی بیگم نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ماں کی موت کو اتنے دن گزر گئے تھے کبھی بھولے بسرے بھی مسکراہٹ منہ پر نہ جھلکی تھی۔ آج تو انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

پیچھے پیچھے چلتی چلتی اس کے کمرے تک آئیں۔ رضیہ نے کتابیں میز پر پٹخ دیں اور ہنس کر بولی۔

"خالہ بی آج کالج میں مشاعرہ تھا، بس مزہ آگیا۔"

بڑی بیگم کو اس میں تو ہنسی کا کوئی پہلو ہی نظر نہ آتا تھا، حیرت سے بولیں۔ "پھر؟"

"ارے خالہ بی بڑے اچھے اچھے شاعر آئے تھے۔ اس قدر ہنگامہ رہا آج۔ آپ بھی چلتیں بڑا لطف رہتا۔"

"نہ بابا۔" خالہ بی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "غیر مردوں کے سامنے جانے بھلا کچھ اچھا لگتا ہے۔"

رضیہ زور سے ہنسی۔ "واہ بی خالہ یہ اچھی سنائی۔ پھر یہ تو دیکھئے کہ اتنے سارے لوگوں میں کون کسی کو دیکھتا بیٹھا ہے"۔

"اے واہ! دیکھتا کیسے نہیں؟ نگاہ پڑ ہی جاتی ہے"۔

رضیہ کا چہرہ گلابی گلابی ہو رہا تھا۔ "آپ بھی کیسی پرانے وقتوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔ اچھا دیکھئے کسی دن اپنے ہاں مشاعرہ منعقد کریں گے"۔

"نہ بی بی۔" بڑی بیگم بول گئیں۔ "ایسے غیر مردوں کا جمگھٹ اپنے ہاں نہ لگا بیٹھنا۔ خدا رسول کا بھی کچھ خوف ہے کہ نہیں۔؟"

غیر مردوں کا جمگھٹ تو خیر وکیل صاحب کے ہاں نہ لگا، مگر ایک دن رضیہ کالج سے لوٹی تو اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ گورا رنگ بڑے بڑے سنہرے بال۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ہنسی کی غیر مانوس آواز سن کر بڑی بیگم نے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ رضیہ موٹر کے دروازے میں اندر کی طرف سر ڈالے کھڑی تھی۔ اور ہنسے جا رہی تھی۔

"اس دن آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی"۔

"آپ کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ ایسی کوئی قابل تعریف نظم تو نہیں تھی"۔

ایک دلکش قہقہہ بلند ہوا۔ "اب یہ آپ کی کسر نفسی ہے۔ ورنہ آپ خود جانتے ہیں کہ بار بار آپ کو پڑھوایا گیا۔ اور آپ نے جو رباعیاں پڑھیں تھیں۔ وہ ....." اکدم وہ رک کر بولی۔ "ارے میں نے آپ سے یہ بھی نہیں کہا کہ اندر چل کر بیٹھئے۔ آپ بھی سوچیں گے میں کتنی بدتمیز ہوں"۔

"اوہ۔" وہ مسکرایا۔ "ایسی کوئی بات نہیں"۔ اور موٹر سے نیچے اتر آیا۔

سفید قمیص، سفید پتلون، اونچا سا قد، ہنستا ہوا چہرہ — بڑی بیگم کو اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ مگر یہ کیا کم بُرائی تھی کہ رضیہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔ ایسے غیر مرد سے جو نہ ماں کا سگا، نہ باپ کا سگا۔ توبہ۔

رضیہ کے چہرے کی ویرانی اور وحشت اب دور ہوگئی تھی۔ اور اس کی جگہ مستقل سرخی چھائی رہنے لگی۔ یا تو سدا خاموش رہتی تھی یا اب اپنے آپ میں مسکرائے جاتی، گنگنائے جاتی۔

ایک دن رضیہ صبح سے جو کالج گئی تو شام تک نہیں لوٹی۔ رات کے کوئی دس بجے دس کے انداز میں موٹر کے گھڑگھڑانے کی آواز آئی اور موٹر پھاٹک میں داخل ہوئی۔ بڑی بیگم نے اپنے کمرے سے جھانک کر دیکھا، رضیہ اتر رہی تھی۔

سفید ساڑی، سفید بلاؤز، گھونگھریالے بالوں کے چھلے اس کی پیشانی کے دونوں طرف جھک آئے تھے۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر کلائی پر بندھی ہوئی نازک سی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ پورچ کی دودھیا روشنی میں رضیہ خطرناک حد تک حسین اور معصوم نظر آرہی تھی۔

"ایسی پیاری صورت پر تو کوئی بھی آسانی سے عاشق ہوسکتا ہے۔" بڑی بیگم نے گھبرا کر سوچا اور ان کی نگاہوں کے سامنے ایک ہیولا سا ابھر آیا۔ اونچا قد، بڑے بڑے سنہرے بال، سفید قمیص، سفید پتلون، مسکراتا چہرہ۔

بڑی بیگم اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ رضیہ بڑی متوالی چال چلتی اپنے کمرے کو جارہی تھی۔

"سنو بٹیا۔" انھوں نے ذرا بھاری آواز سے کہا۔

"جی۔" رضیہ ٹھٹھک گئی۔

"تم اب تک کہاں تھیں؟"

"بنے کے ساتھ۔" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"بنے۔؟ بنے کون؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

رضیہ ہنس دی۔ "وہ اس دن جو آئے تھے نا!" پھر خالہ بی کے حافظہ میں یاد کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ۔ وہی اونچے اونچے سے ہیں۔ میں نے جسے چائے پلائی تھی۔ ارے جو شاعر ہیں۔"

خالہ بی کو یاد آگیا۔ ذرا تلخی سے بولیں۔ "کیا کر رہی تھیں اس کے ساتھ۔"

"شام غزل، کے نام سے ایک ادبی پروگرام ہونے والا ہے۔ سارا دن اسی گورکھ دھندے میں ختم ہو گیا۔ اف کس بری طرح تھک گئی ہوں۔" وہ پاؤں جھٹکتے ہوئے بولی۔ مگر اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔

بڑی بیگم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستہ سے بولیں۔

"تم خود سمجھدار ہو بی بی۔"

اشرف میاں کو بیٹی سے اتنا ہی سروکار تھا۔ کہ اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا۔ ہر ہر بات کا خیال رکھیں۔ یہ نہ سوچیں کہ جوان لڑکی اکیلی کدھر آتی جاتی ہے۔ نہ یہ دیکھیں کہ بن بہار کے یہ گالوں پر گلاب کیوں کھل رہے ہیں۔ جہاں کسی چیز کی ضرورت پڑی یہ باپ کی بیٹھک سے جا کھڑی ہوئیں اور باپ نے جھٹ چیک کاٹ دیا۔ پھر یہ نہ پوچھیں کہ بٹیا یہ ضرورت کیوں پڑتی ہے؟" بس بٹیا کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

"بیٹے تو خود ہی پڑھ لکھ کر کمائی کرتے ہیں۔ انھیں کیا روپے پیسے کی ضرورت؟

ہاں بیٹیوں کا دل نہ توڑنا چاہئے "۔
کبھی تو منہ اٹھا کر نہ پوچھا کہ "بٹیا تم کن گلیوں کے چکر کاٹتی ہو۔؟"

رضیہ بی کے واحد غم خوار اور راز دار چنو میاں تھے۔ کالج سے لوٹ کر گھر پہ جو ٹائم گزرتا، انہی کی صحبت میں، بڑی بیگم ایک دن باہر تخت پر بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں اندر رضیہ اور چنو میں باتیں ہو رہی تھیں۔

"اچھا بتایئے جی چنو راجہ آپ نے اب تک اسکول میں کیا کیا پڑھا ہے ؟"
"اب آپ کو سارے کا سارا کیسے بتائیں۔ آپ کچھ پوچھئے تو جواب دیں۔!"
"اچھا کیوپڈ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے ؟"
"کیوپڈ۔ ؟" چنو کی حیرت بھری آواز خالہ بی کے کانوں سے ٹکرائی۔
"ہاں کیوپڈ۔ جو اندھا ہوتا ہے اور بس پیٹھ پر ترکش دھرے تیر پہ تیر چلاتا پھرتا ہے "۔

"جانے کیا بک رہی ہیں آپ" وہ جھنجھلا کر بولا۔ "تو وہ بن بات تیر کیوں چلاتا رہتا ہے۔ ؟"

"بس یونہی" رضیہ ہنسنے لگی۔

"کچھ بتاتی تو ہیں نہیں، بس ہنسے جا رہی ہیں۔ میں کیا سمجھوں ؟" بہت دیر تک رضیہ کی کھنکھناتی آواز آتی رہی۔ پھر بڑی ہی شگفتگی سے بولی۔
"سن چنو، لوگ کہتے ہیں وہ جو کیوپڈ ہوتا ہے نا! تو بس کسی کے دل پہ تیر چلا دیتا ہے۔ چاہے بوڑھا ہو، جوان ہو، لڑکا ہو کہ لڑکی "۔
بڑی بیگم نے بڑی ناگواری سے اس کے کمرے کی طرف دیکھا۔ چنو بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"کہیں آپ کے دل پر تو تیر نہیں لگ گیا" اس کی آواز میں ہلکا سا خوف چھپایا ہوا تھا۔

رضیہ سنجیدہ ہوگئی۔ "دہی میں بھی سوچ رہی ہوں چنو۔ جانے سردی کا اثر ہے یا کیا ہے، ان دنوں سینے میں درد ہوتا رہتا ہے"

"وکس لاؤں۔؟" چنو باہر دوڑنے لگا۔

رضیہ 'ارے رے رے' کرتی رہ گئی۔ مگر چنو باہر دوڑ گیا۔ بڑی بیگم کچھ سمجھیں کچھ نہ سمجھیں۔ مگر ٹوہ لینے کو دوسرے دن بڑی بیگم ناشتہ کی میز پر بولیں۔

"ہاں بٹیا تم ڈاکٹر کے ہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔؟"

"کس لئے!" رضیہ حیرت سے بولی۔

"تمہارے سینے میں تکلیف جو ہے۔ رات تم چنو سے ذکر بھی تو کر رہی تھیں نا؟"

رضیہ کو ہنسی آگئی۔ "نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

اشرف میاں نے اپنے چشمے کے اوپر سے جھلکتے ہوئے کہا۔ "نہیں بٹیا اگر کوئی تکلیف ہے تو جلدی سے دوا منگوالو۔ بیماری میں ڈھیل دینی ٹھیک نہیں۔"

بڑی بیگم کی عجیب مصیبت تھی۔ رضیہ بی کے رنگ بتاتے تھے کہ وہ کچھ کر گزریں گی، اور باپ تھے کہ ہر طرف سے بے فکر۔ اگر کچھ منہ ہلاتی ہیں تو رضیہ بی منہ پھلالیں گی۔ "بھئی یہ کون ہوتی ہیں مجھے ٹوکنے والی"

بات ٹھیک بھی تھی۔ سگے باپ نے جب ڈھیل دے رکھی تھی۔ تو یہ تیسرے کونے کدھر کہنے سننے کی حق دار تھیں۔ لاکھ خالہ خالہ باجتی تھیں۔ مگر تھیں تو پرائی سی۔ باپ جو سر پر موجود تھے! مگر آنکھوں دیکھے ان سے صبر بھی نہ ہوتا تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو کر رہے گا۔" انھوں نے گھبرا کر سوچا۔ "خدا خیر کرے۔ جوان

بیٹی کا معاملہ ہے اور یہ کمبخت گھرانہ ایسا ہے کہ نہ پردے کی قید نہ کہیں جانے آنے پر پابندی۔ ورنہ کہیں یہ بھی کسی سے سنا ہے کہ جوان بیٹیاں خود موٹریں اڑاتی پھر رہی ہوں۔ مشاعروں میں کھلے بندوں شرکت کر رہی ہوں، اور موٹر کے دروازوں میں سر ڈال ڈال کر کہتی ہوں۔ "آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی"۔

بڑی بیگم کو بس آ جا کے یہی حل سوجھا کہ بی رضو کے ہاتھ پیلے کر دیں۔

انہی دنوں ایک جج صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے رضیہ کو مانگا بھی تھا۔ بڑی بیگم کو دھن لگ گئی کہ جس قدر جلد یہ کار سلجھ جائے بہتر ہے۔ رضیہ کی موجودگی میں، ایک دن کھانے کی میز پر قصداً انھوں نے یہ ذکر چھیڑا۔

"جج صاحب کے بیٹے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

اشرف میاں نے ہاتھ روک کر حیرت سے دیکھا اور بولے۔

"ابھی سے ؟ بھلا اتنی جلد ؟"

"اے لو اسے جلدی کہتے ہیں۔ بس بیس کی ہونے کی تو سوچ رہی ہیں صاحبزادی اور باپ کہتے ہیں ابھی سے"۔

"مگر پھر بھی اسے تعلیم تو پوری کر لینے دو۔ بی۔ اے کا آخری سال ہے۔ کم از کم گریجویٹ تو ہو لے"۔

"اونہہ ! تعلیم کا کیا ہے ؟ شوق ہے تو شادی کے بعد بھی پڑھ ہی لے گی"۔

رضیہ نے بھنا کر بڑی بیگم کو دیکھا۔

"ابھی بچہ ہے۔" باپ بول رہے تھے۔

"بچہ ہے ؟" بڑی بیگم حیرت سے بولیں۔ "ابھی شادی کر دو تو اس بچے کو بچہ ہو جائے۔ ہونہہ۔" انھوں نے تیزی سے چمچہ ٹپخا۔ "ہر باپ کو اپنی بیٹی سدا بچہ ہی نظر

آتی ہے۔"

رضیہ نے نوالہ ہاتھ میں تھامے تھامے بڑی لاپروائی سے کہا۔

"ابھی تو میں بی۔اے کروں گی۔"

بڑی بیگم کے ہاتھ کا نوالہ کھد سے رکابی میں جا گرا اور سالن کی سُرخ سُرخ چھینٹیں ان کے کرتے پر بکھر گئیں۔ "دوئی یہ کیسی بیٹی ہے کہ اپنے منہ سے شادی کے معاملہ میں دخل دے رہی ہے۔؟"

اشرف میاں نے اتنی بڑی بات پر سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ بڑی متانت سے بولے۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔"

ادھر رضیہ بی کو باپ کی شہ کیا ملی کہ اب کھلے خزانے بی۔اے کی اسٹڈی ہونے لگی۔ گھر گھر کمرے کے موٹر رکتی اور ایک دروازے سے بنے میاں اور ایک دروازے سے رضوی ڈرائنگ روم میں شعر شاعری پر مباحثے ہوتے، ادبی بحثیں چھڑ نظمیں غزلیں پڑھی جاتیں اور چائے پی جاتی۔ بڑی بیگم نے اپنے منہ میں مونگ بھر لئے کوئی سنتا ہی نہیں تو بولیں بھی کس سے۔

ایک دن ملت کے آٹھ بجے جب میز لگ چکی تھی اور سب کھانا کھانے میں مشغول تھے کہ تار والے نے آواز دی۔ بڑی بیگم کا جی اڑنے لگا اور اشرف میاں منہ کھولے تار کے مضمون کا انتظار کرنے لگے۔

"بڑے بھائی صاحب اور بھائی جان پاکستان سے آج سے چوتھے روز یہاں پہنچ رہے ہیں۔" رضیہ نے پڑھ کر سنایا۔

جمال میاں اور طاہر میاں کے یوں یکایک آنے کی غرض و غایت کسی کی

سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مگر پھر بھی گھر بھر میں خوشی پھیل گئی۔ باپ نے علی گڑھ تار کروا دیا کہ تھوڑے دنوں کے لئے چھوٹے بیٹے بھی آجائیں۔ پھر بھلا پاکستان سے روز روز کون آتا ہے۔ یہاں تو پرمٹ اور ویزا کی جھنجھٹ ہی مہینوں تک ختم ہونے میں نہیں آتی۔

جمال میاں، حامد میاں آئے تو ان کی بیٹیوں بچوں سے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ بڑی بیگم گھنٹوں دونوں بھائیوں سے سر جوڑے باتیں کرتی رہتیں۔ اب کہیں جا کر ان کا دل ہلکا پڑا۔

یوں تو دونوں بھائی کوئی آٹھ ماہ کا پرمٹ بنوا کر ہندوستان آئے تھے۔ اور ابھی جانے کو تو دن پڑے تھے مگر چاہتے یہی تھے کہ جلد سے جلد بہن کی شادی طے ہو جائے۔ پھر کون جانے بعد میں طے ہونے پر شامل ہو سکیں نہ ہو سکیں!

جج صاحب کے بیٹے کے علاوہ اور بھی دو چار پیام نگاہ میں تھے اس لئے غور و خوض ہونے لگا۔ کہ بی رضو کو کس کے ساتھ بیاہا جائے۔ ادھر بی رضو بھی کہ شاعر میاں کے ساتھ جنم کرم نبھانے کے بارے میں قطعی طور سے طے کر چکی تھیں۔ جان پر کھیل جاتیں مگر کسی اور کا ہاتھ نہ تھامتیں۔ جمال میاں ان سے بڑے ضرور تھے،...... مگر روشن خیال گھرانوں میں جو بے تکلفی ہوتی ہے وہ یہاں بھی بہن بھائی میں موجود تھی۔ بھائی نے ایک دن بات شروع کی۔

"رضو تم جانتی ہو ابا میاں بوڑھے ہو رہے ہیں۔ پچھلی بار جب میں ہندوستان آیا تھا تب سے اب تک ان کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس پر امی جان کی موت نے الگ اثر کیا۔ موت زندگی کا کیا بھروسہ ہے؟ خدا نہ کرے اپنے گھر کی، ہم رہے پاکستان میں۔ بھئی تم اپنی شادی کر ڈالو۔ ایسے موقعے پر

ہم موجود ہیں۔ دراصل ہم اسی لئے آئے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیں۔"

"ہوں۔ تو خالہ بی نے بلوایا ہوگا۔" رضیہ نے منہ سے کچھ نہ کہا بس بھائی کو دیکھتی رہی۔

"ایک جج صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ایک وہ پروفیسر ہیں۔ اور ایک پھوپھی اماں کے بیٹے۔ تم خود بھی پڑھی لکھی ہو، عقل رکھتی ہو، اپنا بُرا بھلا سمجھتی ہو، تم کس کو اپنے لئے مناسب سمجھتی ہو؟"

"اگر مناسب سمجھنے کا سوال ہے تو پھر میں بنے سے شادی کروں گی۔" رضیہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بنے سے؟" بھائی صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ ("خالہ بی نے آگے ہی شاید بہت کان بھر دیئے ہیں!") تیزی سے بولے "بنے سے شادی کر کے کیا لو گی؟"

رضیہ بڑی سادگی سے بولی۔ "وہی جو جج صاحب کے بیٹے سے لونگی۔"

"کمال ہے!" وہ غصّے سے بولے۔ "ابا میاں کی پوزیشن کا کچھ تو خیال کرو۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں، ان کا اتنا بڑا نام اور صاحبزادی شادی کر رہی ہیں ایک شاعر سے کہ جس کے پاس بیوی کے پالنے کے لئے کوئی مستقل آمدنی بھی نہیں۔ اس سے تو شادی کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ساری عمر کنواری ہی رہو۔"

"تو کیا میں اس کی آمدنی سے شادی کر رہی ہوں؟"

"سر پکڑ کر روؤ گی بنو بی۔ جب فاقے پڑیں گے تب پتہ چلے گا۔ ابھی ابا میاں سنیں گے تو گولی داغ دیں گے۔"

بڑے شاعرانہ انداز سے رضیہ بی بولیں۔ "مگر محبت کے سینے پر کون گولی داغ

سکتا ہے!"

"اچھا؟" جمال میاں غصہ میں بھر کر بولے۔ "تو یوں کہئے کہ جناب کو محبت ہو گئی ہے شاعر اعظم سے!"

رضیہ نے ناگواری سے بھائی کو دیکھا۔ "آپ مجھ پر جبر نہیں کر سکتے بھائی صاحب۔ مجھ میں اتنی ہمت تو یقیناً ہے کہ اپنا گلا آپ گھونٹ سکوں۔"

باپ کے کانوں تک پہنچتے دیر نہ لگی کہ صاحبزادی نے کون سا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ پٹھانی خون جوش کھا گیا اور کانوں کی لویں سرخ پڑ گئیں۔

"ہم بھی سمجھ لیں گے صاحبزادی کتنے پانی میں ہیں"

مگر وہاں تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ واقعی کتنے پانی میں ہیں۔ بھائیوں، بھاوجوں بھتیجوں سے بات نہ چیت۔ گھر سے کالج، اور کالج سے گھر۔ بس منہ لپیٹے پڑی ہیں۔ کہاں تو خالہ بی بجائے ماں کے تھیں یا اب انہی خالہ کی صورت زہر ہو گئی تھی۔

ایک دن کالج سے آکر یوں ہی پڑی تھیں۔ منہ اترا ہوا، آنکھیں کھنچی ہوئیں۔ چہرے پر محرم برس رہے تھے۔ جب سے بھائی صاحب سے بات چیت ہوئی تھی ادھر بنے میاں کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ مگر اس دن شام کو بنے میاں وارد ہو گئے۔ مرد لوگ تو کسی جگہ ملنے گئے ہوئے تھے، بس گھر میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ رضیہ بی کی عید ہو گئی۔

دوڑتی ہوئی پھاٹک تک گئی۔ ڈرائنگ روم میں لاکر بٹھایا اور کرمن سے چائے کا کہہ دیا۔ چائے بن کر آئی تو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے پیالیوں میں انڈیل کر بنے میاں کے ہاتھ میں تھمائی۔

"کیا بات ہے؟۔ چہرہ اتنا اداس اور روبا روبا سا کیوں ہے تمہارا؟"

وہ غور سے ان کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے۔

رضیہ بی معصومیت سے بولیں۔ "دیکھو نا! یہ سب لوگ کہتے ہیں کہ میری شادی جج صاحب کے بیٹے سے کر دیں گے۔ بھلا میں کیا کروں گی ان کے ساتھ شادی کر کے؟ صبح سے شام تک اس کنجوس بنئے کی طرح بس اشرفیاں گنتی رہوں گی کیا؟"

بنے میاں ہنس پڑے۔ ٹوہ لینے کو چھیڑا۔ "تو ہوا کیا؟ اچھے امیر گھر پڑ رہی ہو، کر لو نا؟"

رضیہ نے بس آنکھیں اٹھا کر دیکھا، منہ سے کچھ نہ کہا۔ بنے میاں اپنے آپ ہنستے رہے۔

خالہ بی کسی کام سے ادھر سے کچھ دیر بعد گزریں تو کمرے سے دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ سننا چاہا مگر کان تو بیٹ تھے اتنی دور کی بات بھلا کیا سمجھ آتی۔

دوسرے دن صبح انھوں نے جب اشرف میاں اخبار لئے بیٹھے تھے۔ رات کی بات کہہ سنائی۔

"بنے میاں کل پھر آئے تھے۔!"

اشرف میاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

جان چھڑکنے والے باپ کیا سے کیا ہو گئے کہ اب صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ یا تو ہر دن باہر جاتے ہوئے پوچھ جاتے تھے۔

"بٹیا کو کوئی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"ہاں کنیز۔ بٹیا کے لئے کیا لاؤں؟"

پھر شام کو واپسی پر ساتھ میں کبھی تو کپڑوں کا بنڈل لپٹا ہوتا کبھی کتابوں کا پارسل، کبھی چاکلیٹ تو کبھی پھل۔ اب کہاں کے پھل اور کدھر کی مٹھائی: بڑی بیگم اور جمال میاں سے دو چار بار کہلوایا بھی، مگر وہ یونہی ہنڈ بنی رہی۔

"شادی تو بس پنے سے ہی کروں گی۔"

"بیٹی ذات کو اتنی شہ دینا مناسب نہیں، مگر ہم کہیں بھی تو سنے کون؟ رات بے رات، دیر سویر گھر کو لوٹنا، چائے پارٹیوں میں شریک ہونا؟ مشاعروں میں شرکت کرنا؟ غیر مردوں کے ساتھ گھومنا یہ کوئی شریف بہو بیٹیوں کے رنگ ڈھنگ ہیں؟ میں کہوں ایسی بھی کیا آزادی۔ اب بیٹھے ہیں نا ہاتھ پر ہاتھ دھرکے۔"

بڑی بیگم دونوں بہوؤں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑتیں۔

گھر میں جدھر جاتے یہی بھنبھناہٹ۔ تنگ تنگ ہو کے اشرف میاں نے اعلان کر دیا۔

"میں نے جج صاحب کے ہاں حامی بھر دی ہے، شادی کی تیاری شروع کر دو۔"

گھر میں ادھر چھم چھم لپے گوٹے چمکنے لگے اور ادھر چھم چھم آنسو بی رضیہ کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ اس دن پہلی بار اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور یوں رو دھو کر انھوں نے ہار مان لی۔

اس دن کالج کو چھٹی تھی۔ رضیہ بی دن بھر سے اپنے کمرے میں ہی تھیں۔ شام کو کوئی ساڑھے چار بجے اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔ سفید ساڑی، سفید بلاوز۔ چال میں ہم آہنگی، چہرے پر بھرپور اطمینان یوں جیسے

حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اتنے دنوں سے آنے جانے پر پابندی تھی اور یوں بڑی بیگم سے بول چال بھی چھوٹ چکی تھی مگر اس دن قریب جا کر بولیں۔

"خالہ بی میں ذرا اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں"

"کیوں؟" انہوں نے ساڑی پر لپاٹا نکتے ٹانکتے ہی پوچھا۔

"اس کا رسم ہو رہا ہے آج منگنی کا۔"

"دوئی تو کوئی ایسے خوشی کے موقعوں پر سفید ساڑی پہنا کرتا ہے؟ کوئی رنگین جوڑا پہن لو۔"

"نہیں، مجھے سفید ہی کپڑے اچھے لگتے ہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "شام تک لوٹ آؤں گی۔ شاید ابا میاں کو کہیں جانا ہو۔ اس لئے گاڑی نہیں لے جا رہی ہوں۔"

شام کے سات آٹھ بجے کے انداز میں ایک لڑکا ایک چٹھی لے کر آیا۔ رضیہ کی تحریر، اپنے باپ کے نام۔

ابا میاں! آج شام پانچ بجے میں نے اپنی پسند سے بنے سے شادی کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خبر سے بہت دکھ پہنچے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ آپ میری اس خطا کو معاف کر دیں گے۔ آخر میں آپ کی اکلوتی بچی ہوں اور بچپن سے آپ میری خطائیں معاف کرتے آئے ہیں۔

آپ کی دعاؤں کی طالب

رضیہ

آٹھ دن سے رضیہ گھر سے باہر تھی اور اشرف میاں کا یہ عالم تھا کہ مارے غصے کے انگاروں کی طرح پھنکے جارہے تھے۔ گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ نہ کوئی کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کے مزاج ملتے تھے۔ بس اپنی اپنی جگہ جلے جارہے تھے۔ ایک دن بڑی ہمت کر کے بڑی بیگم نے اشرف میاں سے کہا۔

"اب میں کہوں غصہ پیتہ کر کے فائدہ بھی کیا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب ہمارے غصّے سے شادی تو ٹوٹنے سے رہی۔"

"شادی نہیں ٹوٹ سکتی۔ ٹھیک ہے مگر میں اس کمبخت کو بندوق سے پھونک تو سکتا ہوں۔ اس کی اتنی ہمت ہوئی تو کیسے؟" مارے غصے کے ان کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

"مار کے بھی فائدہ کیا ملے گا؟ اچھا ہی ہوا اپنے گھر کی ہوگئی۔ تنہائی بڑی بری ہوتی ہے۔"

اشرف میاں نے فوں فوں کر کے ان کی طرف دیکھا۔

"کوئی حماقت سی حماقت ہے! خود بھی کہے جارہی ہیں اچھا ہوا۔ کیا اچھا ہوا؟ کاہے کی تنہائی تھی یہاں؟"

"مرد کے سہارے کی ضرورت تو ہر عورت کو محسوس ہوتی ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوا کہ اس نے اپنی پسند اور چاہت سے یہ سہارا ڈھونڈا ہے۔ عورت اگر تنہائی محسوس نہ کرے تو دنیا میں مرد کی ضرورت ہی نہ پڑے۔" وہ خالی نگاہوں سے اشرف میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

اشرف میاں نے ایک لمحے کو ان کی اور دیکھا۔ لمحہ بھر خاموشی رہی۔ یکدم وہ بپھر کر بولے۔ "بال سفید ہورہے ہیں مگر عقل نام کو نہیں۔"

اتنے غصے پیتے سے بھی کام نہ چلے گا۔ پیٹ کی اولاد ہے آخر۔ معاف کیوں
نہیں کر دیتے ؟"

"معاف کر سکتا ہوں، مگر اس صورت میں کہ وہ پھر کبھی اپنی سسرال
نہ جائے۔"

"اے لو! کیا بیٹیاں اسی لئے سہاگ کی چاہت کرتی ہیں کہ گھر میں
بیٹھ جایا کریں۔"

"تو پھر میں اس کمبخت کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ زندگی بھر اس کی صورت
دیکھنا مجھ پر حرام ہے۔"

"ہے ہے ایسی بڑی بڑی قسمیں نہ کھائیے۔ کیسے باپ ہیں؟ سمجھ میں نہیں
آتا۔ قصور تو اولاد سے ہوتا ہی ہے۔ کیا یونہی قسمیں کھا لیا کرتے ہیں۔"

"ایسا قصور کوئی بھی نہیں کرتا نا مگر۔" وہ ذرا نرم پڑ کر بولے۔

"نامراد نے عزت مٹی میں ملا دی ساری۔ ان آٹھ دنوں میں آدھا بھی نہیں رہ گیا۔"

"تو بھلا عزت کاہے سے مٹی میں ملا دی؟ کیا کوئی حرام کا پیٹ گرایا
ہے یا کوئی ناجائز بچہ جنا ہے؟ بس پسند سے شادی ہی کی ہے نا۔ اس
میں کیا گناہ ہو گیا؟ یہ تو زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

اشرف میاں نے غور سے ان کی طرف دیکھا، پھر بولے۔

"مگر میں تو اپنی جگہ اب تک یہی سمجھتا رہا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو گی۔
اسی کو چھپانے کے لئے شادی رچا لی۔"

"جانے کس کس کے بہکاووں میں آ جاتے ہیں آپ۔ گھر میں چلتی پھرتی
دیکھ کر کبھی تو مجھ پہ بھید کھلتا۔ بالکل بے قصور ہے بچاری۔ بس اتنا

ہی قصور کہ اپنی پسند سے بر چنا ہے۔ اچھا ہی کیا۔ زندگی تو اسی کو گزارنی تھی۔ اگر اِدھر اُدھر پکڑ کر باندھ دیتے تو کیا ہوتا؟ جیتے جی مر جاتی۔ اب میں کہتی ہوں سیدھی طرح معاف کر دیجئے اور چار لوگوں کے سامنے رخصتی کر دیجئے۔ شادی تو ہو ہی گئی۔"

اشرف میاں پھر بدک گئے۔ "ہاں ہاں رخصتی کر دوں؟ کیوں کر دوں۔ مجھے معلوم ہے اس کمبخت نے میری بچی سے اسی لئے شادی کی ہے کہ جہیز اور زیور اس کے ہاتھ لگے۔ محبت وحبّت خاک نہیں۔ آج کل کے لونڈوں کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ بس۔"

"ہے ہے کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں آپ! اس بیچارے کو لالچ ہوتی تو یوں کھڑا کھڑی شادی کاہے کو رچاتا کہ صرف جسم کے جوڑے سے گئی تھی رضو۔ نہ کوئی بھاری جوڑا، نہ جسم پر ماسٹے کا چھلّہ۔ خواہ مخواہ کی بدگمانی بھی ٹھیک نہیں۔ بڑی بیگم کی آنکھوں میں سے بات منہ کھل رہی تھی۔

اسی دن شام میں رضیہ آگئی۔ اشرف میاں الماری سے کتاب نکالے کھڑے تھے یہ جا کر ان سے لپٹ گئی۔ پیٹھ موڑ کر دیکھا تو رضیہ تھی۔ کہاں تو بندوق سے پھونک دینے کا عزم کئے بیٹھے تھے یا اب گلے سے لپٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شرماتے جھینپتے ننّے میاں بھی آکے چوٹوں کی طرح کھڑے تھے جس سے خسر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آؤ۔ بیٹھو نا میاں۔ اب تو تم ہمارے داماد ہو گئے۔"

شادی کا اصل ہنگامہ اب نکاح خوانی کے چند دنوں بعد ٹھہرا۔ اشرف میاں بڑی حیثیت کے مالک تھے اور روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ بیٹی

کا جہیز کچھ تو پہلے ہی سے تیار تھا۔ کچھ اب ہو گیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں گئے ہوئے تھے۔ بڑی بیگم جہیز کے کمرے میں ایک ایک چیزیں لا کر رکھتی جاتیں۔

"دیکھئے یہ ساڑیاں آپ دلی سے لائے تھے۔"

"یہ پاندان مرادآباد کا ہے۔"

"یہ چوڑیاں آگرے کی ہیں۔"

ان کی سفید ساڑی کا پلو بار بار گرتا اور وہ بار بار سنبھالتیں۔

"ارے — یہ پاندان کیوں رکھ دیا وہاں۔ رضیہ بھلا پان کب کھاتی ہے؟"

"اے واہ تو کیا ہوا۔ آخر دولہے کو بنا کر دے گی تو سہی۔" ان کے چہرے پر شعلہ سا جلا اور اسی لمحے بجھ بھی گیا۔ وہ پھر سامان کی اٹھا پٹخ میں جت گئیں۔

ایک زعفرانی ساڑی انھوں نے میز پر پھیلائی۔ "یہ آپ لکھنؤ سے لائے تھے نا۔ دھیان سے مجھے بتاتے جائیے۔ جانے بے چاری ذکیہ کے ہاتھ کی چیزیں کہاں کہاں رکھی ہیں۔"

"زعفرانی رنگ تو سانولی رنگت پر خوب کھلتا ہے۔ رضیہ تو اچھی خاصی گوری ہے۔ جانے کیوں خرید لی تھی۔"

سامنے کے سنگھار دان میں بڑی بیگم کو اپنی سانولی رنگت تیزی سے سُرخی میں بدلتی دکھائی دی۔ وہ جھٹ سامنے سے ہٹ گئیں۔

ڈھم ڈھم ڈھم ڈھول پٹے۔ اور رضو بی چار لوگوں کی موجودگی میں بنے میاں کی ہو گئیں۔ رخصتی ہو گئی۔ رضیہ بی اپنی ساس، نندوں

اور دولھا کے ساتھ سسرال چلی گئیں۔ سنسان گھر میں پھولوں کی مہک اور مرجھائی کلیاں باقی رہ گئیں۔ گلی میں اب تک زور زور سے باجے بج رہے تھے۔

اشرف میاں بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوئے۔ بیٹی بیٹھی رہے تو دل بوجھل، اٹھ جائے تو چھاتی بوجھل۔

بڑی بیگم بار بار اپنی آنکھیں پونچھتیں اور آنسو پھر اسی تیزی سے پھر آتے۔

"گھر کیا سنسان ہو گیا ہے۔" وہ بھرے گلے سے بولیں۔

"ہاں اب سنسانی ہی سنسانی ہے۔ رضیہ اپنے گھر کی ہو گئی، بیٹے باہر کے۔ تم تھیں سو ایک رضیہ کی وجہ سے۔ بس اب ہم ہی ہم ہیں۔"

بڑی بیگم نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر آ رہے تھے۔

"ہاں رضیہ کی وجہ سے بڑی دلبستگی تھی، مگر بیٹیاں بھلا کب تک ساتھ دیا کرتی ہیں۔"

"بیٹیوں کا کیا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں دیتا۔ چار دن رہ کر سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے ہیں۔" انہوں نے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر بڑی بیگم کو دیکھا اور اکدم کچھ یاد کر کے بولے۔

"ہاں جی تم تو خود رضیہ اور بنے کی شادی کے اتنے خلاف تھیں۔ پھر تم ہی نے کیسے ان کا ساتھ دیا؟"

"میں نے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اور کیا میں تے؟۔ کبھی کہتیں رضیہ کو معاف کر دو۔ کبھی کہتیں

رخصتی کر دو۔ کبھی پچھتاتیں کہ دونوں کو گھر بلا لو۔ کبھی کہتیں بنے اچھا خاصا لڑکا ہے اور کبھی "

بے تکے انداز میں بڑی بیگم بولیں۔

"میں نے سوچا ہو سکتا ہے تنہائی کا بھوت جس طرح مجھے ڈستا رہتا ہے اسی طرح رضیہ کو بھی ڈستا ہو۔ پھر یہ مجھے اپنی زیادتی ہی لگی"

"زیادتی؟"۔ اشرف میاں حیرت سے بولے۔" وہ کیسی؟"

" رضیہ کو کسی نہ کسی کا سہارا تو ہونا ہی تھا۔ سو اس نے ڈھونڈھ لیا۔ رضیہ کی کیا بات ہے۔ کوئی بھی عورت بغیر سہارے کے نہیں رہ سکتی۔ پھر اس میں ناراضگی اور غصے کی کون بات؟ اور پھر بے چارہ بنے اچھا خاصا سمجھ دار لڑکا ہے"

"تم نے اس کے دل میں جھانکا ہے جو یوں کہتی ہو؟ کیا پتہ وہ تیز مزاج ہی ہو۔ بھلا رضیہ کو کہاں سہار ہو گی کہ مرد کی گھرکیاں سُنے"

سوئے سوئے لہجہ میں وہ بولیں۔" ہونہہ سہار کہاں ہو گی" مرد کی گھرکیاں کھانے میں کیا برائی ہے بھلا؟ اور پھر عورت جس سے پیار کرے اس کی گھرکیاں سننے میں بھی مزہ آتا ہے"

وہ آپ ہی آپ چونکیں۔" کیا کہا میں نے!"

"تم یہ کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے اور تمھیں میری گھرکیاں کھانے میں مزہ آتا ہے"

وہ گھبرا گئیں۔" واقعی میں نے یہ کہا؟"

اشرف میاں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ بڑھاپا زبان سے

کہہ رہا تھا۔" میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔ میں......"
اکدم اشرف میاں زور سے بولے۔
"ارے تم نے وہ زعفرانی ساڑی رضیہ کے ساتھ کر دی کیا؟"
"اور کیا رکھ لیتی؟ جہیز کی تھی۔ جہیز میں رکھ دی۔" وہ دھیرے سے بولیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ تیز ہو کر بولے۔" اب بھلا رضیہ پر کیا کھلے گی وہ ساڑی۔ اکدم گوری ہے رضیہ۔ تم پہنتیں تو کس قدر اچھی لگتیں۔"

اکدم بڑی بیگم کی نگاہ میز پر پڑے ہوئے پاندان سے جا ٹکرائی۔

"اے ہے، پاندان یہیں رہ گیا۔"
"رہ نہیں گیا۔ میں نے رکھ لیا۔"
"کیوں؟" بڑی بیگم تعجب سے بولیں۔
"تمہارے لئے۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔
"وُوئی میں کب پان کھاتی ہوں بھلا۔"
"نہیں کھاتیں تو مجھے تو بنا کر دوگی۔"

بڑی بیگم نے گھبرا کر منہ اوپر اٹھایا۔ اشرف میاں ان کے چہرے پر جھکے چلے آرہے تھے۔

سارے میں پھولوں اور صندل کی مہک مہکار رہی تھی۔ ڈھم ڈھم ڈھم باجوں کی تیز آواز ان کے کانوں میں گھس کر پردے پھاڑنے لگی۔

گناہوں کی پاداش

"ہائے اس ٹونی نے تو میری جان لے لی۔"
شمیم شیو کرتے کرتے گڑبڑا کر اٹھا اور دروازے پر آکر بولا۔
"ارے کیا کیا ٹونی نے ؟"
برآمدے میں ثریا جھلائی ہوئی کھڑی تھی۔
"دیکھئے نا پڑوسی کے بچے کو اتنی زور سے پتھر مارا کہ سارا خون نکل آیا۔"
"تو اس میں تمہاری جان کیسے چلی گئی ؟"۔ شمیم حیرت سے بولا۔
"ہائے ہائے میری جان کیسے نہ جائے بھلا ؟ ۔ شرمندگی کے ٹھیکرے تو میرے ہی سر آکے پھوٹتے ہیں نا۔ کل رزاق صاحب کے کتے کو اس زور سے لکڑی ماری کہ وہ لنگڑا ہو گیا۔ رحمت علی کی بلی کو چھت پر سے نیچے پھینک دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بچی کے ہاتھ سے مٹھائی چھین کر کھا گیا۔ اور یہ سب مقدمات آتے ہیں میری عدالت میں — یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی ؟"۔
"قسم خدا کی ثریا، تم بھی بس بات کا بتنگڑ بنائے ڈالتی ہو۔ ارے بچے شور شرارت کرتے ہی رہتے ہیں۔"
"مگر شرارت بھی شرارت جیسی ہو۔ تین سال کا تو ہو گیا۔ اور —"

شمیم بھنا کر بولا۔ "تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے تین سال کا نہیں تیس سال کا ہو گیا ہو۔ آخر تین سال کے بچے سے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟"

"ارے یہ بچہ ہے؟ آپ اسے بچہ کہتے ہیں؟ اس نے تو بڑے بڑوں کے کان کاٹ دیئے ہیں۔ میں تو اس بچے سے عاجز آ گئی۔"

شمیم نے حیرت سے دیدے پھاڑ کر بیوی کو دیکھا۔

"تم۔ تم اپنے بچے سے عاجز آ گئیں؟"

"اور کیا؟ جب دیکھو تب شرارت۔ جب دیکھو تب شرارت۔ آخر دنیا میں اور بھی تو بچے ہوتے ہیں۔"

"پھر تمہارا ارادہ کیا ہے آخر؟"

"میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں گی رسی سے۔"

"اچھا؟" شمیم ہنس کر بولا۔ "بہت بڑے بڑے ارادے باندھ رہی ہیں حضور۔"

ثریا بپھر گئی۔

"پھر وہی ہنسی۔ آپ کی اس ہنسی نے اسے شیر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"میری ہنسی نے؟ میں بھلا کیا کرتا ہوں؟"

ثریا تیزی سے ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔ "اس دن ڈاکٹر صاحب کی مونچھوں کو پکڑ کر کھینچ رہا تھا تو آپ ہنس رہے تھے کہ نہیں؟ پھر اس دن ابا جان کی داڑھی کو دیکھ کر بولنے لگا۔ نانا میاں آپ کی داڑھی تو جھاڑو ایسی ہے، تو کون ہنس رہا تھا؟ میں؟؟ انہی باتوں سے تو اسے شہ ملتی ہے۔"

شمیم کو پھر ہنسی آ گئی۔ "تو تمہارا مطلب ہے میں ہنسوں بھی نہیں؟"

" ہنسئے نا صاحب، ضرور ہنسئے۔ کون کم بخت منع کرتا ہے؟۔ مگر صاحبزادے کے کرتوت بھی دیکھتے جائیے۔ اس دن ابا جان کے سامنے مجھے کیسی شرمندگی ہوئی۔ بھلا کوئی نواسہ نانا کو ایسا کہتا ہے کہ " آپ کی داڑھی تو جھاڑو ایسی ہے۔"

" ثریا بی بی تم تو الٹی طرح سے سوچنے کی عادی ہو۔ یوں دیکھو تو یہ کتنی ذہانت کی بات ہے کہ ...."

" ہاں ہاں کتنی ذہانت کی بات ہے کہ نواسہ نانا کی داڑھی کو جھاڑو بنا ڈالے۔"

" تم نے اچھی لوگوں کے بچے دیکھے ہی نہیں، کیسے بے ہودہ ......"

" اجی بس بس۔ اپنا بچہ دیکھ دیکھ کر ہی حیران ہیں۔ دوسروں کے دیکھنے کی کیا تمنا کریں؟ میں تو سچ اب اسے نہ باندھ کے رکھوں تو میرا نام پلٹ دینا۔"

اتنے میں باہر کے دروازے سے ٹونی میاں برآمد ہوئے ــــ بش شرٹ گلے کے پاس سے پھٹا ہوا، گال مٹی میں سنے ہوئے۔ جوتے ندارد، اور بال یوں جیسے بیے کا گھونسلہ۔

" دیکھا دیکھا۔" ثریا چلا کر بولی۔" اس کم بخت کو کل ہی نیا بش شرٹ پہنایا تھا۔"

شمیم پھٹے کالر کو دیکھ کر ہنس دیا۔" ارے تو کیا ہوا؟۔ اس کا باپ ساڑھے پانچ سو اور کس لئے کماتا ہے؟"

ثریا نے حیرت اور غصے سے میاں کو دیکھا۔" ہائے تو آپ ساڑھے پانچ سو اسی لئے کماتے ہیں؟"

"ظاہر ہے ہر باپ اپنی اولاد کے لئے ہی کماتا ہے۔"

"ایسا باپ تو آج تک میری نظروں سے نہ گزرا۔"

"تو جانم یہ تو بتاؤ کہ آج تک تم نے کتنے باپ برت ڈالے ہیں؟" شمیم شرارت سے بولا۔

آپ کو تو مذاق ہی سوجھتا ہے۔ قسم خدا کی آپ کے بیٹے کے یہ کارنامے اب مجھ سے برداشت نہ ہوں گے۔"

ٹونی میاں اتنے میں باپ کی گود میں جا سوار ہوئے تھے۔ باپ ان سے ہنس ہنس کر باتیں بگھار رہے تھے۔ ثریا کی جان جل گئی۔

"دنیا کے سارے شریر بچوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری صرف باپوں کے سر جاتی ہے۔"

"ہونہہ۔ اور جیسے مائیں تو بڑی سمجھدار مخلوق ہوتی ہیں نا؟"

"دنیا کا نہیں کہتی ہوں، میں تو کم از کم آپ سے لاکھ درجہ اچھی ہوں۔ اگر میں توجہ نہ دوں تو یہ بچہ نہ جانے کیا کر دکھائے۔"

ٹونی میاں شریر نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جانے باپ نے انھیں ٹھوکا دیا یا خود ہی بدمعاشی سوجھی کہ ماں کو زبان چڑا بیٹھے۔۔۔ ثریا کے ضبط کی ساری طاقت جاتی رہی۔ شمیم کی گود سے ٹونی کو گھسیٹتی ہوئی بولی۔

"یہ ایسے تو مانے گا ہی نہیں۔"

اور اس نے ٹونی کو کھینچتے ہوئے لے جا کر کھمبے سے رسی کے ساتھ باندھ دیا۔ شمیم کو ثریا کی پریشانی دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی، وہ سر جھٹکتا ہوا منہ دھونے چلا گیا۔

شام کو شمیم واپس ہوا تو دیکھا کہ ثریا کا منہ اسی طرح پھولا ہوا ہے۔

"کیوں اب کیا ہو گیا؟" وہ ہنس کر بولا۔

"ہوتا کیا؟ میں نے رسی سے باندھ کر چھوڑ دیا۔ وہ جناب آخر کس باپ کی اولاد ہیں؟ جانے کس طرح زور لگا کر رسی کھول ڈالی۔ اور سیدھے گھر سے باہر بھاگ گئے۔" ثریا غصے سے جھاڑ کے نیچے مری ہوئی مرغی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "دیکھئے شکاری باپ کے شکاری صاحبزادے مرغی مار کر لائے ہیں۔ تین روپے ڈنڈ ہو گئے۔ اب کہئے نا بڑا ذہین ہے۔"

"ارے باس ـــ تین روپے کے لئے اتنی جھنجھٹ میں بھی سمجھا شاید تین سو روپے برباد کر ڈالے۔" وہ لبس کو لمبا کرتے ہوئے بولے۔

باپ کے اس رویئے سے ثریا کے تاوؤں میں لگی تو سر ہی میں جا کر بجھی۔

"میں تو باپ بیٹے کو دیکھ دیکھ کر دنگ ہوں خداوند۔"

"کیوں؟ بہت غیر معمولی مخلوق ہیں کیا ہم دونوں؟ باپ ہنس کر بولے۔

ثریا بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"کیوں جی۔ بچپن میں آپ بہت شریر تھے کیا؟"

"یہ تو امی جانیں۔ ویسے کوئی خاص تو نہیں۔ بس اپنے ٹونی جیسی معمولی شرارتیں یونہی دل بہلانے کو کر لیا کرتے تھے۔"

"ارے خدا ـــ یہ شرارتیں معمولی ہیں؟" ثریا سینے پر دوہتڑ مار کر بولی۔ "گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں۔" شمیم ہنس کر بولا۔ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ماشاءاللہ دوسرے صاحبزادے بھی دنیا میں آنے کے لئے بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔" وہ اس کے بڑے سے پیٹ کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"میں تو انہی سے بیزار ہوں۔" وہ سچ مچ بیزاری سے بولی۔ شمیم سنجیدہ ہوگیا۔

"یہ تم کہہ رہی ہو ثریا۔ تم۔؟"

"جی ہاں میں۔ میں یعنی ثریا۔"

"یعنی تم ایک ماں ہو کر ایسا کہہ رہی ہو۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" وہ طعن سے بولی۔

"اصل میں خدا نے تمہیں بن مانگے ہی اولاد دے کر اچھا نہیں کیا تمہیں معلوم ہی نہیں لوگ اولاد کے لئے کیسے تڑپتے ہیں اگر تمھیں بھی اتنی ریاضتوں اور عبادتوں کے بعد ایک بچہ ملتا تو قدر کرتیں۔"

"اولاد کا کیا ہے۔ سبھی کو دیر سویر ہو جاتی ہے۔ خود میرے میکے میں ڈھیر بھر بچے تھے۔ ایسا کیا دنیا کے سوا مجھی کو بچہ ہوا ہے؟"

"ارے تم کیسی ماں ہو؟ مائیں تو اولاد کی شرارتوں پر بھی یوں خوش ہوتی ہیں۔ ہر آئے گئے سے تذکرہ کرتی ہیں کہ دیکھو اس نے ایسا کیا، اس نے ویسا کیا۔"

"میری اولاد نے تو بس شرمندہ کروانا ہی سیکھا ہے۔ پرسوں ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئے۔ پہلے تو جناب نے چائے کی میز پر وہ اودھم مچایا کہ وہ بھی یہ سمجھے ہوں گے کہ اس کے ماں باپ نے کبھی اس کو چائے پلائی ہی نہ ہوگی۔ وہاں سے اٹھے تو ان کے بچوں میں جا کر گھس گئے۔ اور ایک سرے سے سبھی کی پٹائی کر ڈالی۔ لڑکیوں کے کمرے میں جا کر گڑیاں توڑ ڈالیں۔ کھلونے بکھیر ڈالے۔ رہی سہی کسر باغ میں جا کر پوری کر دی۔ سارے پھول توڑ مار کر پھینک دئے۔ سارے گھر میں رونق ہی رونق بکھرا دی۔ میں نے ڈانٹ بتانی چاہی تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی بولیں۔ "اے ہے بچے ایسا کرتے ہی ہیں۔

مگر وہ بھی جھلائی ہوئی دیکھ رہی تھیں۔ یوں کہنے کو تو کہنا ہی پڑتا ہے۔"

"آخر ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟" شمیم اُلجھ کر بولا۔

"مطلب؟ ہونہہ، آپ تو یونہی دھونس دکھا رہے ہیں۔ جو کرتا ہے وہی جانتا ہے۔ ایسا ہی ہے تو ذرا دن بھر سنبھال کر بتا دیجئے۔ تب کہوں کہ ہاں باپ ہیں۔"

یہ تو شمیم صاحب کی مردانگی کو کھلا چیلنج تھا۔ ڈٹ کر بولے۔

"اب اتنا گیا گزرا بھی نہ سمجھ لو۔ ایک کے بعد ایک گیارہ بچے جن ڈالو اور سب کو بائیں ہاتھ سے سنبھال کر نہ بتاؤں تو شمیم نہ کہنا۔ مہتر کہنا۔"

"جو گرجتے ہیں وہ کبھی نہیں برستے۔" ثریا تاؤ کھا کر بولی۔ "جیسے میں جھوٹ ہی تو کہتی رہتی ہوں۔ مشین پر ذرا سیون کرنے تو بیٹھئے۔ کبھی تاگے کی گنڈی نکال کر پھینک دے ہے تو کبھی کپڑا ہی کھینچ لے۔ کیا مجال جو ایک کپڑا ایک ہفتے میں بھی پورا کر لوں۔"

"سینا ہی نہ آتا ہوگا۔ ورنہ کون سگھڑ ایک کپڑا ہفتے بھر تک لئے بیٹھی رہتی ہوگی۔"

ثریا پاؤں پٹخ کر بولی۔ "دیکھئے شمیم صاحب مجھے غصہ نہ دلائیے۔"

"ارے بھئی غصہ کون دلا رہا ہے؟ سیدھی سچی بات پر تم خود ہی غصے ہو جاؤ تو میرا کون قصور؟"

"آپ کا مطلب ہے مجھے سینا نہیں آتا۔ پھر یہ کرتا جو آپ پہنے ہیں کس نے سیا ہے۔؟ یہ آپ کا لاڈلا جو قمیص پہنے پھر رہا ہے۔ کس پھوہڑ نے سیا ہے؟"

"بازار سے خرید کر بھی پہنا دو اور یہ کہہ دو کہ میں نے سیا ہے تو میں کیا جانوں!"

"ہاں ہاں میں تو ایسی ہی جھوٹی ہوں نا۔ اور یہ حضور جو سوئٹر ڈاٹے پھر رہے ہیں تو کس نے آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر بنا ہے؟" اک دم ثریا کو کچھ یاد آیا۔ تیزی سے بولی۔ "اور ننھے کے لئے کوئی تین ہفتوں سے موزے بننے شروع کر رکھے ہیں۔ مگر یہ آپ کا جگر گوشہ کچھ تو سو جھنے دے۔ کبھی تو بلی کے بلونگڑوں کی طرح گولوں کے پیچھے لپک کر اون الجھا ڈالے۔ اور کبھی سلائیاں پھینک دے۔"

شمیم ذرا اکڑ سے بولا۔ "یہ ننھے کی فکر کیوں ہو رہی ہے حضور کو؟ وہ بھی تو آخر ٹونی کا بھائی ہوگا۔"

ثریا کے چہرے پر ذرا سی شرم آگئی۔ مگر وہ دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے بولی۔

"تو بس اب معاملہ ختم ہے۔ اب آگے کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔"

"کیوں؟ معاملہ ختم کیسے ہے؟" شمیم حیرت سے بولا۔

"بس میں کوئی دوا کھا لوں گی کہ بچے ہی نہ ہوں۔"

شمیم کو غصہ آگیا۔ "دیکھو ثریا بی بی تم میرے بچوں کو دنیا میں آنے سے منع نہیں کر سکتیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ باپ تو اپنا کام کر کے چلتے بنے اور ستم ٹوٹے ماں کی جان پر — بھلا بچے پیدا ہونے میں آپ کا کیا جاتا ہے؟"

"اور آپ کا کیا جاتا ہے جناب؟"

"پیدا کرنا پڑے تو پتہ چلے۔"

"اور کیا ہم اتنی مشکل سے پیدا نہیں کرتے تو کیا تم کرتی ہو؟"

شمیم ہنس کر بولا۔

"ہائے اللہ!" ثریا آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "آپ بھلا کیا کرتے ہیں؟ خواہ مخواہ منہ کو آرہے ہیں۔"

"آ تو نہیں رہا ہوں، اگر تم چاہو تو تمہارے منہ تک آسکتا ہوں ضرور۔"

شمیم معنی خیز ہنسی ہنس دیا۔

ثریا الجھ کر بولی۔ "یہی اثرات تو اولاد میں بھی ہیں۔"

"ارے شکر کرو ڈیر۔ اگر دنیا کی اور ماؤں کو ایسی اولاد ہو تو وہ شکر کے مارے سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔"

"وہ پاگل عورتیں ہوتی ہوں گی۔ اپنی تو جان آدھی ہو گئی۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ سیزن شروع ہوتے ہی اسے کانونٹ میں داخل کروا دوں گی۔"

"ہائیں۔!" شمیم صاحب حیرت سے بولے۔ "ابھی سے؟ ارے ابھی تو وہ اتنا سا ہے۔ ابھی سے پڑھائی کا بار اس کے سر پر؟"

"ہاں ہاں اتنا سا ہے، مگر شرارتیں تو دیکھئے۔ زمین آسمان ایک کر رکھا ہے۔"

"آخر تم اس سے اتنی بیزار کیوں ہو؟"

ثریا نے میاں کو گھورا۔ "جیسے مجھے دیوانے کتے نے کاٹا ہے نا جو جان بوجھ کر خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑ گئی ہوں۔"

"بھئی میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر نوکر کیا کرتا ہے؟"

"جی ہاں ایسا ہی آپ کا لاڈلا نوکر سے سنبھلنے والا کھٹیرا۔ اسے تو جوتی کے

بدل نہیں گنتا۔ وہ وہ گھونسے اس کے سر اور پیٹھ پر کستے ہیں کہ جان جوان آدمی اور بلبلا ہی جائے۔ ہیں تو آپ کے لاڈلے تین سال کے۔ مگر چھ سال سے کم کے نظر آتے ہیں۔ نہ حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ ننھے گنائے جا سکیں۔" بڑی بے بسی سے وہ بولی۔

"وہ جانے کس گناہ کی پاداش میں اللہ نے ایسا بچہ میرے پیٹ میں دے دیا۔"

اب تو شمیم صاحب کے صبر کا پیمانہ چھل چھل چھلک پڑا۔

"اچھا تو یہ ٹونی آپ کے گناہوں کی پاداش ہے۔"

"بالکل۔"

"تو پھر پھینک کیوں نہیں دیتیں اٹھا کر؟"

"وہی تو سارا جھگڑا ہے کہ پیٹ کی اولاد کو کوئی پھینکے تو کیسے؟"

"تو کیا تم سچ مچ ہی اس سے بیزار ہو؟"

"تو آپ کے خیال میں میں اب تک مذاق فرما رہی تھی۔"

"اچھا یہ بات ہے تو اپنے بچے کو ہم سنبھال لیں گے۔"

"آپ!" ثریا ہنس کر بولی۔ "ارے آپ؟"

"کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ کیا باپ بچوں کو سنبھال نہیں سکتے؟"

"کیوں نہیں صاحب، کیوں نہیں۔ ضرور سنبھال سکتے ہیں۔ ضرور سنبھال سکتے ہیں۔ ثریا طعنہ سے بول رہی تھی اور ہنستی بھی جا رہی تھی۔

"وہ ڈاکٹر صاحب، رات کو بچہ پیشاب کر دیتا ہے تو اٹھ کر پوتڑا بدل دیتے ہیں۔ اور رحمت علی خود میری آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کو کموڈ پر بٹھا رہے تھے۔ اور رزاق صاحب ایک دن بوتل سے منی کو دودھ پلاتے بیٹھے تھے۔

میں کون ایسا گیا گزرا ہوں"۔
"مگر جناب آپ رہے دن بھر آفس میں، اور آفس والے کیسے یہ
کام کر سکتے ہیں؟"
"اجی کرنے والے دنیا کے کام کر سکتے ہیں، بس ہمت چاہیئے"۔
"تو آپ ٹونی کو آفس لے جایا کریں گے؟" وہ حیرت سے بولی۔
"ظاہر ہے"۔
"اور کام کون کرے گا آپ کا؟"
"ہم ہی کریں گے اور ہم سنبھالیں گے۔ آپ نے کیا بالکل ہی بدھو سمجھ
رکھا ہے"۔
ثریا خوشی خوشی بولی۔ "پھر تو سچ مچ مجھے بڑا سکون مل جائے گا۔
میں دن بھر چین سے کام کیا کروں گی۔ اپنی سہیلیوں کے ہاں جایا کروں گی۔
کپڑے سینا سوئٹر بننا، ارے سبھی کچھ سکون سے کر سکوں گی"۔
شمیم صاحب حیرت سے بولے۔ "اور وہ یاد نہیں آئے گا"۔
"ارے یاد آنے کی کون بات ہے۔ شام کو تو آہی جایا کرے گا نا"۔
"اور جو کبھی وہ تمہیں یاد کرے تو؟" وہ ذرا پریشانی سے بولے۔
"اونہہ، وہ بے ایمان باپ کی اولاد۔ مجھ سے ایسی کون لگی لپٹی رہتی ہے
کہ میری کمی محسوس کرے۔؟"
دوسرے دن آفس جانے کا وقت آیا تو شمیم صاحب نے خود اپنے ہاتھوں
ٹونی بیٹے کو کپڑے بدلوائے۔ تھرموس میں دن بھر کے لئے دودھ رکھا۔ بسکٹ
کا ڈبہ، چاکلیٹ، سارا الم غلم پلاسٹک کے بیگ میں بھر لیا۔ موٹر سائیکل کے

پیچھے ایک گدی رکھ لی گئی کہ ٹونی میاں آرام سے بیٹھ سکیں۔
"اچھا چلو بیٹے۔" باپ نے پکارا۔ "ممی کو ٹاٹا کرلو۔"
"ٹاٹا ٹاٹا۔" وہ اپنی باریک اور شریر آواز سے چلائے۔ "بیٹا ممی کو یاد تو نہیں کروگے؟" انھوں نے لاڈ سے پوچھا۔
جواباً ٹونی میاں نے سامنے کھڑی ممی کو پوری کی پوری زبان چڑا دی۔ جیسے "اونہہ ممی میں کیا دھرا ہے کہ انھیں یاد کیا جائے۔"
ثریا کا مزاج جاتا رہا۔ "دیکھا، دیکھا۔ ان گنوں کے صاحبزادے ہیں۔ بھلا اپنی ماں کو کوئی زبان چڑایا کرتا ہے؟"
باپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر جب وہ جانے لگے تو تیز بھاگتی ہوئی موٹر سائیکل پہ بیٹھے بیٹھے مڑ کر انہوں نے قصداً ماں کو اور ایک بار زبان چڑا دی۔
"ای۔ ای۔ ای۔" ثریا نے بھی جل کر ساری زبان نکال دی۔
شام کو شمیم صاحب واپس آئے تو ٹونی صاحب پھدکتے ہوئے پہلے کے پہلے ماں کے کمرے میں گھس آئے۔
"پپا نے توہمیں مٹھائی بھی دی۔ ہاں ہاں۔" اور وہ مارے اتراہٹ کے راک اینڈ رول کرنے لگے۔
ثریا نے ذرا جھلا کر میاں کی طرف دیکھا۔ "کیوں جی۔ اس نے وہاں ستایا نہیں؟"
"ستاتا کاہے کو؟ تم کو دراصل بچہ پالنا نہیں آتا۔ خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ وہ تو اتنی شرافت سے بیٹھا کہ پوچھو نہیں۔ سارے کلرکوں نے

اسے ہاتھوں ہاتھ کر لیا۔"

"اسی لئے نا کہ بوس کا بچہ تھا۔ ورنہ کون ایسے شریر بچے کو منہ لگاتا ہے؟"

"ارے قسم سے یہ بات بالکل نہیں تھی۔ وہ خود ایسا پیارا ہے جو کہتیں اتنی پیاری ہیں کہ سب دل چھوڑ بیٹھے۔ اور ہمارے کاظم صاحب تو بس بار بار یہی حیرت کر رہے تھے کہ باتیں کس قدر کرتا ہے۔ ورنہ تین سال کے بچے تو ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے۔"

ماں اکتا کر بیٹے سے مخاطب ہو گئی۔ "کیوں پیارے دن کیسے گزارا؟"

ٹونی صاحب لاکھ گئے گزرے تھے، جھوٹ بولنے کی عادت نہ تھی۔ دن بھر کی کارگزاری سنانے پر تل گئے۔

"ممی ہم نے انکل کی ناک پکڑ کر کھینچی، پھر ایک دوات پھوڑ ڈالی۔ وہ موٹے کاظم صاحب کی کاپی پھاڑ کر ٹوکری میں پھینک دی اور ان کو پتہ بھی نہ چلا۔"

ثریا نے فتحمندی سے میاں کی طرف دیکھا۔ "کیوں جی؟ آپ تو کہتے تھے یہ چین سے رہا۔"

"ارے بچہ ہے تو کیا اتنی بھی دھم دھوم نہ کرے۔ مگر تم جتنا پراپیگنڈ کرتی تھیں اتنا اودھم تو ہرگز نہیں کیا۔" اکدم وہ ہنس کر بولے۔

"یہ بتایئے آپ کا دن کیسے گذرا؟"

"میرا۔؟ ارے میرا کیا پوچھتے ہیں آپ۔ سب سے پہلے تو میں نے ننھے کے چار فراک سی ڈالے۔ وہ ادھورے موزے پورے کئے۔ پھر ڈھیر بھر کپڑے دھوئے اور پھر تین دن سے جو جام منگوا رکھے تھے۔ ان کی جیلی تیار کر ڈالی۔"

"تو یوں کہئے خوب اطمینان سے دن گزرا آپ کا؟"

"خوب ــ اتنے دن بعد کنوار پنے کا سا زمانہ آج پھر لوٹ آیا تھا کہ اپنی مرضی سے جو چاہو کرو۔ کوئی ہاتھ ڈالنے والا نہیں۔"

"اور جو بے چارہ ٹونی ہوتا تو کیا بگاڑ دیتا تمہارا؟"

"ارے ظاہر ہے ساری دنیا تہہ و بالا کر ڈالتا۔ سب کاموں کو ڈلئے چوٹھے ہیں، جیلی کو ہی لیجئے۔ سارے جام حضرت پار کر ڈالتے۔ کچھ کھاتے، کچھ پھینکتے۔ اور رہے سہے محلے کے بچوں میں میری چوری سے بانٹ آتے۔ لڑنے کو بھی ایسے ہی چوکس اور دوستی نبھانے کو بھی ایسے ہی تیار۔"

"مگر اب تو تمھیں سکون مل گیا نا؟" وہ طعن سے بولے۔

"مجھے تو ظاہر ہے مل گیا۔ اب اپنا بچاؤ کیجئے۔" وہ ہنس کر بولی۔

ٹونی کو گود میں اٹھا کر بڑے لاڈ سے بولے۔ "ہمارا بیٹا ہم پر بھاری نہیں ہے۔ بچہ تو محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ دیکھنا تمھیں بھول کے بھی یاد نہیں کریگا۔"

دوسرے دن شمیم آفس سے لوٹا تو ثریا نے ہنس ہنس کر ساری رپورٹ سنا ڈالی۔

"آج میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئی تھی۔"

"کیا کیا وہاں جا کے؟" وہ لاپرواہی سے بولے۔

"ایسے ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر بچوں کے کچھ کپڑے سیئے۔ کچھ دیر کیرم کھیلا۔"

"ساری واہیات باتیں۔"

"ہونہہ۔ مردوں کو تو عورتوں کی ساری حرکتیں واہیات ہی نظر آتی ہیں۔ بھلا اور کیا کیا کرتے ہیں؟"

" اور انھوں نے پوچھا نہیں ٹونی کیوں نہ آیا "۔

" ارے واہ، پوچھتیں کیسے نہ پہلے تو جاتے ہی یہ سوال کیا کہ ٹونی صاحب کیوں تشریف نہیں لائے ؟" جب میں نے کہا کہ اُن کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری ان کے باپ نے سنبھال لی ہے۔ تو خوب ہی خوش ہوئیں۔ بلکہ وہ تو اب یہ ارادہ کر رہی ہیں کہ ببلو کو ڈسپنسری بھجوا دیا کریں۔ کیونکہ ان کے بچوں میں سب سے زیادہ نابکار یہ ببلو ہی ہے "۔

"ہاں ہاں۔" وہ جوتے کے بند کھولتے کھولتے لاپروائی سے ہنس کر بولے۔" اب ساری مائیں یہی طے کرلیں کہ میاؤں کے ساتھ بچوں کو بھی آفس بھیج دیا کریں "۔

تیسرے دن شمیم نے آتے ہی پوچھا۔" آج آپ کیا کرتی رہیں دن بھر ؟ "۔

" آج تو کوئی خاص کام تھا ہی نہیں۔ یوں ہی بیکار سی پڑی تھی۔ تو آپ کے لئے سوئیٹر کا ایک نیا ڈیزائن شروع کرلیا "۔

" کیوں ؟ " میاں طعن سے بولے۔" اب اتنی جلدی بیکاری کی نوبت بھی آگئی۔ پہلے تو یہ عالم تھا کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہ ملتی تھی "۔

" اب آدھا بار آپ نے سنبھال لیا ہے نا۔ اس لئے "۔ وہ ہنس کر بولی۔

" اچھا۔" وہ اسی لہجہ میں بولے۔" اب سوئیٹر بھی ختم ہو جائے گا تب کیا کروگی ؟ "۔

" تب کیا کروں گی ؟ " وہ حیرت سے بولی۔" ارے یہ بھی کوئی پوچھنے جیسی بات ہوئی۔ گھر میں زندگی کے ہزاروں بکھیڑے لگے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آتا ہے "۔

بیکاری میں اور کوئی کام تو تھا نہیں، دن دن بھر بنتا ہی بنتا تھا۔ سوئیٹر کوئی چار ہی دن میں پورا ہو گیا۔ ساتویں دن میاں آفس سے لوٹے تو ثریا بولی۔
"ہاں جی ـــ دن بھر میں کوئی چار چھ مرتبہ تو اس کا منہ دھلانا پڑتا تھا اب وہاں کون دھلاتا ہوگا؟"
"چپراسی ہے نا ـــ اس پر تو بڑے مزے سے ہل گیا ہے۔ بس یہ سمجھو دن بھر اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھ سے تو کوئی سروکار ہی نہیں۔"
"ہائے جی۔ تو آپ اسی کے بھروسے بچہ چھوڑ دیتے ہیں؟" شمیم نے حیرت سے ثریا کو دیکھا۔
"تو کیا ہوا؟ کھا تو نہ لے گا بچے کو۔ آخر وہ بھی بال بچوں والا آدمی ہے۔"
ثریا کچھ نہ بولی۔ ٹونی آنگن میں کھڑا گیند اچھال رہا تھا۔ گیند اچھلی تو وہ گیند کے پیچھے لپکتا ہوا آیا۔ گیند سیدھی ثریا کے قدموں میں جا رکی۔ بجائے اس کے کہ گیند لینے آتا وہیں سے ماں کو منہ چڑا کر بھاگ گیا۔ باپ فتحمندی سے بولے۔
"دیکھا اب تمہارے پاس تو پھٹکتا تک نہیں۔"
گیارہویں دن شمیم آفس سے لوٹا تو پیچھے گدی پر ٹونی نہ تھا۔ ثریا اس وقت پورچ میں آرام کرسی پر لیٹی بے دلی سے کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز سن کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ گدی خالی ہے۔ بے تابی سے بولی۔
"ارے ٹونی کو کہاں چھوڑ آئے؟"
سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ لاپروائی سے بولے۔ "کاظم صاحب کے گھر۔"
"وہ کیوں؟" وہ تیزی سے بولی۔
"ان کے بیٹے کی سالگرہ ہے آج۔"

"تو اکیلا ہی چھوڑ دیا؟"
"آخر ان کے بھی بچے ہیں۔ کیا پھینک دیں گے اٹھا کر؟"
"تو کم از کم کریم کو ہی بھیج دیجئے۔"
"مگر تمھیں اتنی کلپ کیوں ہو رہی ہے؟ اچھا ہے نا وہاں کھیل رہا ہوگا۔ یہاں تو چیخ چیخ کر اودھم مچا دیتا ہے۔ سر درد کرنے لگتا ہے کم بخت۔" اور انہوں نے چور نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ ثریا خاموش رہ گئی۔

دوسرے دن ٹونی میاں آئے تو انھیں گھر سے گئے تقریباً دو دن پورے ہو چکے تھے۔ میاں روزانہ دو چار جوڑے کپڑوں کے لئے جاتے تھے مگر اس دن ان کے کپڑے بھی ذرا میلے تھے۔ کیوں کہ کاظم صاحب کے ہاں سے واپسی پر ان کے کپڑے باپ کو لے جانے یاد ہی نہ رہے۔ اچھلتے پھاندتے وہ موٹر سائیکل سے اترے اور سیدھے اپنے کمرے کو دوڑ گئے۔

ثریا کی صورت سے جھلاہٹ ٹپک رہی تھی۔
"کیا بات ہے تم کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی ہو؟"
"میں؟ میں بھلا کیوں کھونے لگی؟" وہ جھلا کر بولی۔ "بھلی خاصی ہوں۔"
"کم از کم چہرے سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔"
وہ انھیں گھور کر چپ رہ گئی۔
"آج دن بھر کیا کیا کیا؟ وہ اسے ستانے کے انداز سے بولے۔
"جھک ماری۔!" وہ تیزی سے بولی۔
"بھلا جھک کیسے مارا کرتے ہیں؟ میں نے تو آج تک نہیں ماری۔"
تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

"میں آج ڈاکٹر کے ہاں گئی تھی۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کہتی کیا کہ اس ماہ کے ختم تک زچگی ہو جائے گی۔"

"مبارک ہو۔" شمیم صاحب ہنس کر بولے۔

"یہ مبارک سلامت کا کیا تک ہے؟ کیا پہلا بچہ ہو رہا ہے۔" وہ جھلا گئی۔

دھیرے سے شمیم صاحب بولے۔

"ڈاکٹرنی سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ میرے مزاج میں یہ تیزی کیوں آتی جا رہی ہے۔"

بالکل خلاف توقع وہ بولی۔ "پوچھا تھا!"

"ہائیں! پوچھا تھا؟" وہ اچھل کر بولے۔

"ہاں!"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کہہ رہی تھی عورت کو حمل کے زمانے میں خوش رہنا چاہیئے۔ مگر لگتا ہے تمھیں کوئی دکھ ہے جس کی وجہ سے تم جلی جلی رہتی ہو۔"

"پھر تم کیا بولیں؟"

ثریا پھر الجھ گئی۔

"میں کیا بولتی؟ میں نے کہہ دیا مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ بس خواہ مخواہ ہی ٹانک انجکشن گھونپ کر پیسے وصول کرنا تو ان لوگوں کا کام ہی ٹھیرا۔"

اگلے دن شمیم صاحب نے بیٹے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے اور جوتے کوٹ پہنا کر مزے سے اٹھا چلے۔ باسکٹ میں کپڑے کھلونے

اور کھانے کا الم غلم بھرا تھا۔ وہ اٹھا کر انہوں نے موٹر سائیکل پر رکھا۔ ٹونی کو بٹھایا۔ پیر مارا اور موٹر سائیکل گھرر گھرر کرتی چلنے ہی والی تھی کہ پورچ میں سے ثریا لپکی ہوئی آئی۔ جلدی سے سیڑھیاں پھلانگ کر وہ موٹر سائیکل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بڑے سے پیٹ کا وزن سنبھالنے سے وہ ہانپتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"کیا ہے ؟" شمیم صاحب حیرت سے بولے۔

وہ بلک اٹھی۔

" ہائے آپ کیسے شوہر ہیں کہ اپنی بیوی کے دل کی بات بھی نہیں جان سکتے۔ !"

شمیم صاحب اسی طرح دیکھ رہے تھے۔ کہ وہ پیچھے سے ٹونی کو اٹھا کر اپنی گود میں بھرتی ہوئی بولی۔

" کبھی آپ ایک ماں کا دل لے کر تو دیکھئے کہ سونا سونا آنگن کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔ !"

زہرِ عشق

باہر زور زور سے شہنائیاں بج رہی ہیں۔ باڑے کے ڈھیر چار بن بلائے ہی آ گئے ہیں۔ اور ڈفلیاں ٹھونک رہے ہیں۔ میرے آنگن میں ہرے ہرے پتوں اور رنگ برنگے پھولوں کی سجاوٹ اور مہکار ہے۔ رات بھر محلے کی عورتوں نے رت جگا کیا۔ جاگ جاگ کر تلن کیا۔ پکوان پکائے، نوشہ میاں کے لئے نہاری تیار کی۔ شادی کے ہنگامے اپنے شباب پر ہیں۔

اب سے ٹھیک بارہ گھنٹے بعد میرا عقد ہو جائے گا۔ وہ دولہا بن کر آئے گا۔ پھولوں اور سہروں سے اس کا منہ چھپا ہو گا۔ رشتوں کے بھائی بھتیجے اس کے گھوڑے کے آگے ڈنڈا اڑائیں گے۔ جب تک وہ دس پانچ روپے نیگ نہ دے اسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔ گھوڑے سے اتر کر وہ سجے سجائے چبوترے پر بیٹھ جائے گا۔ اور پھر دندناتے قدموں سے میرے پاس ماموں، چچا، پھوپھا آئیں گے۔

"بول بی بی تجھے اتنے اتنے مہر کے عوض فلاں فلاں دولہا پسند ہے؟ بول دے بیٹی۔ بول بھی دے۔"

میں نے طے کیا ہے فضول شرمانے اور رونے دھونے کی بجائے صاف صاف کہہ دوں گی۔

"نہیں۔ مجھے یہ شادی پسند نہیں ہے۔"

اس کے بعد جو گڑبڑ ہوگی۔ جو ہنگامے کھڑے ہوں گے اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ مگر میرے دل میں ڈر نہیں ہے۔ ایسی بے حیا لڑکی کو بعد میں کون قبولے گا۔ مجھے اس کا بھی خوف نہیں ہے۔ ہاں میں نے ہر طرح سوچ لیا ہے۔ میں وہی کروں گی جو میرے دل نے مجھے سمجھایا ہے۔

عقد کے لمحے قریب سے قریب تر آ رہے ہیں۔ باہر دیگیں کھڑکھڑا رہی ہیں؟ گوشت اور یخنی کی خوشبو سارے میں اڑ رہی ہے۔

"ابے اوئے سور کے جنے! سب کباب ہی میں امت بھسم کردے۔ تھوڑے گوشت کی یخنی بھی بنا۔" داراب خاں نے گوشت کے بڑے بڑے پارچے سینک پر چڑھائے، ان پر نمک چھڑکا اور دہکتے انگاروں میں گھسیڑ دیا۔

نیم کے درخت سے پرے گلاب خاں کی چیخ بھری آواز سنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا بھرمایا؟"

"کان پٹ سکا ہے سے ہو گئے؟"

دارے نے گندے سندے ہاتھوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"ابے حرام کا مال کھا کھا کے یوں چربی نہ چڑھا۔ سالے جنا جا اتنا بھاری ہو جائے گا کہ چار چھوڑ آٹھ آدمیوں سے بھی نہ اٹھے گا۔

"میں وصیت کر کے مروں گا کہ میرا جنازہ صرف دارا ہی اٹھائے گا۔ سالے خان اتنا کھلایا اور کس دن کام آئے گا؟"

"کھلائے کو کیا چاٹوں؟۔ گورے کسان کی لونڈیا پلا تو تب جانوں"

"ابے حرامی اور کتنی لونڈیاں پیئے گا؟۔ اب تو تیری ہڈیوں میں بھی دم نہیں رہا اور پینے کی ہوس باقی ہے"

دارے نے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے کہا۔ "ابے پودے کھان تونے

سُنا نہیں۔

عسک پہ جور نہیں، ہے یہ وہ آتس گالب
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

گلاب خاں ہا ہا کر کے زور سے ہنس پڑا۔ "سالے تجھے تو دن بھر میں چار چھ مرتبہ "عِسک" ہوتا ہے۔ ایک آدھ دن کھوپڑی پلپلی ہو جائے گی تب مزہ آئے گا۔" "یاروں کا ہاتھ کھلا ہے تب تک دارے کو کیا پھکر ہے۔ مولا تجھ ایسے سردار کو کائم رکھے!" دارے نے غلط کہا کہ "یاروں کا ہاتھ کھلا ہے۔" اصل میں ہم گاؤں والے غریب لوگ۔ ہم لوگوں کا ہاتھ تنگ ہے۔ اور اس تنگی کا براہ راست تعلق گلابے کے ہاتھ سے ہے۔ ابھی ابھی کی تو بات ہے کہ گلابے خاں محلے بھر میں پتنگ اڑاتا، بیر جھڑاتا اور نیموں تلے کدکڑے لگاتا پھرتا تھا۔ باپ نے مار مار کے بھرکس نکال دیا مگر اس کی ہڈی سیدھی نہ ہوئی۔ مندر کا بیل بنا پھرتا تھا۔ کام کا نہ دھام کا۔

ذمہ داری کا احساس انسان میں سمجھداری پیدا کر دیتا ہے۔ گلاب خاں کا باپ مرا تو یہ آپ ہی آپ رستوں پر آگیا۔ سنتے تھے بڈھا تین چار ہزار روپیہ نقد چھوڑ کر مرا ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا، لے دے کے گلابے ہی سارے کا مالک بنا۔ ہمیشہ کی طرح ان دنوں بھی گاؤں والوں پر مفلسی چھائی تھی۔ بابے رام کو پتہ چلا کہ گلابے کے پاس جمع ہے۔ ہاتھ پاؤں جوڑتا اس کی چوکھٹ پر جا کھڑا ہوا۔ اللہ ہی جانے تو جانے کہ اس وقت تک گلابے نے اپنی زندگی اور کاروبار کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ مگر بابے بھیا اس کی چوکھٹ پر گیا تو اس کے سیاہ چہرے پر سرخ جھلک موج مار گئی۔ خالص بنئیے پن سے بولا۔

"منہ اٹھائے چلے آرہے ہو، ہے کچھ گرہ میں بھی؟" بابے بھیا حیرت سے بولا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا چودھری۔"

"مطلب سمجھنے کو اور کیا دو چار گھوڑے لگتے ہیں؟ ابے کوئی زیور چھلا ہوگا۔ تو رکھ جا اور رقم لے جا۔ ورنہ جا زمیندار کے گھر"

بلائے بھیا آگے ہی زمیندار سے دھتکارا جا چکا تھا! اور تو کچھ تھا نہیں چھو بھابھی کے کانوں کی انتیاں تھیں، وہی رکھ کر ڈیڑھ سو روپے لے آیا۔

شکورے کے پاس کچھ تھا نہیں۔ گڑگڑانے پر بھاری سود سے دو سو لے آیا۔

اور دن ہی دن میں گلاب خاں اچھا خاصا ساہوکار بن گیا۔

اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ وہی بارہ گھنٹوں کی رات ایک بھوکے پر کیسے گذرتی ہے۔ یہ بارہ گھنٹے بارہ راتیں بن کر گزرتے ہیں۔ اور تن بھروں کے یہی بارہ گھنٹے عیش و کوش میں بارہ منٹ بن کر اڑ جاتے ہیں۔

وہی ماہ و سال ہمارے بھی سروں پر تنے ہوئے تھے جو گلاب خاں کے۔ مگر دنوں ہی دنوں میں وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اب تو اس کے سیاہ بالوں کے چمک دار تیل سے چپڑے پٹے کانوں پر جھک آئے تھے۔ ریشمی خانے دار تہبند۔ پیلی ریشم کا کرتا جس میں سونے کے چار چار بٹن لگے ہوتے۔ ہاتھ میں ریشم کی دستی۔ اونچی ناک کا چرھاواں جوتا۔ کانوں میں عطر کے پھوئے۔ مونچھیں اتنی بڑی بڑی کہ کانوں کی لوؤں کو چھولیں۔ ان میں اکڑے اکڑے بل پڑے ہوئے۔ اور سیدھے ہاتھ میں کلمے کی انگلی میں، چاندی کی یہ بڑی سی انگوٹھی۔ کہتا تھا "میں نے میرا دادا کے یہاں جاکر ان کے نام پر چڑھائی تھی۔"

اللہ پیسہ دیتا ہے تو اس کے خرچ کرنے کے ڈھنگ بھی سکھا دیتا ہے۔

چوری چھپے نہیں علی الاعلان چار لوگوں کے سامنے بیٹھ کر جوئے بازی ہوتی۔ ہارے تو کیا، اور جیتے تو کیا۔ بہر حال اپنی ہی چاندی تھی۔ باوا کے پاس ہر رات بیٹھک جمتی اور پورے گاؤں کی خبریں سنائی جاتیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ کچھ

پینے پلانے کا دھندا بھی شروع کر رکھا ہے ۔ اور راہ چلتی لڑکیوں کو آتے جاتے چھیڑتا رہتا ہے ۔ جھوٹ سچ تو اوپر والا ہی جانے مگر اس کی شرارت کے قصے دو چار بار بھی نے سُنے ۔

باوا جب مجھے اور بوا کو سبق پڑھایا کرتے تھے تو ایک بار انہوں نے ایک شعر سنایا تھا اور اس کا مطلب بتایا تھا ۔ اتنے دنوں کی بات ٹھیک سے کچھ یاد نہیں رہی ، مگر مطلب کچھ کچھ یوں سا تھا کہ " پیسہ خدا تو نہیں ہے مگر پھر بھی خدا ہے کہ ساری حاجتیں پوری کرتا ہے ۔ اور 'عیب' ڈھانکتا ہے "

میں تو اکثر سوچتی ہوں کہ کم از کم گلاب خاں کے ساتھ تو یہی کچھ ہوا ۔ پیسہ کیا کم بخت کے ہاتھ میں آیا کہ خدا رسول کو ۔ دوسرے کی عزت محبت کو ۔ سب کو بھول گیا ۔ باوا کہتے ۔

" حرامی پلے کے دل میں رحم اور شرافت کا تو نام نہیں شیر کا کلیجہ کھایا ہو گا "

مجھے یاد ہے ۔ مجھے کیا سبھی کو یاد ہو گا کہ چندو چاچا کے ساتھ اس نے کیا دھاندلی کی تھی ۔ بے چاروں کا ایک ہی کھیت تھا جس کو جوتنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ انسان کیلئے کھانا ضروری ہے ۔ وہ ہوا یوں تھا کہ زمیندار کا قرضہ بہت چڑھ گیا ۔ سر سے پاؤں تک لد گئے ۔ اس نے اس سال تک کی مہلت دی تھی ۔ کہ قرضہ ادا کر دیں ورنہ کھیت کے ساتھ ساتھ بیل کی جوڑی ، گھر اور گھر کے برتن باسن ، سبھی کچھ اٹھا کر لے جائیگا ۔ اور اب کے سے چاچا کو امید تھی کہ فصل خوب پکے گی ۔ انہوں نے کسی صورت رو دھو کر ، ہاتھ پاؤں جوڑ کر گلاب خاں سے دو سو روپے نکالے ۔

ادھر چاچا گھر پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ ادھر سے گلاب خاں کے لگے دوڑ گئے ۔ ایک نیا اور بے ہودہ دھندہ اس نے یہ شروع کیا تھا کہ لوگوں کے

گھر چوریاں کروا دیتا۔ اس طرح لوگ جھک مار کر پھر سے قرض لینے اسی کے در پر آتے، اور یوں دگنا سود اسے حاصل ہوتا۔ بادا کہتے "مولوی صاحب سچ ہی کہتے ہیں کہ گلاب خان کے لیے تو اللہ میاں کو خاص طور سے ایک الگ دوزخ بنانی پڑے گی، جس میں وہ اکیلا ہی جلایا جائے گا۔"

مگر چند و چچا دوبارہ اس کے پاس سے سود پر روپیہ حاصل کرنے کے لئے نہیں آئے۔ وہ راتوں رات جاں بحق ہو گئے تھے۔

پیسہ بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے سامنے کون منہ کھولتا ہے۔ (یوں پیٹھ پیچھے لاکھ گالیاں دے لو) گاؤں بھر کی لڑکیوں کو اس نے کنوئیں اور کھیتوں پر جانا دو بھر کر دیا۔ دیکھتے ہی بے ہودے پن سے ڈھولکے گانا شروع کر دیتا۔

"ہم تو وہی کھٹی میٹھی نارنگی کھائیں گے ری جو تو چوری چھپے لئے بھاگ رہی ہے۔"

"وہ شربت کیوں نہیں پلاتی جو دو گلابی قاشوں میں بھرا ہے؟ پیاسے پر رحم کر دی گوری۔"

ادھر مسجد کے سامنے والی پگڈنڈی سے ہو کر گزرنے کو جی کانپنے لگا تھا۔ مگر اس راستہ پر سے تو گزرنا ہی پڑتا تھا، کیونکہ کچی منڈیروں والی سڑک سے جو راستہ کھیتوں تک جاتا تھا اس میں اور اس مسجد والی پگڈنڈی میں برابر آدھوں آدھ کا فرق پڑ جاتا تھا۔ اس دن تو سمجھو میں مارے غصے کے اس پر چاقو ہی چلا دیتی۔ ہوا یہ کہ میں سر پر پوٹلی جمائے جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی کہ لفنگے پن سے ہنس کر بولا۔

"نورے کو مٹھو کی طرح چوری کھلاتی ہے، کبھی ادھر بھی تو رحم کرنا۔ ہم بھی تو آخر مٹھو ہی ہیں۔"

میرے جسم کا سارا خون میرے منہ پر آکر جم گیا۔ میں تیزی سے بولی۔

"حرامی پلے تیرے تن و تن کیڑے پڑیں۔ دوسروں کی لڑکیوں کو تاکتا پھرتا ہے۔ آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں تیری۔" ڈھٹائی سے بولا۔

میں سمجھ رہا تھا باپ نے دانتوں کو چراغ جلا جلا کر کچھ میٹھے بول سکھائے ہوں گے۔ تونے گالیاں ہی سیکھی ہیں۔ یہ ہے سید زادی کی شان۔"

"باپ کا نام بیچ میں مت لا گلا بے۔" میں چیخ کر بولی۔ "دیدے کھینچ لوں گی گڑھوں میں سے۔"

"باپ رے۔" وہ بناوٹی ڈر سے بولا۔ "بہت اونچے اونچے بول رہی ہے۔"

"ہاں ہاں تیرے باپ کا نہیں کھاتی کہ دھیرے دھیرے بولوں، لچے لفنگے تجھے تو بس گالیاں ہی دوں۔"

بے حیاؤں کو ہنسی کے سوا آتا ہی کیا ہے؟ میں دور تک چلی گئی پھر بھی اس کے کفن پھاڑ قہقہے میرے کانوں میں سوراخ کرتے رہے۔

نورے میرا لال لال چہرہ دیکھ کر بولا۔

"کیوں بی بی کیا بات ہے؟"

"نہیں کچھ تو نہیں۔" میں نہیں چاہتی تھی کہ اس منحوس کے ذکر سے اسے بھی رنجیدہ کر دوں۔

"اپنا والا نہیں سمجھتی نا، اسی لئے بتاتی بھی نہیں۔"

میں نے لگاوٹ سے اس کی اور گھور کر دیکھا۔ "میں نے کبھی کوئی بات چھپائی۔ وہی حرام زادہ راستے میں کھڑا ہو گیا تھا۔"

"اچھا؟" نورے نے آستین چڑھانی شروع کر دی۔

"ارے بس بس۔" میں گھبرا کر بولی۔ "تو نے کبھی اس کا ڈیل بھی دیکھا ہے۔ وہ تو اپنے سے تگنے کو ہتھیلی پہ بیر بہوٹی کی طرح بٹھائے سارے میں گھماتا پھرے۔ کہیں اس کے منہ نہ آنا۔"

"میں کون کم ہوں۔ اس کا جوڑی دار ہوں۔" نورے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"مگر اس ذلیل سے ڈرنا ہی چاہئے۔"

"اور جو وہ میری ......" نورے ذرا ہنس کر رک گیا۔ "بی بی کو کچھ کہے بھی تو سن لوں؟"

"تو کیوں سنے! میں نے اسے وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ یاد ہی کرتا پھرے گا کہ کبھی کسی سید زادی سے پالا پڑا تھا۔"

رحمت بوا کے رت جگے سے میں نے مالیدہ اٹھا کر رکھ لیا تھا۔ اب نورے کو کھاتا دیکھ کر مجھے کیسی خوشی ہو رہی تھی۔ پھنکے لگاتا ہوا بولا۔

"گھر والے پوچھیں گے کہاں گئی تھی تو ......"

میں ٹھنک کر بولی۔ "میں ایسی بے اعتباری نہیں ہوں۔ اماں باوا کو مجھ پہ بھروسہ ہے کہ میں اِدھر اُدھر جھانکنے والی نہیں۔"

نورے میرے قریب سرک آیا۔

"سچ بی بی تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔"

میں دور سرک گئی۔

"دیکھ نورے تو جانتا ہے میں تجھے دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تو اگر ساری دنیا میں کسی کو چاہتا ہے تو بس مجھے۔ مگر اتنے قریب نہ آ۔ محبت اور چیز ہے۔ اور یہ چھچھورا پن بالکل الگ بات ہے۔"

"کیوں؟ کیا میں پسند نہیں تجھے؟"

"ایسی بات نہ کر نورے۔ مجھے یاد ہے۔ تجھے بھی یاد ہو گا کہ پیلی حویلی والوں کی نسبت مجھے آئی تھی تو میں نے کیا طوفان مچا دیا تھا۔ بوا سے کہہ کر نسبت واپس پھیر دی تھی۔

اور حالانکہ وہ لوگ چھ کھیتوں کے مالک ہیں۔ پھر کیا میری عقل چرنے کو گئی تھی۔"

نورے احمق پن سے بولا۔" تو نے چار جماعتیں پاس کرلی ہیں۔ عربی پڑھتی ہے۔ سارے گاؤں میں بس سید بابا کے گھرانے کو ہی پڑھنا لکھنا آتا ہے۔ تجھے اس بات پر غرور تو نہیں ہوتا۔"

"اس میں غرور کی کیا بات ہوئی؟ یہ تو میرے لئے خوشی کا سودا ہے کہ تجھے بھی پڑھنا سکھا دوں گی۔ اور کیا چار جماعتیں پڑھ لینے سے انسان مغرور ہو جاتا ہے رے؟"

وہ نیچے سر جھکا کر ہنسنے لگا تو میں بولی۔

"یوں کر کہ یہ غرور وادا کا جھگڑا ہی مٹ جائے۔ باوا کے پاس آکر روز سبق لے لیا کر۔ انہوں نے تو اب یہی شروع کیا ہے کہ سب....."

وہ زور سے ہنس کر بات کاٹ کر بولا۔" ویسے تو اُردو پڑھنا لکھنا مجھے بھی آتا ہے، قرآن بھی میرا ختم ہو گیا ہے۔ مگر میں نے تیری طرح جماعتیں بیٹھ کر امتحان نہیں دیا۔ بس۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔ یوں طعنے دینا چھوڑ دے۔ مگر چاہے تو تو بھی امتحان پاس کرلے۔ شہر کے آئے دن تو پھیرے لگاتا ہے۔"

نورے چپ رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ذرا آزردہ ہو رہا ہے تو بات چلانے کو بولی۔

"نورے تجھے بس مجھی سے محبت ہے نا؟"

وہ ذرا دیر بعد آنکھیں اوپر اٹھا کر بولا۔" ایسی بات پوچھنے کا فائدہ؟"

"تو پھر اتنا سمجھ لے کہ محبت کرنے والے کبھی دور نہیں ہوتے۔"

میں جانتی تھی نورے کا دل بری طرح دھڑک پھڑک رہا ہے۔ کیونکہ میں ایک دو دن بعد نہیں پورے ڈھائی ماہ بعد اس سے ملنے کو آئی تھی۔ ہمارے گاؤں میں زیادہ تر مسلمان گھرانے ہی آباد ہیں۔ سب ایک دوسرے کو رشتوں سے پکارتے ہیں۔

سب ہی محبت، میل جول ہے۔ بعضوں میں زمینوں کے متعلق بہت سے جھگڑے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مگر اس سے دلوں میں میل کہاں آتا ہے۔! پردہ بھی خال خال ہی ہوتا ہے۔ کھیتوں میں بستیوں سے پرے پیپل کے نیچے، آموں کے نیچے، سنتروں کے کنج میں، کہیں نہ کہیں دو سائے کانپتے نظر آہی جائیں گے۔ لڑکیاں اپنے منگیتروں سے چھپ چھپ کر ملتی ہیں۔ اور لڑکے بیروں کی ڈالیوں میں چھپ چھپ کر بالیوں کا انتظار دیکھتے ہیں۔

گاؤں میں ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ کسی کی لگائی ٹوٹ جائے۔ پیار کا یہ بندھن جو کنوارپنے سے ہی مضبوط ہوتا ہے۔ شادی کے بعد تو اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی جھگڑے کا ڈر نہیں ہوتا۔ ڈر ہوتا ہے تو بس تھوڑا بہت بزرگوں کی آنکھوں کا، جو لگائی پکی ہو جانے پر بری طرح چوکس ہو جاتی ہیں۔

"یہ البیلی سر پر پوٹلی دھرے کھیتوں کو جاتے جاتے کہیں رک تو نہیں جاتی۔ ہاں بیچ میں بالم کا کھیت بھی تو پڑتا ہے۔!"

("کیا تم لوگوں کے دل کبھی پیار سے نہیں دھڑکے تھے؟")

مجھے یاد آیا رحمت بوا کے رت جگے میں بایان، نے میرے کان میں ہنسی ہنسی کہا تھا۔

"کب دلہنیاں بن کر پیا کا دیس آباد کرے گی؟۔ وہ بےچارہ تو فراق میں جنگلوں کی خاک چھان رہا ہے۔ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر راتوں رات جاگتا رہتا ہے سرحد کنارے"

نورے کو دیکھ دیکھ کر میرا چلوؤں خون بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں محبت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوگی؟۔

اس دن میں لوٹی تو خوشی سے منہ تمتما رہا تھا۔ سانولے گالوں پر تو یونہی خون جلدی جلدی جھلکیاں مارنے لگتا ہے۔ گلابے جیسا بے غیرت بھی شاید ہی کوئی رہا ہو۔ منہ موڑ کر ڈھولکا گانے لگا۔

"اس پتھریلی زمین پر تو تیرے نازک تلوے چھلنی ہو جائیں گے۔ تو ان آنکھوں پہ

قدم کیوں نہیں دھرتی جو میں نے تیری راہ میں بچھا رکھی ہیں ؟"

"بہت اچھے، بہت اچھے۔" میں طنز سے بولی۔ "آج کچھ زیادہ ہی چڑھا رکھی ہے کیا؟"

"جس نے ایسی آنکھوں کی چڑھا رکھی ہو......" ایسے کمینوں کے کون منہ لگے؟

میں نے کانوں پہ دوپٹہ لپیٹ لیا۔

میں اس کی دوکان کے سامنے سے گذرنے لگی تو بیہودے پن سے اپنی گدی دار چوکی سے اتر آیا اور بیچوں بیچ رک کر بڑی سنجیدگی اور آزردگی سے بولا۔

"بی بی میں سچ مچ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی؟" کالی مٹی کی مضبوط ہانڈی میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اس کے سر پہ دے ماری۔

"کلموہے! میں تو تیرے منہ پہ تھوکوں بھی ناں۔"

پاؤں پٹختی، غصے میں سنسناتی میں جلدی جلدی بھاگ کھڑی ہوئی۔

گلابے نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

پھر دن گذر گئے۔

گاؤں میں سائیں سائیں ہوائیں چلنی شروع ہو گئیں۔ نیم کے درختوں سے پیلی پیلی نمکولیاں جھڑتی تھیں۔ جنھیں بچے کڑوے کڑوے منہ بنا کر کھاتے اور ایک دوسرے پہ نشانہ باندھ کر اچھالتے۔ پتے سوکھ سوکھ کر گر رہے تھے۔ (بہار جھومتی ہوئی آئے گی۔) بوڑھوں کے بیٹھنے کے لئے اب کوئی جگہ نہ رہ گئی تھی اس لئے شام ڈھلے کھلے صحنوں میں یا گھروں سے باہر چارپائیاں بچھتیں، تخت لگتے اور باتیں ہوتیں۔ دل والے حقے بھرلاتے، ورنہ یونہی باتوں کا دور چلتا۔

وہیں ایک دن سفید مسجد کے مولوی صاحب دین کی باتیں بتا رہے تھے۔

انھوں نے ایک واقعہ بتایا کہ ایسے ہی ایک سود خوار تھا جس نے اپنا پیشہ ہی یہ بنا رکھا تھا کہ سود لیتا رہے۔ کہتے ہیں جب وہ مرا تو عجیب حادثہ پیش آیا۔ جب گورکن اس کے لئے قبر کھودنے لگا تو جہاں سے بھی پھاوڑا لگا کر مٹی اکھاڑی جاتی وہاں سے ان گنت سانپ اور بچھو نکلنے لگتے۔ ایسا کوئی چار چھ مرتبہ ہوا۔ لوگ بری طرح گھبرا گئے۔ اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ بھئی یہ کیا ماجرا ہے؟ پھر کسی نے بتایا کہ مرحوم سود بہت کھایا کرتے تھے اس کا بدلہ اللہ کے ہاں تو ملے گا ہی۔ یہاں دنیا میں بھی مل گیا۔

جانے کیوں اس دن گلابے بھی اس محفل میں آشریک ہوا تھا۔ سب تو سن رہ گئے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بیٹھا یونہی بیڑی پر بیڑی سلگاتا رہا اور ساروں پر دھوئیں کے بگولے چھوڑتا رہا۔

مگر مولوی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس واقعے کو سن کر گلابے بھی ذرا ساکت ہو گیا تھا اور یقین ہے کہ وہ اپنی راہ بدل دیگا۔

راہ تو وہ کیا بدلتا اور اوچھی حرکتیں کرنے لگا۔ اور اس دن تو سارا گاؤں اس پر تھوکنے لگا ہوتا گیا۔ رحیم خاں پھوپھا کی بیٹی برکت بوا کی شادی تھی۔ ہمارے گاؤں کا بھی عجیب حال ہے۔ چاہے کھانے کو پیسہ نہ ہو، فاقے ہو رہے ہوں، ننگے جسم سے رہتے ہوں۔ مگر جہاں شادی بیاہ کا مسئلہ آیا اور یہ لوگ بہہ نکلے۔ پھر نہ یہ دیکھیں گے کہ پیسہ کہاں سے آئے گا؟ نہ یہ سوچیں کہ ادائیگی کی کیا صورت نکلے گی؟ بس سمدھیانے میں نام اونچا رہے، ورنہ براتی کیا منہ پر تھوکیں گے۔

زمین پھوپھی کے پاس نہ تو اتنے زیور ہی تھے کہ گہن رکھ کر پیسہ جمع کرتیں، نہ گھر میں سونے چاندی کے برتنوں کی اونچی ڈھیک ہی تھی کہ توڑ جوڑ کر کے بیچ باچ کر کام

چلالیتیں۔ اور برکت بوا کی شادی تو ہونی ہی تھی۔

رحیم خاں پھوپھا گلابے کے پاس گئے۔ مگر اب کی سی انہوں نے سود پر نہیں بلکہ بطور قرضِ حسنہ کچھ روپوں کا مطالبہ کیا۔

پھر اس کے بعد کی کارروائی کسی کو نہیں معلوم۔ ہوا اتنا ہی کہ کچھ ہی روز بعد برکت بوا کی لاش مسجد والے کنوئیں میں تیرتی ملی۔ اور پھر کچھ ہی روز بعد یہ بات بھی پھوٹ گئی کہ گلابے نے کہا کہ "قرض تو میں بغیر سود کے دیئے دیتا ہوں، مگر ہاں۔ مجھے اپنے دوستوں کا بڑا خیال رہتا ہے۔"

دارا گلابے کا یارِ غار تھا۔ اور تیری میری لڑکیوں کو تاکتا پھرتا تھا۔ برکت بوا پر اس کی بہت دنوں سے نگاہ تھی۔

بھلا رحیم خاں پھوپھا کہاں پیسہ ادھار لینے چلے تھے۔ جب وہ ان صورتوں میں ملنے والا تھا۔ مگر برکت بوا کے کان تو پٹ نہیں تھے۔ چار لوگوں کی زبان پر جب کھلم کھلا ایسی بات پھرے تو کون جی گردے والا زندہ رہنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ چلو باپ کو فکروں سے نجات دلا دی۔ اور کہاں تو دلہن بننے میں ہزاروں کا حساب پڑتا تھا کہ اب مٹھی بھر پھولوں میں سہاگ چڑھ گیا۔

گلاب خاں کے مرنے کی ہزاروں لوگ دعائیں مانگتے ہوں گے۔ مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ اسے جا کر ٹھکانے لگا دیتا۔ اس کا اپنا اتنا لمبا چوڑا حلقہ تھا کہ کسی کو اس کے خلاف چوں کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

زمیندارن کے بیٹے کے ختنے تھے۔ گاؤں کی تمام لڑکیوں کو زمیندارن نے رت جگے کی دعوت دی تھی۔ اس دن اماں کی طبیعت سنبھلی تو میری جان کو آنے لگیں۔

"جا تو بھی چلی جا۔"

اب لاکھ لاکھ کہتی ہوں کہ " نہ میں نہ جاؤں گی۔ ماں تو گھر میں بیمار پڑی رہے اور بیٹی رت جگے منائے۔ مجھ سے نہ ہوگا ایسا۔ کیا نہ جاؤنگی تو گناہ ہو جائے گا ؟"

بولیں۔ " نہ بٹیا بڑے لوگوں سے بگاڑ کرنا اچھا نہ ہوگا۔ وہ فردو پوچھیں گے کہ سب تو آئیں، بی بی کیوں نہ آئی ؟"۔ یقین کون کرے گا کہ میرا جی برا تھا۔ جا ابھی ابھی جا۔ ابھی تو چراغ بھی نہیں جلے ہیں۔"

میں اماں کے کہنے پر جی نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہرے پتوں والا کرتا شلوار پہن، ہری ہی جالی کا دوپٹہ اوڑھا اور کاجل لگا کر دروازے سے باہر آ گئی نکل۔ آنگن میں موگرے کے پھولوں کے پودے تھے۔ ایک ٹہنی پر ایک ساتھ چار چھ پھوں کا گچھا مہک رہا تھا۔ اسے توڑ کر کان کے پاس اڑس لیا۔ الماری کے آئینے میں اپنا منہ دیکھا تو لاج سی آ گئی۔ یہ ہرا ہرا جوڑا پہن چوتھی کی دلہن بن، میں کہاں چلی تھی ؟۔" کاش ایسے میں نورے تجھے دیکھ لیتا۔" دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔

چلتے چلتے جب مسجد کے سامنے پہنچی تو گلابے مونچھوں پر تاؤ دیتا بیٹھا تھا۔ اس دن کے بعد سے گلابے نے کبھی مجھ پر ڈھولکے نہیں گائے تھے۔ اور نہ کبھی شرارت ہی کی تھی۔ مگر اس دن جانے کیا بات تھی، اندھیرا دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی یا یونہی کمینگی سر پر سوار تھی۔ کہ ہنسنے لگا۔

" اوہو۔ ہو ہو ہو۔ کیا بہار ہے۔"

میں جلدی جلدی چلنے لگی تو ڈھٹائی سے بولا۔

" اس دن تو بڑی تیزی دکھائی۔ آئیں ؟"

عورت کی خاموشی مرد کو بہادر بنا دیتی ہے۔ میں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسے سبھاؤ میں، جیسے میں اسے کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ تیزی سے بولی۔

"آج بھی دکھا سکتی ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے کمینہ؟"

"تیرا ہونے والا دولہا"، اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

میں نے پاس پڑی اینٹ اٹھائی اور اس کے سر پر پھینک کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

"اچھا اچھا ـــــ کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا" پیچھے سے گلابے چلّا کر بولا۔

یوں بھاگنے کو تو میں بھاگ گئی، مگر میرا دل بری طرح کانپ اٹھا۔ آج تک گلابے نے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی۔ یہ تو گاؤں کا معاملہ ہے جہاں سرِ شام آسمان جھونپڑوں پر جھک آتا ہے۔ تاریکی پھیل جاتی ہے۔ اکیلے دکیلے ہزاروں بار ہزاروں ہی جگہ آنا جانا رہتا ہے۔ اپنے جانے پہچانے راستوں پر بھلا کون ہمیشہ ہی کسی کا ساتھ ڈھونڈتا ہے؟ کام پڑا اور چل نکلے۔ اب تو کہیں اکیلے جاتے بھی ڈر لگے گا۔ کس ڈھٹائی سے اس نے کہا تھا۔

"اچھا اچھا ـــ کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا"

میں نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ یا ایسے ہی بہت کام آ پڑ جاتا تو کسی نہ کسی کا ساتھ ڈھونڈھ لیتی۔ اب تک میں گلابے کی جوتوں اور پتھروں سے مرمت کرتی آئی تھی۔ مگر اس نے ایسا ڈرا دیا تھا کہ میری ساری بہادری رستہ بھول گئی۔ آخر کو لڑکی کی ذات تھی نا! اب میں جلد سے جلد چاہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ مرد کا سہارا بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ یوں باپ بھی مرد ہوتا ہے اور شوہر بھی، مگر ان میں بھی بڑا فرق ہے؟ وقت پڑنے پر شوہر آستین چڑھا لیتا ہے چاہے اس میں اس کی جان ہی چلی جائے۔ باپ صرف پگڑی میں منہ ہی چھپا سکتا ہے۔ بیٹی کی بدنامی کا سہن بڑا کٹھن ہے۔

یوں گلابے پکّا غنڈہ تھا۔ مگر پھر بھی اس کی ہمت نہ پڑتی کہ کسی کی بیاہتا کو یوں سرِ راہ چھیڑے۔ مگر شادی میں تو ابھی دن باقی تھے۔ اگر میری شادی ہو جاتی تو اماں کی دیکھ بھال کرنے والا کون رہ جاتا۔ وہ تو اب تب ہو رہی تھیں۔ یوں دیکھا جائے تو

کون ماں باپ محض اس لئے بیٹیوں کو سنبھال رکھتے ہیں کہ ان سے تیمارداری کرواتے پھریں۔ اصل رکاوٹ تو روپے کی تھی۔ بس اپنا بھرم قائم رکھنے کو بیماری کا بہانہ عام کر رکھا تھا۔ باوا اس انتظار میں تھے کہ اب کی فصل اٹھے تو میرے گجرے کھلیں ادھر ادھر سے قرض مل سکتا تھا۔ مگر قرض کے نام پر باوا لاحول پڑھتے تھے۔

گھر میں پڑے پڑے مجھے بس اتنا ہی کام تھا کہ نورے کے بارے میں سوچتی رہوں اور یوں ہی خود ارادہ کر کے تھوڑی ہی سوچنے کو بیٹھتی تھی۔ وہ تو خیالات ہی آپی آپ چلے آتے تھے۔ اپنے گھر بار اپنی زندگی، اپنے بچوں کی کسے تمنا اور آرزو نہیں ہوتی؟ میں بھی ایک عورت ہوں۔ میرے بھی وہی احساسات اور جذبات ہیں۔ جو دنیا کی اور ساری محبت کرنے والی عورتوں کے ہیں۔ دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہتی تھی۔ نورے کو یوں خوش رکھوں گی؟ بچوں کے یہ نام رکھوں گی۔ میں سوچتی تھی پہلی بار بیٹی ہوئی تو ہاجرہ نام رکھوں گی۔ پھر سوچتی تھی۔ اور بیٹا ہوا تو؟ بیٹا ہوا تو یہ حق نورے کو پہنچے گا کہ اپنے بیٹے کا جو نام چاہے رکھے۔ میں کون باپ بیٹوں کے بیچ میں دخل دینے والی؟ ہاں بیٹیاں میرے ہاتھوں پلیں گی، بڑھیں گی۔ ان پر میرا حق ہو گا۔

کئی ہفتے بیت گئے تھے کہ نورے کی صورت دیکھنے کو نہ ملی تھی۔ رہ رہ کے یاد ستاتی تھی، پر وہ رہتا بھی کتنی دور تھا۔ گاؤں کے کونے پر ان لوگوں کی کھیتی باڑی تھی۔ کون جاتا؟ سکینہ کے ہاتھ سوکھا پھول بھیجے بھی مدت ہو گئی تھی۔ سوکھے پھول کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ "تیری جدائی میں دیکھ یہ دل یوں کمہلا کر رہ گیا ہے۔" پھر کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی عمل میں آ ہی جاتی۔ مگر نور لخاموش تھا۔ کیا اسے میری یاد نہیں آتی؟

ایک دن سہ پہر کو میں گیہوں پھٹکتی بیٹھی تھی کہ سکینہ چوری چوری گھر میں آئی۔

پہلے تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر ایک گولی سی میرے آگے پھینک دی۔

پریم پتر ــــ دل دھڑک اٹھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے وہ گولی اٹھائی۔

"آج آدھے کا چاند ہے۔ بہت زوردار چاندنی بھی نہ ہو گی۔ ملگجے اجالے میں نمبردار کے پیپل تلے آجانا۔ ہاں عشا کی اذان کے وقت ــــ نورے۔"

میں نے سکینہ کو سر سے اشارہ کر دیا۔ "ہاں۔" وہ الٹے پیروں بھاگ گئی۔

جب نمازی مسجد میں جمع ہو گئے تو میں پیپل تلے تھی۔ ریشمی تہبند، ریشمی کرتا! سر پہ تیل چپڑا ہوا۔ بل کھاتی ہوئی مونچھیں۔ جس کا اتنا تنومند شوہر ہو اسے کاہے کا ڈر؟

نورے نے شرارت اور بے صبری سے مجھے کھینچنا چاہا۔ مگر میں دور سرک گئی۔ "میں تجھ سے لاکھ بار کہہ چکی ہوں یہ سب دھندا شادی سے پہلے نہیں چلے گا۔"

نورے ہنسنے لگا۔ "دو چار دن میں پرانی کپاس کے گاڑے لے کر شہر جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں وہاں سے کب لوٹوں۔" اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔

"کل بھی آؤ گے یہیں؟" میں ذرا آزردہ ہو کر بولی۔

"تو آجانا، میں بھی کوشش کر کے آجاؤں گا۔"

پیپل کے پتوں میں چاند لپ جھپ کر رہا تھا۔ رکی رکی سی ہوا تھی۔ ایک بدلی نے چاند کو ڈھانپ دیا۔ میں نے غم سے بھری آواز میں کہا۔ نورے!"

نورے کچھ نہ بولا۔

چاند پھر چمک رہا تھا۔ پتے سرسرا رہے تھے۔ جذبات سے بھری آواز میں نورے بولا۔

"بی بی!"

بی بی کچھ نہ بولی۔

(ہم دونوں ایک دوسرے کو کس بری طرح چاہتے ہیں خدایا) میں نے جھک کر نورے کو دیکھا۔ ذرا آزردہ نظر آرہا تھا۔

"تو اس لئے اداس ہوگیا کہ میں نے تجھے پیار کرنے کی اجازت نہیں دی"

وہ کچھ نہ بولا۔

"میں تیری ہوں نورے، صرف تیری ہوں۔" میں پاگل بن کر بول رہی تھی۔ "اور تو بھی میرا ہے، صرف میرا ہے۔ میں محبت کرنا اور کروانا چاہتی ہوں۔ اگر میں تجھ سے محبت نہ کروں تو تو مجھے جو چاہے سزا دے لے۔ اور اگر تو میری طرف سے منہ موڑے تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔"

نورے نے مجھے دیکھا تو میں ہنس رہی تھی۔ "ہاں نورے عورت محبت کے معاملے میں بڑی پاگل ہوتی ہے۔ تو میرا ہی نا؟"

"تو میری ہی ہے نا؟" بے صبرا میری طرف ہنستے ہوئے لپک رہا تھا۔ مگر میں بھاگ کھڑی ہوئی۔

دوسرے دن۔

باوا گھر سے نماز کو نکلے اور میں پیا ملن کو۔ جانے کدھر سے گھرے گھرے بادل امڈ آئے تھے کہ چاند چھپ گیا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" میں نے دل ہی میں سوچا۔ "آج یہ چوڑیاں اتنی زور زور سے کیوں چھنک رہی ہیں؟" میں نے اردگرد دوپٹہ لپیٹ لیا۔ "اف دو دن بعد نورے چلا جائے گا۔ پھر محبت کہاں جائے گی؟ وہ تو دل ہی میں رہتی ہے۔" مالیدے کی پوٹلی میں نے سینے سے لگالی۔ "نورے کو مالیدہ کتنا پسند ہے!" (اور تو کتنی پسند ہے!)

میرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ نورے وہاں موجود تھا۔ پیچھے سے جاکر

میں نے بڑی محبت سے کہا۔

"نورے تیری بی بی آگئی۔"

شاید کچھ سوچتا بیٹھا تھا کہ پہلے تو چونک گیا۔ پھر ذرا بھاری سی آواز سے بولا۔

"آگئی بی بی!"

"ہاں تجھ سے وعدہ جو تھا۔ مگر تیری آواز بھاری کیوں ہے؟ کیا روتا رہا ہے؟ محض اتنی سی بات کے لئے کہ آٹھ روز کے لیے باہر جانا ہے؟ رونا مجھے چاہیئے کہ تجھے؟ رونا تو عورتوں کو سہاتا ہے۔"

میں تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دھیمی دھیمی ہنسی ہنستا رہا۔ پھر اجنبی لہجہ میں بولا۔

"تجھے میری محبت آتی ہے؟"

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔

"سچ بول۔ ہنسکر بات مت ٹال۔"

"روز وہی بات دہراتا ہے۔ لے سن! تیری محبت آتی ہے۔ بہت آتی ہے۔ اتنی کہ تو چاہے تو میں اپنی آنکھیں تک تیرے کہنے پر پھوڑ ڈالوں۔ تو کہے تو اپنا گوشت تک تیرے لئے کاٹ کر پکا دوں۔"

"تیری محبت سانچی ہے؟"

"بالکل!"

"اور تجھے یقین ہے کہ میں بھی تجھ سے اسی طرح محبت کرتا ہوں۔"

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے جیسی بات ہوئی؟"

"اور اگر میں یہ سناؤں کہ مجھے تجھ سے محبت نہیں، جپ کھیل کھیل رہا ہوں تو؟"

"تو میں کہوں گی تورا مذاق کی جون میں ہے۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں ابھی چھما رنڈی کے ہاں سے آرہا ہوں تو؟"

میں ایک لمحے کو رکی۔ "تو اتنا نیچ نہیں ہو سکتا۔"

"پھر بھی یہ سوچ لے کہ اگر میں نیچ ہی ہوں۔ تو؟"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں مضبوطی سے بولی۔

"اور جو ہو گیا تو؟"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ سانچی محبت کرتے ہیں وہ اپنی محبوبہ کے سوا کسی کو دیکھتے بھی نہیں۔ اور تو نے آج تک سوائے اپنی بی بی کے اور کسی کو نہیں چاہا۔"

میں تنے سے نکل کر آگے بڑھی۔ پتوں میں چاند ہلا اور تورے کی آواز بدل گئی۔

"محبت کے بارے میں تیرا یہی خیال ہے تو یہ سمجھ لے کہ مجھے تجھ سے سانچی محبت ہے؟۔ کیونکہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو چھیڑا ضرور ہے مگر انگلی کسی کو نہیں لگائی۔ میں تو بس تجھی کو چاہتا ہوں۔"

"گلابے۔" سناٹے میں میری آواز دور تک بہتی چلی گئی۔ اور مالیٹہ بکھر گیا۔

"اچھا اچھا، کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔" ایک ناگ پھن پھن کرتا کہیں سے نکلا اور میرے انگ انگ کو ڈس گیا۔

میری آنکھیں پھیل کر گلابے پر جم گئیں۔

"میں تو یونہی پیپل تلے چلا آیا کرتا تھا۔ آج، یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں بی بی بھی مل جائے گی۔" وہ بھاری سی آواز میں ہنسا۔ "اور تو جو اتنی محبت والی ہے تو میری آواز کا فرق بھی نہ جان سکی۔ ڈیل ڈول تو خیر ہم دونوں کے ملتے ہی ہیں۔"

میری آنکھیں اسی طرح پھٹی رہیں۔

گلاب بے آزردہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ اکدم اس نے لپک کر مجھے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بہت دور پر اس نے مجھے دھیرے سے اتار کر کھڑا کر دیا۔ جانو میں پھول تھی۔ کہ ذرا سے دھکے سے پنکھڑی پنکھڑی ہو جاتی۔

"تو نورے سے محبت کرتی ہے نا بی بی ؟"

میری آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول گئی تھیں۔ میں اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔ وہ ذرا بھاری اور ڈوبتی آواز سے بولا۔

"تو نورے سے محبت کرتی ہے، اور میں محبت کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو یہ نہ سمجھ بی بی کہ میں تیرے ہونٹ چوم لوں گا۔ یا تیری عزت لوٹ لوں گا۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ تجھے تیرا یار مل جائے۔ تجھے بہت سی خوشیاں مل جائیں۔ سانچی محبت کرنے والے کہیں اپنوں کا برا چاہا کرتے ہیں بی بی۔ مگر۔ مگر بی بی تیرا دل چاہے تو اس جھونپڑی میں جھانک کر دیکھ لے۔ تو نے ابھی پیپل تلے کہا تھا نا کہ جو لوگ سانچی محبت کرتے ہیں وہ اپنی محبوبہ کے سوا کسی کو دیکھتے تک نہیں!"

بڑی دیر کے بعد وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولا۔ "میں نے تو آج تک کبھی خدا کو بھی سجدہ نہیں کیا، مگر دل چاہتا ہے کہ آج تجھے سجدہ کروں بی بی۔ تو اپنی محبت میں کتنی اٹل اور کتنی اونچی ہے۔" اس نے اپنا بھاری بھرکم وجود میرے سامنے جھکا دیا۔

"بول بیٹی تجھے اتنے اتنے مہر کے عوض نور خاں پسند ہے۔"

میں نے طے کیا ہے رونے دھونے اور شرمانے کی بجائے

صاف کہہ دوں گی۔

"نہیں۔ مجھے یہ شادی پسند نہیں"

اس کے بعد جو گڑبڑ ہوگی۔ جو ہنگامے ہوں گے میں ان سے بخوبی واقف ہوں۔ مگر میرے دل میں ڈر نہیں ہے۔ ایسی بے حیا لڑکی کو بعد میں کون قبولے گا؟۔ مجھے اس کا بھی خوف نہیں ہے۔

ہاں میں نے ہر طرح سے سوچ لیا ہے کہ میں وہی کروں گی جو میرے دل نے مجھے سمجھایا ہے۔

میں گلاب سے بیاہ کر رہی ہوں۔

آگ میں پھول

بات صرف اتنی تھی کہ طاہر میاں نے حویلی کے کسی کونے کھدرے میں نہاتے میں شبو کی پیٹھ دیکھ لی تھی اور روایتی شہزادوں کی طرح ایک چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ برقرار تھی کہ طاہر میاں کی تو بچپن ہی سے ٹھیکرے کی منگنی طے پا چکی تھی۔ اب اس کا کیا ذکر کہ طاہر میاں تو ولایت پلٹ ڈاکٹر تھے اور ان کی ہونے والی دلہن بیچاری خیر سے الف سے اللہ اور ب سے بکری تک بھی نہ جانتی تھی۔ اور جانتی بھی کیسے بیچاری؟۔ اس خاندان میں پڑھنے لکھنے کا سودا ابھی کس کے سر میں تھا۔ وہ تو کہو طاہر میاں کی ماں ایسی تھیں جو غیر خاندان سے بیاہ کر لائی گئی تھیں اور کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ ویسے اس خاندان کا دستور تو یہ تھا کہ تھوڑا بہت بیٹوں کو پڑھا دیا جاتا۔ اور آجا کے ساری جہالت ماؤں اور بیٹیوں کے حصے میں رہ جاتی تھی۔ طاہر میاں کی اماں دوسرے کٹم کی تھیں۔ اگر ہاتھ بھر لمبی کوئی ڈگری ساتھ نہ تھی تو یہ بھی نہ تھا کہ تار گھر والا حویلی پر کھڑا رہے اور وہ انگریزی کے دو جملے تک نہ پڑھ سکیں۔ اور اس دن تو پوری حویلی میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ جب گاؤں سے تار آیا۔ اتفاق کی بات ہی سمجھو اسے، پورا مردانہ محرم کے علم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ یہ بیچاری دردوں سے بے حال پڑی تھیں۔ تار والے نے آواز دی۔ انہوں نے دستخط کر کے تار لیا اور پڑھا۔

سسر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے ان کے۔ وہاں کو دوڑا یا گیا اور سب یوں ہی بھاگتے دوڑتے چلے آئے۔ نندوں نے طعنہ دیا۔ ساس نے اپنا ساس پن دکھایا۔

"اے دُو بول پڑھنے کیا آگئے موئے، الٹا سیدھا جو منہ میں آیا بک دیا۔"
بیچاری منہ سے تو کیا بولتیں، ہاں تار پکڑ کر ماموں میاں کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

اور پھر طاہر میاں کی اماں کہ خاندان بھر میں رونق دلہن کے نام سے باجتی تھیں۔ تھیں بھی واقعی رونق دلہن ــــ خاندان کا نام انہی کی اولاد سے روشن ہوتا تھا۔ لاکھ سر پٹخا پٹخنے والوں نے، مگر انہوں نے طاہر میاں کو بسم اللہ کہہ کر داخل مکتب کر ہی دیا۔ تعلیم کی خوبو خود میں تھی۔ بھلا اولاد کو کیسے نہ پڑھاتیں؟ رونق دلہن کی ساس تو ان پر خوب بگڑی تھیں ایک بار۔ لکھنا پڑھنا تو انھیں آتا ہی تھا۔ دنیا زمانے کے اخبار و رسائل بھی نظر سے گذرتے تھے۔ اپنے میکہ سے ایک خط بڑا ادبی قسم کا اپنی نند نور جہاں بیگم کے نام لکھا۔

"میرے لئے پیغام شرمندگی۔ وہ تمہارا ننھا منا بھتیجا۔ جاوید میاں روز مجھ سے فرمائش کرتا تھا۔ چندا ماموں لا دو۔ میں کر موں جلی کب اس کی خواہش پوری کر سکی۔ اسے تو مجھے نیچا دکھانا تھا۔ خود ہی چندا ماموں کو پکڑنے چل دیا۔"

گیارہویں شریف میں اسے چار ماہ اوپر چار سال کا ہونا تھا۔ دادی نے بڑے ارمانوں سے بسم اللہ پڑھانے کا جتن کر رکھا تھا۔ ریشمی جوڑا سلوایا۔ گھوڑے کا پورا گہنا بنوایا اور تمام پوتوں کے ساتھ وہاں پہنچیں تو جاوید میاں یہاں دیکھتے ہیں نہ وہاں۔

"اے دلہن! دلہنوں کی طرح مائیوں بٹھا دیا کیا تم نے میرے جدن میاں کو۔" دادی نے لاڈ سے پوچھا۔

آنکھوں میں آنسو بھر کر رونق دلہن بولیں۔

"ادّی، آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا جس میں میں نے اپنے پیارے کی موت کی خبر دی تھی آپ کو۔"

اسی ماں کے خون کا اثر بھلا طاہر میاں میں نہ آتا تو کس میں آتا؟"

یہ اتنی بڑی ساری حویلی، خاندان بھر کے لوگ اسی میں گھسے پلے پڑتے تھے۔ چھوکرے چھوکریوں کا وہ ہجوم کہ کوئی اجنبی جو آئے تو صاف یہی کہدے کہ شادی رچی ہے یا پھر محرم کے علم اٹھنے والے ہیں۔ اور ایسے میں پڑھائی تو کیا خاک دھول ہوتی کہ اس کا دستور بھی نہ تھا، مگر یہ طاہر میاں کے کہ اپنی ہی الاپے جاتے یا جھٹ سویرے چار پہر۔ دوپہر جب دیکھو تب یہ پورا قافلہ ہلڑ مچانے میں جتا رہتا۔ اور آپ چار پلنگ ادھر ادھر کھڑے کر کے ایک کمرہ سا بنا لیتے پھر دادا باوا کے کمرے سے دھیرے دھیرے کھسکاتے ہوئے ایک کرسی اور نانا میاں کی ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی اور پھر ادھر ادھر کا الم غلم — بس اسکول تیار ہو جاتا اور پڑھنا پڑھانا شروع۔ اسی پر بس نہ تھا۔ پھر خالی وقتوں میں یہ نیم کی نبانیوں پر روئی کے پھائے لپیٹ لپیٹ کر ایک ایک کے بازوؤں میں انجکشن گھونپتے پھرتے۔ آنگن کی لال کھریا مٹی کھرچ کھرچ کر اس کی گولیاں بناتے اور دردِ سر اور بخار کے لئے بانٹتے۔

کہنے والے کہتے ہی ہیں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ادھر طاہر میاں نے ایک دو کر کے سارے نچلے درجے پاس کر لئے اور کھٹاک سے ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ مقصد تو وہی انجکشن گھونپنا اور گولیاں بانٹنا تھا۔ ادھر اٹھتی جوانی کا زور اور ارادوں میں قوت کہ زمیں میں ٹھوکر بھی ماری تو پانی نکال چھوڑا۔ اور پھر رونق دلہن جیسی ماں کی تربیت!۔

خاندان کے بڑوں نے کہا بھی۔ "اے یہ کیا راہ نکالی ہے بی۔ موئی یہ جانُو کون دن کے لئے ہے آخر؟"

مگر سننے والوں نے تو اس کان سنا، اس کان اڑا دیا۔ اور بیچاری رونق دلہن، کہ تعلیم یافتہ ہونے کے کارن خود ہی بدنام تھیں۔ اور بھی جھنڈے پر چڑھ گئیں کہ جیسی خود تھیں ویسے ہی اولاد کو بھی اٹھایا۔

اور رونق دلہن بیچاری کے نام کی ناموسی اب تنبیہ کی بھی نہ تھی۔ ویسے ان کا بس چلتا تو جانے کیا کیا کر ڈالتیں، مگر ان حویلی والوں نے تو کبھی ان کی سیدھے منہ بات نہ سنی۔ طاہر میاں یہی کوئی چار چھ برس کے ہوں گے کہ بڑی نند شمس النساء کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اور بیٹی بھی ایسی کہ ناک کا ٹھکانا نہ آنکھ کا پتہ۔ اور پھر ادھر طاہر میاں تھے کہ اندھیرے اجالے کھڑا کر دو تو گھر سارا جگمگا اٹھے۔ دو گال گویا دمکتے چاند سورج تھے۔ کیا جوڑ لگانے بیٹھے تھے لگانے والے بھی۔ باپ تو پھر بھی دلہن کا کہا مان جاتے۔ مگر ساس سسر نے اپنی ہی کر کے چھوڑی۔ اب رونق دلہن سے بہ صد اصرار کہا جا رہا ہے۔

"اے نند کی بیٹی مانگو رونق دلہن۔ یہی تو دن ہوتے ہیں کہ اپنے والوں کو سمیٹا جاتا ہے۔" رونق دلہن نے نند کی بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر طاہر میاں کی طرف۔ بولیں۔

"اماں جان! آپ بھی غضب ہی کرتی ہیں بس! بھلا یہ بھی کوئی جوڑ ہوا!"۔ دلہن تو مان بھی جاتیں صورت شکل اللہ کی دی ہوئی ہے۔ مگر جانتی تھیں کہ تعلیم کے نام سے کوری ہی رہیگی لڑکی۔ بس زبان ہلانا غضب ہو گیا۔ لے لو، اماں جان نے تو پاس پڑی سلیم شاہی جوتی اٹھائی اور وہ جوتے مارے ہیں اپنے آپ کو کہ دلہن بیچاری ڈر سے کانپ گئیں۔ بھلا انھوں نے کاہے کو دیکھے ہونگے ایسے تماشے! اور پھر اماں جان نے کوسنوں کی بوچھار شروع کر دی اپنے بیٹا پوتوں پر۔

"ارے تو ہاتھ بھر کا ہوتا تو چلا جاتا۔ گز بھر کی کفنی ہی کافی ہوتی۔ یہ دن کیوں دیکھتی کہ میرے ہوتے۔ میرے جیتے جی نات کا بیل بنا پھر رہا ہے۔"

اور اللہ گواہ ہے روتی دلہن نے کبھی بھولے بھی ڈرا سہما کر اپنے میاں سے کوئی بات منوائی ہو۔ وہ تو آپ چھوئی موئی تھیں، جو میاں نے کہہ دی وہی سن لی۔ ہاں ایک برائی لاکھوں کی تھی کہ کتاب پڑھنا آتا تھا۔ اور قلم چلانا بھی۔ اور اسی مارے تو پورے خاندان میں تھو تھو تھی کہ "اے زمانہ تو دیکھو کیا آن لگا ہے۔ وہ حویلی والے جعفر میاں کی بہو کا ڈھنگ دیکھا؟۔ تحریریں بھیجتی ہے اپنے میکے والوں کو۔ غیر کٹم سے بہوئیں لاؤ گے تو یہی کچھ ہوگا۔۔!"

بہو نے جو یہ آندھی اپنے سر پر چلتی دیکھی تو گھبرا کے میاں کی طرف دیکھا۔ "کیوں جی! بیٹا آپ کا، بیٹی آپ کی۔ مانگ کیوں نہیں لیتے۔"

اور میاں نے اس انداز میں کہ جیسے کوئی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھے ـــــ کہا ـــــ "اماں جان شمسو کی بیٹی میرے طاہر کو دیدیجئے نا؟" اور اماں جان نے جھوٹ موٹ کے آنسو اپنے پلو میں جذب کیے اور وہیں بیٹھے بیٹھے ناریل پھوڑ دیا۔

لے تو بات پکی بھی ہوگئی۔

اب بڑی ہو کر نجم النساء ایسی بری بھی نہ تھی اور پھر جوانی کا زمانہ تو ایسا ہوتا ہے کہ لنگور بھی حور نظر آئے۔ اور پھر نجم النساء نے تو خوب ہی ہاتھ پیر نکالے تھے۔ اب رہی صورت کی بات، تو وہ اللہ کی دین ہے۔ کسی کو یوسف ثانی بنا دے اور کسی کو الٹے توے جیسا۔ ویسے ایمان کی پوچھو تو نجم النساء کا ذرا رنگ ہی سانولا تھا اور آنکھ ناک تو جوانی میں اپنی اپنی جگہ درست ہی نظر آ رہی تھی۔ مگر یہ ضرور تھا

کہ طاہر میاں کے بازو بٹھا کر دیکھا جاتا تو اندھا بھی ٹٹول کر کہہ اٹھتا۔

"جوڑی جوڑ کی نہیں۔"

کہاں تو طاہر میاں بغداد کے خوب رو شہزادے کی طرح اونچے چوڑے، بھاری بھرکم اور یہ حبشن شہزادی کی کنیز کی طرح سجی سجائی ضرور، مگر پھیکی پھیکی سی۔ بن نمک کی روٹی میں جو مزہ ہوتا ہے وہی نجم النساء کی صورت سے ظاہر تھا۔ اور پھر یوں تو بندریا کو بھی اوڑھنا پہنا دو تو سندریا لگتی ہے، اور یہ تو آدم زادی تھیں۔

سعادت مندی تو ماں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ طاہر میاں نے حویلی کی چلمنوں میں سے دو ایک بار یونہی جھپکتے لپکتے میں نجم النساء کو دیکھا بھی، مگر ایسے نہیں کہ راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہوں، اور دن کو خواب نظر آنے لگے ہوں۔ بس دیکھا۔ مگر نہ دیکھنے کے برابر۔ اتنا ضرور جانتے تھے کہ شادی انہی سے ہونی ہے۔ ہاتھ پاؤں چلاتے تو شاید کچھ بات بھی بنتی، مگر اس کی بھی ضرورت انہیں محسوس نہ ہوئی۔

اب تو بس یہ معمول تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھے، حویلی کے ساتھ والے باغیچے میں چہل قدمی کی۔ نہائے دھوئے ناشتہ کیا، چائے پی۔ گون کاندھے پر اور اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکا، کار میں بیٹھ، یہ جا وہ جا۔ اب نکلنے جاڑوں کا زمانہ تھا۔ ہلکی ہلکی سردیاں تھیں۔ گرما کی آمد آمد تھی۔ رضائیاں تان تان کر کمروں میں گھس گھس کر سونے والے بھی دالانوں کی طرف کھسکتے آ رہے تھے۔ اور یہی زمانہ اماں جان کی نظروں میں وہ زمانہ ہوتا ہے کہ شادیاں رچائی جائیں۔ بھرے جاڑوں میں شادیاں رچانا تو اماں جان کو کبھی نہ بھایا۔ کہتیں۔

"ارے دلہنوں پہ ذرا تو رت نہیں ہوتی۔ سردی کے چٹاخوں سے اچھی خاصی صورت موٹی جوتی کا تلہ بن جاتی ہے۔"

اور گرمیوں کی شادی انھیں یوں ناپسند تھی کہ مہمانوں کے جھوڑ جھکے سے دلہن اپنے پسینے میں آپ نہا جاتی ہے اور صحت بگڑ جاتی ہے۔ اپنی بڑی بیٹی کی شادی وہ بھولی تو نہ تھیں کہ بیچاری رات بھر میں دو دو تین تین مرتبہ بے ہوش ہو ہو گئی تھیں۔ اماں جان تو گرمی گرمی کا رونا روتی تھیں اور کہنے والیاں منہ میں پلو ٹھونس ٹھونس کر کہتی تھیں کہ گرمی ورمی کچھ نہ تھی، ان کے میاں تھے کہ ان پر ستی ہوئے جاتے تھے۔ اور تو اور ہونٹوں کی مسی تک چوس ڈالی تھی۔

ولایت سے آکر بھی طاہر میاں کا ڈھنگ نہ بدلا تھا۔ وہی تھے۔ بالکل وہی۔ ورنہ آنے والے ساتھ میں ایک میم تو ٹانکا ہی لاتے ہیں۔ اور اوپر سے پورے صاحب بہادر کہ ماں باپ، بھائی بند سے بھی وہی گٹ پٹ۔ مگر طاہر میاں وہی موم کی ناک تھے اور ماں اور دادی کو یقین تھا کہ نجم النساء کے ساتھ لشتم پشتم گذر ہی جائے گی۔

حویلی والوں کے متعلق تو پرانی بات تھی کہ خصم چھوٹے مگر رسم نہ چھوٹے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے والوں کا منہ تو کھلا ہوتا ہی ہے اور ایسے موقعوں کی انھیں ٹوہ رہتی ہے کہ کوئی سی زیادتی ہو اور وہ منہ چلائیں۔

لال لال مسند پر ایک طرف حیدر میاں، دوسری طرف طاہر میاں، بیچ میں رونق دلہن اور پھر دس پانچ سہاگنیں؟۔ اور پرلے کونے پر اماں جان۔ اور حویلی بھر کی لڑکیاں بالیاں تو ہر دم رہتی ہی تھیں کہ موقع ملے اور وہ اپنے دوپٹوں میں منہ چھپا کر ہنسیں۔۔ اماں جان گھڑکیں اور وہ نازو انداز سے لڑکوں کی طرف دیکھ کر لجائیں۔

اب جو تاریخ کی بات اٹھی تو طے ہونے ہی میں نہیں آتی۔ اماں کچھ کہتیں اور بیٹے کچھ کہتے۔ اور بہو سب سے الگ ہی سنائیں۔

"اے یہ تاریخ تو نحس ہے۔ دیکھتے نہیں مجو میاں کی دلہن جو تھے جینے ہی رانڈ ہوگئی۔"

"اوئی دور بار، اللہ نہ کرے کوئی مدار میں سر جوڑی کرے۔"

اماں جان نمٹتے جھکنے پر اتر آئیں تو طاہر میاں کو ٹھٹھول سوجھی۔

"کیوں دادی اماں! اگر تیرہ تاریخ رکھیں تو؟"

دادی اماں نے سوکھے مارے ہاتھ سے ان کا منہ بند کر دیا۔

"لڑکے تیری مت ماری گئی ہے! اب سے دہرانا تو ذرا۔ کبھی کسی نے منہ سے بھی نکالی ہوگی تین تیرہ، نو باٹ کی بات؟ ہاں اب سے جو کہا ہو تو یا تو ہیں یا نہیں۔"

"ارے واہ دادی اماں غضب کرتی ہیں آپ بھی۔ بھلا ہوگا کیا۔؟ ایک تجربہ ہی سہی۔"

"ارے چل ہٹ۔" اور اماں جان نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

کہاں تو طاہر میاں مذاق کی جون میں تھے کہ اک دم تیکھے ہو کر بولے۔

"امی میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے خاندان سے یہ جہالت دور کیوں نہیں ہوتی۔ اب بھلا تیرہ تاریخ اور بیس تاریخ میں کیا رکھا ہے؟"

بہو نے ساس کی طرف دیکھا، ساس نے بیٹے کی طرف۔ دادی پھر چلائیں۔

"اے رہنے دے تیری تعلیم۔ ہم تو اپنی سی کریں گے۔"

"سب دن خدا کے بنائے ہوئے ہیں کسی بندے نے تو نہیں بنائے نا۔ اگر میری شادی ہوگی تو جمادی الثانی کی اسی تیرہ تاریخ کو ورنہ نہیں۔ لات مارتا ہوں ایسی جہالت بھری شادی پر۔" اور وہ مسند الانگتے، جوتا کھٹ کھٹاتے اپنے کمرے کو ہو لئے۔

ایک بار طاہر میاں نے انگلینڈ جاتے وقت ضد کی تھی، اور ایسی ضد کی تھی کہ دادی کو ناکوں چنے چبوا دئے تھے۔ بس یہی کہتے تھے جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ ایک طرف تو

چچاؤں، ماموؤں اور دادی نانی کی پلٹن تھی۔ دوسری طرف یہ۔ ورلے دے کے رونق دلہن۔

"میاں تم کوئی لومڑی ساتھ باندھ لاؤ گے، پھر ہم کیا کریں گے؟" چچا نے کھلم کھلا مخالفت کی وجہ بیان کر دی۔

"آپ نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔" طاہر میاں جھلا کے بولے۔

"ارے میاں بچہ نہیں سمجھا تبھی تو کہتے ہیں۔ اور کیا بچے ساتھ میں میمیں لایا کرتے ہیں؟۔ جوان ہی تو لاتے ہیں۔"

چار دن دانہ پانی بند رہا اور جیت انہی طاہر میاں کی ہونی تھی اور ہوئی۔ معلوم تھا کہ کون سی ماں کا بیٹا ہے۔ دادی نے برستی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھا۔

"مو اخنم کا ضدی ہے۔ اے حیدر میاں رکھ دو تیرہ ہی تاریخ۔ گھر لے ٹے گا اس کا لے ٹے گا، ہمارا کیا ہے؟ آج مرے کل دوسرا دن۔ ہاں مگر سن لینا آنے والی سر پکڑ کر روئے گی۔"

شادی جمادی الثانی کی تیرہ کو طے پاگئی۔ اس دن شمس النساءؔ کے پاس مٹھائی، گیارہ اشرفیاں اور نجم النساء کے لئے ایک جوڑا بھیجا گیا۔ سرجوڑی کا۔ زرتار کا کھڑا دوپٹہ جس پہ جھم جھم کرتا روپہلی ٹھپہ ٹکا ہوا تھا۔ تاریانے کی ہری ہری چولی کرتی کمخواب کا آڑا پاجامہ۔ ادھر سے بھی جوابی کارروائی ہوئی اور اس دھوم دھڑکے میں رات کے دس ساڑھے دس بج گئے۔ طاہر میاں لاکھ ناں ناں بھی کرتے رہے مگر چھیڑ چھاڑ بھلا کیسے ٹل جاتا! حویلی میں انہی موقعوں پر تو لڑکے لڑکیوں کو اودھم مچانے اور نظر بازی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ طاہر میاں پھولوں کی جھالریں ہٹاتے اپنے کمرے کو بھاگے۔ ہلکی گرمیوں کے دن تھے۔ وہاں بھی وحشت ہو رہی تھی پٹ پٹا کر پچھواڑے کی انگنائی کی طرف دوڑے، جہاں سکون ملنے کی امید تھی۔

مگر یہ کہاں معلوم تھا کہ وہیں سکون لٹ جائے گا۔

اماں جان اپنے اصولوں کی بڑی پابند تھیں۔ جو چاہتیں وہی کرتیں۔ لوگوں کا کہنا سننا تو ایک طرف رہا ـــ اللہ جنت نصیب کرے اپنے میاں کی بھی کبھی نہ سنی۔ حویلی بھر میں بس وہ بادشاہ تھیں۔ بڑی وضع دار بی بی تھیں۔ ایک اصول ان کا یہ بھی تھا کہ نوکروں کو جانور سمجھا جائے۔ ہر قسم کی زیادتی نوکروں کے لئے وقف تھی۔ نوکر حویلی کے باورچی خانے میں پکا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ حویلی کے حماموں میں نہیں نہا سکتے تھے۔ کمرے کے ملحق دالانوں میں نہیں سو سکتے تھے۔ پچھواڑے میں اونچے کھابڑ چبوترے تھے جہاں ان کی سیج ہوتی۔ جاڑوں گرمیوں کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ویسے حویلی کے سرکار لوگ اتنے مہربان تھے کہ نوکرانیوں اور ماماؤں کو اپنے کمروں میں بلا بلا کر پناہ دیتے تھے۔ اپنے حماموں میں نہانے کی اجازت دیتے تھے۔ اب یہ اللہ کو معلوم یا ان کے دلوں کو کہ اس میں ان کا اپنا کوئی فائدہ تھا یا نہیں، مگر تھے بڑے مہربان!

اتنی بڑی حویلی جو سدا آباد رہتی تھی اس میں اتنا سکون تو شاید ہی ملتا کہ دن میں کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر لپ جھپ نہا لیا جائے۔ اسی لئے چھوکریاں عموماً راتوں کو مہندی کی باڑھوں میں دوپٹے تان کر نہا لیتیں کہ اس وقت کسی خطرے کا اندیشہ نہ ہوتا۔

طاہر میاں پچھواڑے کی انگنائی کی طرف چل دیئے۔ پہلے تو جا کر ایک دم بیچوں بیچ کھڑے ہو گئے، گویا چوری کر کے آئے ہوں۔ اور سکون ملنے پر دم لے رہے ہوں۔ پھر جب ہوش ٹھکانے ہوئے تو چہل قدمی شروع کی۔

"کیا لعنتیں ہیں ہمارے گھروں میں بھی۔" بڑبڑاتے جاتے اور ٹہلتے جاتے آسمان پر چاند تھا۔ تارے تھے۔ اور فضا میں ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے، جس میں مہندی

کی کچی کلیوں کی مہلی مہکی خوشبو تھی۔ ہنگاموں سے دور۔ طاہر میاں کو اسی سکون اور فضاء کی ضرورت تھی۔ کتے کی طرح ناک اٹھا کر انہوں نے مہندی کی خوشبو اپنی ناک میں بھر لینی چاہی! اسی لمحے انہیں احساس ہوا کہ پیچھے سے شڑاپ شڑاپ آواز آرہی ہے جیسے کوئی لوٹے سے بدن پر پانی ڈالے۔ کونے میں مہندی کی گنجان جھاڑی تھی۔

"اونہہ! ہوگا کوئی۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ جھانکتا پھروں؟"

پھر وہی چہل قدمی۔

اتنے میں ایک سریلی آواز آئی۔ طاہر میاں اگر شاعر ہوتے تو اس لمحے ضرور ہی کوئی اچھوتی تشبیہہ سوچتے اور شعر میں ڈھال لیتے۔

"ٹوٹے رے بدن۔

چھیڑے رے پون۔

ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے......"

آگے چل کر آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ غالباً نہانے والی پانی کے بدن پہ گرنے کی کیفیت کو گیت کے بولوں میں بیان کر رہی تھی۔

طاہر میاں نے دو چار بڑے بڑے قدم ڈالے اور مہندی کی ڈالیوں میں منہ گھسا کر ادھر جھانکا' اور بس جھانکتے ہی رہ گئے۔ گوری گوری پیٹھ پر بال، ننھے ننھے سنپولیوں ایسے بال، بھیگے بھیگے، قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا ہوا، گویا موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہوں۔ سنہری مائل سیاہ بال جو پیٹھ سے چپک کر پیٹھ کا ایک حصہ ہو گئے تھے۔ سیمیں ہاتھ اٹھا ہوا۔ ہاتھ میں کانسی کا بد وضع لوٹا۔ لوٹے میں سے گرتا ہوا پانی۔ منہ میں گیت۔ اور گیت کے بول۔

"چھیڑے رے پون۔

جیسے نروئی سجن۔
ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے......"

پاس دھری ہوئی ٹھلوئی میں لوٹا ڈوبتا۔ ابھرتا۔ پھر وہی صندل کی ڈال ایسا ہاتھ اٹھتا اور شڑاپ سے سارا پانی سر سے ہوتا ہوا پورے بدن پر گر جاتا۔

مہندی کی جھاڑی سرسرائی اور نہانے والی پلٹی۔

"اوئی میرے مولا!"۔ پاس پڑی چدر کو اٹھا سیدھا لپیٹتی لپٹاتی مڑمڑ کے دیکھتی وہ اکوم دالان والے چبوتروں میں گم ہوگئی۔

مہندی کی ڈال اب تک ہاتھ میں تھی اور طاہر میاں کو تو صرف اتنا یاد تھا کہ نہانے والی نے جب پلٹ کر دیکھا تھا تو اس کا مکھ چاند ایسا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی بادام ایسی تھیں۔ گالوں پر کسی کشمیری باغ کے سیبوں کا دھوکا ہوا تھا۔ اور ایک جھٹکے سے جب اس کے بال منہ پر آ گرے تھے تو اسی لمحے چاند بھی بدلیوں میں جا چھپا تھا۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا تھا۔ اور اسی ایک لمحے میں صدیاں بیت گئی تھیں۔

اور شاید مدت بعد ایسا موقع آیا کہ طاہر میاں اس دن صبح ہاسپٹل نہیں گئے۔

حویلی میں ماماؤں، کنیزوں اور چھوکریوں کی کمی نہ تھی۔ اور پھر حویلی سے لگا ہوا امام باڑہ بھی تھا۔ دن کی روشنی میں بھی وہاں کھیل کھیلے جاتے۔ اور رات تو خیر تاریک ہوتی ہی ہے۔

پتہ نہیں کون سے درخت کا پھل تھی شبو، مگر تھی تاروں میں چاند۔ اور اسی چاند کی چمک نے طاہر میاں کی آنکھوں کو کجلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر تھے ہزاروں کا علاج کیا اور کر رہے تھے۔ اب جو دل پہ ہاتھ رکھ کر پڑے تو کوئی حکمت کام نہ آئی۔

اماں جان کا ایک اصول یہ بھی تھا، اور اچھا ہی اصول تھا کہ جہاں حویلی میں کوئی چھوکری جوان ہوئی اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔ اس پر بھی کھیل کھیلے تو اس کی نیکی بدی اس کے ساتھ۔

اللہ رکھی کی شادی اماں جان نے تیرہویں ہی برس کر دی تھی۔ کمبخت کے ہاتھ پیر ایسے تھے کہ بیس برس کی معلوم پڑتی۔ نصیب تو کسی کے بس کی بات نہیں۔ شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد مرد چل بسا۔ وہ آ جا کے پھر اماں جان کے گلے ہی پڑی۔ حویلی میں ایک خانساماں بھی تھا۔ اچھا تھا بیچارہ ہاں رنڈوا ضرور تھا۔ اماں نے چاہا دونوں کے سر جوڑ دیں۔ مگر اللہ رکھی نے ہاں نہ کی۔

"ہمارے تکدیر کی بات نہ تھی بیگم صاحب! اب تو ہم یونہی اچھے ہیں"۔

جوانی اور چاندنی ـــــ سات پردوں میں سے بھی پھٹی پڑتی ہیں۔ اللہ رکھی کی جوانی بھی ایسی ویسی نہ تھی۔ چلتی تو زمین ہدرتی، بیٹھتی تو چارپائی تک چرچر بول دیتی۔ کون آنکھوں پھوٹا ایسا تھا کہ ایسے دمکتے "چمکتے" ہیرے کو دیکھتا اور اپنے تاج کی زینت نہ بنا لیتا۔ بڑی پارسائی بھی تو ایسے موقعوں پر کام نہ آتی۔

اماں جان کا یہ بھی دستور تھا کہ جہاں حویلی میں کسی چھوکری چھاکری کی جنائی ہوئی اور یہ جا پہنچیں موقعۂ واردات پر۔ حویلی والی مسجد کے امام صاحب کو بلوا کر کان میں اذان پڑھواتیں۔ بڑی سی ایک کتاب تھی رجسٹر نما اس میں بچے کی ماں اور باپ کا نام درج کرواتیں۔ یہ بہت پرانا دستور تھا اور ایسی کئی کتابیں پٹی پڑی تھیں۔

اللہ رکھی بیٹھے بٹھائے گٹکنے لگی۔ چلتی تو یوں جیسے بوجھ سر پر آن پڑا ہو۔ بیٹھتی تو یوں لیسیر کر جیسے مہینوں کی تھکی ہوئی ہو۔ مرد کا کیا چھپ بھی جاتا ہے مگر عورت کا کیا چھپ نہیں سکتا۔ کسی سخی نے یہ تحفہ عطا کیا تھا؟ یہ تو اسی کا دل جانے۔

مگر دالان والے چبوتروں پر ایک دن جب ہائے ہائے بچی تو اماں جان جا پہنچیں اور بس ٹھٹھک کر ہی رہ گئیں۔ اذان تو کان میں جوں توں پڑ گئی، مگر باپ کے نام پر اللہ رکھی کی زبان بند ہو گئی۔

"اری بول چھنال اس کا باپ کون ہے؟"

"اس حرام کی پوٹ کو جنتے ہوئے تجھے شرم نہ آئی؟"

کس کی مت ماری گئی تھی کہ جرم قبولتا۔ آنسو ہی آنسو تھے کہ بہے چلے آتے تھے۔ مگر آنسوؤں نے کب کسی کا راز کھولا ہے؟

حرام کی پوٹ بڑھتی گئی۔ چھنال، حرامزادی جیسے ناموں سے نوازی گئی۔ چھ سال کی تھی کہ ماں مرگئی۔ ماں مری۔ اس وقت ایسی بلک بلک کر روتی تھی کہ کلیجہ پھٹا پڑتا تھا۔ جس نے جہاں ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا بیٹھ گئی؟ سلا دیا سو گئی۔ اماں جان تو اس کے نام کا پھیکا کھاتیں۔ کرنے والے تو کیا کیا نہ کر گزرے تھے۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتاب میں سبھی کے نام مع ولدیت کے درج تھے۔ یہاں پیاروں بیٹی تھی کہ صہبا بنی پھرتی تھی۔

جوانی آئی تو وہ رنگ روپ نکلا کہ گلاب کی کلیوں کو بھی مات کر دیا۔ کلیاں تو پھر بھی مرجھا جاتی ہیں، اس کی جوانی تو سدا بہار تھی۔ کلیوں پر شبنم پڑتی ہے تو پھسل جاتی ہے، اس کے بدن پر گر کر تو شبنم کو بھی پھسلنے کا یارا نہ رہ جاتا۔ بنجاروں جیسے موٹے جھوٹے کپڑے، ململی چادر اور چاندی کے یہ بڑے بڑے لٹکتے جھمکتے بالے پہنے چلتی تو دیکھنے والے دیکھتے اور پھر نگاہ نہ ہٹتی۔ طاہر میاں کی نگاہ بھی تو ایسی پڑی تھی کہ جم کر ہی رہ گئی تھی۔ اور طاہر میاں نے اسے بھی دیکھا کس روپ میں تھا۔؟

اس انداز سے بدن سکوڑے بیٹھی تھی کہ آجاکے بس پیٹھ ہی پیٹھ نظر آتی تھی۔ یا پھر عمر خیام کی صراحی جیسی گردن کا وہ پچھلا حصہ جہاں بالوں نے جال سا بچھا رکھا تھا۔ یا پھر دو، پگھلی ہوئی چاندی بھرے ہوئے ہاتھ جن میں کانسی کا ٹیڑھا میڑھا کٹورا تھا!!

چھٹے دن طاہر میاں نے ہاسپٹل کا رخ کیا۔ ایسے مرے مرے بیٹھے تھے جیسے جان ہی نہ ہو بدن میں۔ دوسرا ساتھی ڈاکٹر تو تندھی سے عورتوں کو دیکھنے میں مشغول تھا، یہ یونہی جیسے اونگھتے اونگھتے چٹھیاں سیاہ کر رہے تھے۔

اک دم اس نے پکارا۔ "بھئی طاہر دیکھنا ذرا۔ ایسے کیس آجائیں تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ بتاتی ہی نہیں کچھ یہ لڑکی۔ بس پیٹ پکڑے کھڑی ہے۔"

طاہر میاں نے ادھر اچٹتی سی نگاہ پھینکی اور اک دم جنم جنم کی نیند سے جاگ پڑے اور پانی کی لہروں میں ہلکورے لیتا ہوا گیت ان کے ذہن کے افق پر ابھرنے لگا۔

"ٹوٹے رے بدن۔
چھیڑے رے پون۔
جیسے نردئی سجن
ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے......"

گھر پہنچ کر طاہر میاں نے چبوتروں کا رُخ کیا۔ "وہ بیمار ہے تو پھر یہ ڈاکٹری کس کام کی؟" کوٹ کاندھے پر، اسٹیتھسکوپ گلے میں۔ "ارے بھئی شہر میں بیماریاں پھیل رہی ہیں کوئی بیمار تو نہیں ہے یہاں۔"

سارے نوکر سٹ پٹا گئے۔ سرکار تو گدا نے اتنا کرم تو کبھی نہ کیا ہوگا۔ چھوٹے میاں خود اپنے قدموں چل کر آئے۔ وہ تو اپنا دل ہی بچھا دیتے۔ دوڑ دوڑ کر

آنے اور سنانے لگے اپنی اپنی۔
ایک سوکھی سڑی سی دق کی ماری بڑھیا کے کاندھے سے لگی لگی وہ بھی آئی۔
"اے میاں! تمہارے صدقے، دیکھ تو جرا۔ اللہ ماری کا مجاج ہی ٹھیک نہیں۔ ساری رات بکھار میں پھنکے ہے۔"
"تیرا نام کیا ہے؟"
"شبو" جیسے بانسری بج اٹھی۔
حویلی میں گل شبو کے جتنے پودے تھے سب اسی لمحے اپنی تازگی اور بہار کھو بیٹھے۔
"شادی ہو گئی تیری؟"
وہ تو دوہری ہی ہو گئی اس سوال پر۔ بدن چرا کر طاہر میاں کو ایسے کورے کورے دیدوں سے دیکھا کہ طاہر میاں دوسری بار مر مر گئے۔
نکلتے جاڑوں میں کہ ہلکی ہلکی سردی اور مہکی مہکی گرمی مل جل کر موسم کو عجیب پر کیف بنا دیتی ہے، یہی لہکا ہوا موسم طاہر میاں کو جیسے انگاروں میں لا ڈالتا۔
بڑے پیر کی نیاز اماں جان سال کے سال بڑے دھوم دھام سے کرتیں۔ اس دن تو طاہر میاں کو بھی ہاسپٹل سے چھٹی لینی پڑتی۔ مگر ان دنوں طاہر میاں چھٹی پر ہی تھے۔ شادی میں چار دن ہی تو رہ گئے تھے۔ شادی اور نیاز کی گڑبڑ نے مل کر پوری حویلی میں ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔ اماں نے اب کے یہ جتن کیا کہ ایک ہی کلا میں دو کار سلجھ جائیں۔ شادی کے دن دانے کھانے کے ساتھ نیاز کی دیگ بھی اترتی تھی۔ لپ جھپ، سرسر۔ آنچل ہی آنچل، رنگین جیسے قوس و قزح۔ سارا دن یہی گڑبڑ رہی۔ طاہر میاں تو دل پکڑے بیٹھے تھے۔
دلہا دلہن کا منہ جھوٹا لینے، ملیدے کی رکابی پکڑے شبو دالان سے نکلی

تو اک دم لڑکھڑا گئی۔

"بھ......بھ......بھوت۔" وہ پوری طاقت سے چلائی۔

بھوت ووت کچھ بھی نہ تھا۔ طاہر میاں تھے۔ لیلا کے مجنوں بنے طاہر میاں اندھیرے اجالے کونے کونے اسے کھوجتے پھرتے تھے۔ ملیدہ وہیں چبوترے پر بکھر گیا۔

اور اک دم طاہر میاں نے اسے باہنوں میں سمیٹ لیا۔

"چھوٹے میاں!" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میں نہانے کے لئے ادھر ہی چلا تھا۔ ابھی نہ سنبھالتا تو ہڈی پسلی چورا ہو جاتی۔ دیکھتی نہیں چبوترہ کتنا اونچا ہے؟ اور تو ہے بھی بڑی چھوئی موئی سی پتہ بھی نہ چلتا۔"

اتنی ساری باتوں کے جواب میں وہاں لمبی سانسوں کی میٹھی میٹھی آواز۔

"اچھا تیری شادی ہو گئی ری؟"

"اونہوں۔" اس نے پتلی سی گردن کو زور کا جھٹکا دیا۔

"پھر اس دن شرما کیوں رہی تھی؟"

"ہونے والی جو ہے۔"

"ہائیں! مگر کس کے ساتھ؟"

"کلو کے باپ کے ساتھ۔" وہ روتی آواز سے بولی۔

ستون کی آڑ سے کھینچ کر طاہر میاں اسے بھرپور اجالے میں لے آئے۔

"ایں! کلو کے باپ کے ساتھ، یا کلو کے ساتھ؟"

"اونہوں۔" وہ سمجھا کر بولی۔ "کلو کے باپ کے ساتھ!"

"ارے اس بڈھے کے ساتھ؟ کلو خود تو تیس چالیس کا ہے"

پھر اس کا باپ ؟ مگر اسی کے ساتھ کیوں ؟"۔

" نانی نے لگائی ہے ہماری بات، ہم کیا کریں ؟"۔

" ہونہہ!" طاہر میاں نے اس کا منہ چڑایا۔ " نانی نے لگائی ہے ہماری بات! تو تو کچھ نہیں کر سکتی ؟"۔

اس نے بس آنکھیں اُٹھا کر ہی تو دیکھا تھا۔ اور اس لمحے طاہر میاں کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ عورت کی آنکھوں میں مظلومیت کے آنسو ہوں تو مرد آگ میں بھی کود سکتا ہے۔

" تجھے پسند ہے کلو کا باپ ؟"۔

" مرے سور کا جنا اور ہمارا کال پھٹے۔ آتے جاتے رانی کہہ کر چھیڑے ہے ہمیں"۔

" ہوں تو یہ بات ہے۔"

" اچھا جانے دے یہ ذکر، یہ بتا یہ پلیٹ میں کیا لئے جا رہی تھی تو ؟"۔

" اے ہے اتنا بھی نہیں معلوم۔ شادی کے دن دولہا دلہن کا منہ نہیں جھوٹا کرتا ؟"۔

" اس سے کیا ہوتا ہے ؟" طاہر میاں نے بن کر پوچھا۔

" کیا ہوتا ہے بس ....." اور شبو لاجونتی بن گئی۔

" رشتہ پکا ہو جاتا ہے"۔

شبو اپنی چادر میں دوہری ہو گئی اور طاہر میاں آگ میں کود پڑے کہ اس پھول کو بچا لیں۔ ادھر ادھر ہاتھ مار کر انہوں نے چبوترے پر بکھرا ہوا ملیدہ سمیٹا اور نوالہ بنا کر شبو کے منہ میں ٹھونس دیا۔

آج جمادی الثانی کی تیرہ تاریخ تھی۔

شہرِ ممنوع

تِل

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک کالا کالا تل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بہتوں کی پنڈلیوں پر تل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا۔ بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تل سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گردن نظر آتی ہے۔ اس کے اتار پر، کسی خوبصورت سے نشیب میں کوئی چھپا تا تل ہو۔ اور بس اِدھر اُدھر کے خیال جو آتے چلے گئے تو انہوں نے کہہ سُن کے اپنی ماں کو راضی کیا اور پندرہ ہی دنوں کے اندر اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کروا لیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی ناں اگر اس دن مدن میاں کا ابدا کے نماز پڑھنے کو جی نہ چاہ جاتا۔ لگ بھگ چار پانچ بجے کے انداز میں انہوں نے عصر کی نماز کے لیے لوٹا اٹھایا، پانی بھرا اور وضو بنانے بیچ آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔ دیوار سے لگ کے بیری کا چھتنار درخت تھا جس پر دنادن پتھر برس رہے تھے۔ ایک بیر پٹ سے آکر ان کے سر پر لگا۔ انہوں نے سر نہوڑا لیا۔ دوسرا بیر چٹ سے آکر ان کی پیٹھ پر گرا۔ انہوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر ایک آدھ گالی بکنی ہی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیر ان کی ناک پر آ گرا۔ اب تو ان کا ڈھول چھلک گیا۔ چلّا کر بولے۔

"کون نتیس مار خانم ہے یہ؟۔ ٹانگ سیدھی کر دوں گا ابھی آ کے۔"

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی مستی کوئی بھی نہیں مچاتا۔ دھوپوں کی سن سناتی دوپہریں ہوں یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں یہ چھوکریاں سدا کدکڑے لگاتی پھرتیں۔

مدن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھن ٹھناتی ہوئی نوری آئی۔ نیلی شلوار جس کے پائینچے چڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا۔ لال اوڑھنی۔ آتے ہی بولی۔

"ہاں ہاں جھڑائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی؟ بڑے آئے ٹانگ سیدھی کرنے والے۔"

"اچھا۔ تیری اتنی بڑی زبان؟۔ ٹھہر تو سہی۔"

مدن میاں بڑی گرمی سے آستینیں چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سوچا ہوگا نوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی، مگر وہ تو ویسی ہی تنی کھڑی رہی۔ انہوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی۔

"اب بول۔ کرے گی زبان درازی۔ ایں۔؟"

"اوں اوں۔" وہ چلائی۔ "بڑے کہیں کے آئے۔ اس دن بھی لے کے اتنا مارا اور آج بھی چٹیا نوچ ڈالی۔ ابھی اماں سے جا کر کہتی ہوں۔"

مدن میاں سٹ پٹا گئے۔ یہ پرکالہ چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے ذرا نرم پڑ کر بولے۔

"کہاں مارا تمہارے میں نے؟"

"ہاں ہاں۔ اس دن ہم آنگن میں "چڑی چھپاکا" کھیل رہے تھے تو کس نے یہ اتنا بڑا ہنڈا پھینک کے مارا تھا؟" اکدم وہ تیکھی ہو کر بولی۔ "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے۔"

مدن میاں صاف مکر گئے۔ جھوٹ بکتی ہے۔ میں نے تجھے تو کیا آج تک کسی نوکر کے بھی پتھر نہ مارا ہوگا۔

"اوں۔ جھوٹے کہیں کے۔ یہ دیکھو تو۔" اور اس نے جھٹ اپنی نیلی شلوار کا پائینچہ گھٹنوں تک چڑھا لیا۔

"یہ دیکھو یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی۔ جی ــ ہاں!"

نہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور یہاں دل چوٹ کھا گیا۔ بڑی اُجلی اُجلی۔ دُھلی دُھلی سی پنڈلی تھی اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی۔ نیل وِیل کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا۔ کالا کالا۔

اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سنبھلتے یا کسی حیلے مٹولے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے، وہ بیر پٹختی۔ تیتوں بیر سمیٹتی اپنی لال لال اوڑھنی کا آنچل اڑاتی یہ جا، وہ جا۔

مدن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا ہڑبڑا کر نماز کو چل دیئے۔

ایک تھی شہزادی

"ہا۔ بیچاری۔" دادی بی کو شہزادی پر بڑا ترس آیا۔ سر دنہ پنج کمر وہ ساکت ہی ہو گئیں۔

"تو آگے ہوا کیا؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔

"ارے ہونا کیا؟ نیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو!"

"بھئی اللہ، دادی بی۔ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں وہ سچ مچ کی ہی شہزادی تھی جیسے۔ پھر آگے سنائیے نا۔"

"کیا سناؤں؟ مجھے نیند آرہی ہے اب"۔ دادی بی نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

" دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھیے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے، پھر لیتی رہیئے گا دن بھر جمائیاں۔ ہاں"

دادی بی نے پھر ڈوری پکڑی۔

"اے ہے بڑی کرموں جلی تھی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس مارا کھڑا ہوگا۔ تبھی تو۔ اب آ جا کے رانی کو یہی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ، کسی وزیر زادے سے ہی نکاح پڑھوا دیں۔ اے کرتی بھی کیا بیچاری! بال جو پکتے جا رہے تھے شہزادی کے۔ ادھر رانی چپکے چپکے راجہ کی جان کھائے جاتی۔

" اجی سنتے ہو! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے؟ جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہولیں، تب اٹھانا۔ ہاں آگے تم جانو۔

"مگر راجہ کہاں سنتا اس کی بات۔ وہ تو محل میں بھی بھولے بسرے ہی آتا"۔

" تو دادی بی"۔ بیچ میں شجو ماں نے بات کاٹی۔ " آخر اس غریب شاہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے؟"

" یہ لو اور سنو ۔۔۔ کہانی کا انجام پہلے ہی سے سنا دیا تو کیا مزہ رہا؟ ویسے تھی نصیبوں کی پوری بیچاری۔

" ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے۔ کہ ایک دن....."

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی بچپلے سے بولے۔

" اجی سنتی ہو بھابھی جان! وہ مدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی"۔

" ہائیں؟ کیا کہتے ہو میاں؟" وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں

ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

"ہو سکنے کی بات تو جانے ہی دیجئے۔ ہو چکا ہے!"۔

بڑی چچی چرڑ کر بولیں۔" موئی گن کی نہ ڈھنگ کی۔ کس بات پر ریجھ گئے صاحبزادے!
سارا دن تو گلی کے پوتوں کے ساتھ ہڑ دنگ مچاتی پھرتی ہے۔ لو کیسا زمانہ آلگا ہے۔
بچپن کی نسبت بغیر پوچھے گچھے توڑ پھینکی۔ موئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہوگئی۔ جب
دل چاہا اتار لی۔ مگر یہ ہوا کیسے؟"

"بھابی جان — اب لیلی کا جوڑ تھا مل گیا۔ جو ہوا سو ہوا، مگر اب ہماری شنجو مان
کا کیا ہوگا؟ اور پھر شنجو مان کی وجہ سے ربو مان کا کیا بنے گا؟ ربو کے سسرال والے تو
یوں ہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں، جیسے تیسے انھیں تھاپ دے دے کر روکے ہوئے تھے۔
اب تو وہ صاف کہہ دیں گے۔ 'نہ بابا' ہم اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے کیا ہیرے
جڑے ہیں تمہاری بیٹی میں، کیوں جھوٹ کہتا ہوں؟"

بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شنجو مان کی طرف دیکھا جو بدنصیب شہزادی کی
کہانی آنکھوں میں نمی لئے سن رہی تھی۔

گرتی دیوار

ابھی شنجو مان بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدن میاں سے بات پکی ہوگئی۔
ربو، جو شنجو مان کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی، ابھی بالکل ہی گڑیا جیسی تھی۔
مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگی ہوئی تھی۔ ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور
ادھر شنجو مان کی مدن میاں سے نوک جھونک چلتی رہتی۔ پہاڑے یاد ہوتے رہتے
اور مدن میاں سے ٹھولا ٹھالی چلتی رہتی۔ دیکھنے والے دیکھتے اور ہنس دیتے۔ بڑی

چچی کہتیں۔ "اے تمہارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے ہنسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونیوالی دلہن کو گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ ہاہاں اور کیا! اور بھئی یہ تو ہونا ہی چاہیے۔ میاں بیوی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے؟۔ بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کھل کھلے ہو گئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوے کے پر دل ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اسی سے تو ناچاقی بڑھتی ہے۔ میاں تو دکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی۔ یوں نظروں سے بی بی گر رہے تو رنڈی کی ہنڈی تو تیار رہے ہی۔ مرد کی کاٹھی کو عور کہاں پہنچے۔"

مدن میاں اور شنجو مان کا بھی اچھا خاصا فرق تھا۔ سب کے ساتھ شنجو مان بھی اپنا بھولا بھولا منہ اٹھا کر انھیں مدن بھائی کہتی۔ کوئی نہ کوئی اسے ٹھوکا دے ہی دیتا۔

"اری کل جبھی! بھائی پکارتی ہے ہونے والے دولھے کو؟" اب شنجو مان کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دولہا کیا ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دولہے کے نام پر شرمایا جاتا ہے۔ بس وہ گٹھری سی بن جاتی۔

مدن میاں وکالت پڑھ رہے تھے۔ گویا بڑی انہونی بات کر رہے تھے۔ مگر ساس سسر خوش تھے۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں بولتی سپاری اور ہنسی لونگ کی طرح عنقا تھے۔ اب یہ تو اپنا اپنا نصیب کی بات ہے کہ شنجو ان کو تو وکیل دولہا ملے اور ربو بیچاری کو جاہل جٹ، گنوار کا لٹھ۔ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ سیوٹ نبھے گی؟ کیونکہ اور کچھ نہ سہی، مگر، ربو خیر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی تھی۔ دو کتابیں اردو کی۔ اور دس تک پہاڑے بھی یاد تھے اسے!۔

ادھر شنجو مان نے سولہویں میں اور ربو نے تیرہویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے ربو کے سسرال والوں نے ادودھم مچادی۔

"وائے ہے دیکھو تو سہی! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے۔ آخر کب اٹھانے کا ارادہ ہے؟"۔

پیغام تو دونوں ہی کے موجود تھے۔ مگر مدن میاں کی اماں کہتی تھیں، اماں کیا کہتی تھیں، خود مدن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل۔ ایل۔ بی کی خلعت پہن لیں پھر کریں گے شادی وادی بھی۔ ریو کے سسرال والوں نے کیا کیا گھائیاں نہیں گھالیں؟۔

"اے ہم تو پچھتائے ان کے گھر کی بیٹی اٹھا کر۔ تو ج کوئی اس عمر کو ٹل جانے دے۔ اب تو ٹانگ سے باندھ رکھا ہے، پھر ڈھلتی میں اٹھانا۔"

بڑی چچی نے انہیں بڑی صلاحیت سے ٹلاوے دیئے۔ "بات کرتے میں تین برس نکل جائیں گے۔ پھر دیکھو دو منڈوے ساتھ ہی ساتھ پڑ رہن گے۔ اے بہن! تم اپنی ہی والی ہو۔ ذرا سوچو تو سہی چھوٹی کو وداع کر کے بڑی کو نہ اٹھایا تو کہنے والے کیا تھوکیں گے میرے منہ پر کہ ہو گا بڑی میں کوئی عیب تبھی تو چھوٹی کو اٹھا دیا۔ اب اللہ سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ۔ بس ایک یہی مجبوری ہے۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی ہوں۔"

یہ بڑی چچی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گھنوں کے تھے۔ اب بڑھاپے میں آکر بڑے سیدھے بن گئے تو کیا ہوا؟۔ کیا کیا جلاپے انھوں نے بڑی چچی کو نہیں دیئے؟۔ بس کھولتے پانی میں ڈال کر جوش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کرتوت سے کاہے پردہ اٹھاتیں۔ مگر چھوٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ "بھائی میاں نے گودی بھاوج کے چکر کے بھی لگائے تھے دست پناہ سے۔"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے کہ اس جھنجھٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے۔ بات۔ وہی ایک بات۔ عشق و محبت کی یہ وارداتیں آج کل سے نہیں اس گھڑی سے چلی آرہی ہیں جبکہ آدم نے بی بی حوا کی کھوج کی تھی۔ یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گودی چھٹے، پکے پان جیسی اجلی بھابھی کے لئے وقف تھے۔ اب بہن دل پر کس کا بس چلا ہے؟۔

یہ کھیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے۔ وہیں جھونپڑیا پہ کلوے کسان کی لکھن سی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی۔ ان کا تو کیا گیا، برس پیچھے وہ ضرور ایک حرامی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تھاپ پہ تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کر دوں گا تو تجھی سے ورنہ زہر کھا لوں گا۔ اس بیچاری کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کمرتی بچا کیا؟۔

اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے ولے تو اپنی بات کے پورے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ "اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا۔" مگر کھلے بندوں چھٹی تو انہوں نے کبھی نہ دی۔ سید تھے۔ بات کیسے گرنے دیتے؟"

بڑی چچی بیاہ کر بھی آگئیں۔ مگر میاں کے تیور وہی رہے۔ اب بھی لپ چھپ کر جھونپڑیا پر جاتے۔ مگر مارے باندھے کے چار چھ بچے بڑی چچی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں۔ کبھی منہ سے نہ پھوٹتیں۔ جو جو بیتی وہ جھیل گئیں کبھی بھولے بسرے ایک حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالتیں۔

"لے واہ یہ اچھی سنائی بوا۔ کیا محبت نہیں، پیار بیورت نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوئے؟"

بڑی چچی تو ایک بار جل کر بول گئیں۔ "اے بچوں کا نہ کہو۔ بچے تو کتے بلیوں کے بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کیا ہے۔۔؟"

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ بڑی دلہن نے تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہوگی۔ یہاں تو یہ حال تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا دیتے اور مارے باندھے کی جوں توں رزاق میاں کو رات بی بی کے ساتھ بسر کرنی ہی پڑتی۔ مگر سورج تو شام کو ڈھلتا ہی ہے۔ دن بھر کتنا ہی جگمگائے۔ اب تو رزاق میاں

راستے پر آ گئے تھے۔ جھونپڑیا والی سے بھی نیچے اوپر تین تین بچے ہوئے۔ مگر چھوڑی ہوئی ہڈی کو کون دستر خوان کی زینت بنا لیتا ہے؟۔ دودھ جیسا بے داغ اور سنگ مرمر ایسا چھریلا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا، دے گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے، نظروں سے اتر گئی۔ گاؤں کے حاکم تھے، کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پر چول کرتا پھرتا۔

یوں تو ربو کے سسرال والے اس گھڑی مان گئے۔ مگر ادھر مدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی چچی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اب تو کوئی ٹھور ٹھکان بھی نہ تھا۔ منگی ہوئی لڑکی کا پیغام ٹوٹ جانا۔ یہاں تو ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پلہ جننے والی اس سے اونچی تھی۔ لوگ باگ یہی تو پوچھتے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی۔ پھر وہ غیر کف والے ہی بیاہ لے جائیں۔ تو لے جائیں۔ اپنے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے بلکہ موقع ملے تو ادر پردے اٹھاتے۔ اور یہاں تو سوال بڑی بٹیا کا آ پڑا تھا۔ ربو ہوتی تو ایک بات بھی تھی؟ وہ پھر بھی چھوٹی تھی۔ پہلے تو شجو مان یوں ہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا۔ بڑی چچی تو حواسوں ہوتے بھی پاگل ہو کر رہ گئیں۔ پلو پسار پسار کے مدن میاں کی کڑیل جوانی کو کوسنے دیتیں۔ پھر آجا کے نوری پر صلواتیں پڑتیں۔

"اے بی ہمیں سب معلوم ہے۔ آج کل موا یہی چلن ہو گیا ہے۔ کھلے بندوں چڑھاوے کے بیلوں کی طرح جوان ہیلاٹ لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ پڑے گی اور من مانی کریں گے۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ کدکڑے لگاتی پھرتی تھی۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا ہے تو نامحرم۔ معلوم ہے بی، یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی۔"

اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ تل شنجومان کی تقدیر کی سیاہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا! مگر کوسنوں سے ہونا بھی کیا تھا؟ چڑا تو ہاتھ سے اڑ گیا تھا ——

"کاگا رے کاگا — تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا۔
میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو تُو اڑ جا۔

"ہائے! بیچاری شہزادی روزانہ محل کے چھجے پہ کھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی۔ سیکڑوں کوے منڈیر پر بیٹھے کے بیٹھے ہی رہتے، کوئی بھی تو نہ اڑتا۔"

"ہائے — تو دادی بی الیک کہنے سے کیا ہوتا ہو گا بھلا؟" یہ ریویو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی۔

"پھر مجھے ٹوک دیا نا! اری کلموہی، کوے کو پکار کر، اس کے پیروں سونے کے دھاگے باندھنے کا لالچ دے کر اس سے پوچھو، میرے گھر کوئی مہمان آنیوالا ہے؟ اگر اڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اڑ گیا، اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں۔ اڑے بھی تو سندیسہ کیسے دے؟ ہاں، اب سے بیچ میں نہیں بولنا۔ تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی، مگر اس کے نصیب کھلنے تھے نہ کھلے۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی۔ اللہ کا نام بڑا، اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن ....."

"یہ شہر ممنوع کیا ہوتا ہے دادی بی؟" شنجومان نے بہت ہی سادگی سے سوال کیا۔

دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پہ گھور کر دیکھا۔ مگر چونکہ شنجومان بہت کم کوئی سوال کرتی تھی اس لئے پیار سے بولیں۔

"اے تم نہیں سمجھ بھی گیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ نما شہر ہوتا تھا۔ بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جن کی شادیاں ہو چکی ہوں۔

اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گزار کر واپس آجاتے تھے۔ اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہر ممنوع نہ رہ جاتا۔

"تو دادی بی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جا سکتی ہوں گی۔"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کام؟ شہر ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ کھلی بستی ہوتی تو کیا بیاہی۔ کیا ان بیاہی، سبھی دھول اڑاتی پھرتیں؟ مگر وہ تو شہر ممنوع تھا۔

"توبہ ہے، بیچ بیچ میں سو رخنے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ...."

اسحاق میاں ہمیشہ کلائمیکس کے لگ بھگ پہنچ کر ایک آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی۔ اور بولے۔

"اجی سنتی ہو بھابی جان! وہ جمو میاں کے ابا ملے تھے۔ ربو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلدی شادی نہ کی تو سمجھو پیام ٹوٹا ہوا ہے۔"

"ہائیں!" بڑی چچی جھپکیاں سی لے رہی تھیں۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

ہو سکنے کی بات جانے دو۔ اور جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھینکتی رہنا۔ میں کہتا ہوں کہ ہی دونا ربو کے ہاتھ پیلے۔ اب اس بیچاری کے نصیب تو دغا دے گئے۔ تم ہی سوچو ایک تو یہی بیٹھی ہی ہے۔ دوسری بھی چھاتی پر مونگ دلے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں!"

"ناں میاں ـــ تم جھوٹ کاہے کو کہو گے! مگر یہ تو سوچو شجو مان بڑی ہے آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر بار برت رہی ہے۔ بچے کھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟۔

"بھابی جان اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، مگر تم ذرا گہرائی میں تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی ایسی دانشمندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا بھی کوئی بلخ کا شہزادہ آ ہی جائے گا۔ ہم ایک گنا فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی تمھارے کولہے سے لگ کر۔ شکر میں دب کر مکوڑا مر نہیں جاتا۔"

"کہتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جانے اور کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے کنواری بیٹی اور پہاڑ کو تولو۔ پھر بھی پہاڑ ہی اوپر اوپر اٹھتا چلا جائے۔ یہ پلڑا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

اندھیرا

بچپن سے شجو ماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ ساتھ پڑیں گے!۔ ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، مہندی لگے گی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ میں ہی ڈور کٹ کے رہ گئی۔ کان تو شجو ماں کے بھی تھے۔ بڑے ٹھنڈے دلوں سُنا کہ ربو کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا ابھی صرف سولھواں ہی تھا اور یہاں شجو ماں تو اٹھارہواں بھی پھلانگنے کی سوچ رہی تھی۔

سر جھکائے جھکائے شجو ماں نے ربو کی کرتی میں لچکے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکتے دیکھے نہیں ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں۔ کچھ بھی اُڑ جاتی۔

"اوئی بہن کا سکھ دیکھا نہیں جا رہا۔"

"منہ زور جوانی ہے سنبھالی نہیں جا رہی ہو گی۔"

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا۔ اب تو یہاں دن رات دھڑا دھڑ چولیاں سِل رہی ہیں اس پہ بانکڑی ٹنک رہی ہے۔ کھڑے دوپٹے چنے جا رہے ہیں اور کرن ٹنک رہی ہے۔ کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گلے مونڈھے ٹنک رہے ہیں۔ اور ان سب کاموں میں شجو ماں آگے آگے ہے۔ ربو تو دن رات پلنگ توڑتی یا پھر سکھی سہیلیوں سے کھسر پھسر کرتی رہتی۔ سارا کام شجو ماں کے سر تھا۔ گھر کیاں بھی سن رہی ہے جا بے جا پڑ تال بھی پڑ رہی ہے۔

"اے ہے شجو ماں! یہ دیکھو مونڈھے کے پاس سے لہر ٹیڑھی ٹانک دی"۔

"اے بی تمہیں آنکھیں نہیں۔ یہ بانکڑی میں نے تمہیں کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی؟"

سر سر دن گزرے جا رہے تھے۔ جیسے پروائی ہوا کے جھونکے۔ دیکھتے دیکھتے شادی کا دن بھی آ گیا۔ شجو ماں نے اپنے ہاتھوں دولہا میاں کی سلامی کی تھالی سجائی۔ اُدھر ربو دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اور آج کئی دنوں بعد پھر شجو ماں کی آنکھیں برسے جا رہی تھیں۔ کون جانے یہ آنسو بہن کی جدائی پر تھے یا اپنی بد نصیبی پر!

مہمان بیبیاں اترتیں۔ جان بوجھ کر بڑی چچی کے پاس رکتیں اور پوچھتیں۔

"اوئی بہن، ہم تو سدا سے سنتے آ رہے تھے کہ دو منڈوے پڑیں گے۔ ہوا کیا؟"

"اے بہن، یہی وہ تمہاری بڑی بیٹی ہے جس کا ناطہ ٹوٹ گیا"۔

بڑی چچی چوٹی بنی ادھر اُدھر منہ چھپاتیں۔ بہانوں سے منہ پھیر پھیر کے آنکھیں پونچھتیں۔ اور ادھر شجو ماں پھرکی بنی سارا کام نبیڑ رہی تھی۔ ہر احساس سے عاری۔ ابھی جہیز کے کمرے میں ساڑیاں لائن سے جما رہی تھی تو ابھی باورچی خانے میں کھانے والے کی خبر لینے جا پہنچی۔ ابھی پھلواری سے سہرے کے پھول لے رہی ہے تو ابھی عود دان میں انگارے کے لئے ربو کے بال سکھانے لپک رہی ہے۔

شجو ماں کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی، جب میراثن نے ڈھولک پر تھاپ دی۔

"تاروں میں جلوہ مت دو بابا

جلدی گھر کو جانے دو

سلامی کی تھالی لئے وہ لپر جھپر چلی جا رہی تھی۔ اک دم اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ ساتھ کی سکھی سہیلیاں سب ربو کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ جہاں آرا جس کی شادی کو سال بھر ہو گیا تھا اور اب تو گود بھی بھری پڑی تھی۔ ربو کو ٹھیل رہی تھی۔

"اری سنتی ہے۔ جلوے میں اتنی بھی دیر نہ ہو۔ ادھر بنے میاں انتظار جو فرما رہے ہیں!"

ربو گٹھری تو تھی ہی، اور بھی سمٹ گئی۔

"اری یہ سب چالیں ہیں"، کوئی دوسری بولی۔ "ہم سب سمجھتے ہیں۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دولھے میاں کو اپنے ہاتھوں پان بنا کر کھلائے"۔

شجو ماں کے قدم سو سو من کے ہو گئے۔

"تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی ہو۔ ارے یہ رات ایک بار ہی تو آتی ہے"۔

چھن .... چھن .... چھن ...... تھالی گر گئی اور سلامی کے روپے، پورے کے پورے، مع چکنی الائچی، لونگ کے برآمدے میں بکھر بکھر گئے۔

پھر شجو ماں کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب ربو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوشامد کروانے چلی گئی۔ مگر جب شجو ماں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ گھیرے تھے۔ دل چلتے میں رہ رہ کے زور زور سے دھڑک اٹھتا۔ چکر آتے تھے۔ اور ادھر ربو تھی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ

ہوئے تھے۔ جماگیاں بھی پوری نہ ہوئی تھیں، شرم بھی نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے
کہ گھونگھٹ کا پردہ اٹھا اٹھا کر وہ ابکائیاں لینے اور قے کرنے لگی۔

ربو کے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ہفتہ میں چار دن باہر گزارتے
چار دن گھر پر رہتے۔ داماد آتے تو شجو ماں ہی ان کا کمرہ سلیقے سے سجاتی۔ لاکھ
صفائی، جھاڑا جھٹکی کرتی، مگر ربو صبح اٹھتی تو وہی مچھروں کا رونا لیکر۔۔ گال سہلاتی
ہوئی زیرلب مسکراتی ہوئی۔

"اپی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ مچھر کاہے سے ٹوٹ پڑے ہیں؟۔"
سلیمن ایک دن دیدے مٹکا کر بولی۔ "ہاں شجو بی بی، سچ مچ یہ مچھر۔ توبہ ہے!
اتنا بڑا مچھر ہے، ایک دو نہیں پورے بتیس دانت ہیں اس کے منہ میں۔ اور کمبخت
جب ڈنک لگائے گا تو چہرے پر، گالوں پر، ہونٹوں پر۔ کیوں ہے نا ربو بی بی؟"
ربو بی بی مسکرا کر اور بنکر شرماتی ہوئی اسے مارنے کو لپکیں اور شجو ماں کی آنکھوں
میں رات کی بھرپور سیاہیاں تیر تیر گئیں۔

"شجو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی؟۔ کہیں کر ڈالو نا بہن۔"
"اللہ رکھے چھوٹی تو جھولا جھلانے کو ہو رہی ہے۔ اور بڑی ابھی تک بیٹھی ہی ہے۔"
آنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی چبھوتیں اور بڑی بچی
کا منہ نہ اٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے! اتنی شکر کیوں بھر دی حلوے میں؟۔ دیکھتی نہیں ربو
کو ابکائی پر ابکائی چلی آ رہی ہے۔"
"اجی بی بی، یہ ابکائی پھیکا کھانے سے نہیں رکنے والی۔ ہماری بی بی کی
اللہ رکھے گود ہری ہونے والی ہے۔" سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

شنجومان اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لئے کبھی ربو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا قدم جو اس کا اٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی۔ دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

بڑھاپا

بلّی اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی، مگر چلتے دونوں ہی ہیں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں! بلّی کتنی ہی اونچائی سے گرے، پنجوں کے بل گرتی ہے۔ آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

باورچی خانے سے شنجومان نکلی تو سلیمن بولی۔

"بی بی! سر تو جھاڑ لیجئے، راکھ جم گئی ہے۔" شنجومان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مگر یہ آخری تیر تھا، چپکے سے، یوں ہی شنجومان نے آئینہ تھاما تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے گئے۔ اور اپنے نظر نہ آنے والے قدموں کی سفید سفید سی دھول چھوڑ گئے جو اور کوئی مناسب مقام نہ پاکر شنجومان کے سر پر جم گئی۔

وقت گذرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور آرزوئیں بھی لئے جاتا ہے جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر شنجومان کا دل کیسا نگر تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ آگے سے، پچھواڑے سے۔ جہاں موقع ملتا وہ گھر کے چھجے پر چڑھ جاتی اور گھگھیا گھگھیا کر ایک ایک کوے سے مخاطب ہوتی۔

"سنگارے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا

میرے بھاگوں کوئی مہمان ہو تو تو اڑ جا

مگر سونے کی پائل کا لالچ بھی انھیں نہ رجھاتا۔ مزے سے بیٹھے کائیں کائیں کئے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا کہ جو اڑ کر بالم کا سندیسہ لاتا اور اس شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے۔

"ہا۔ بیچاری۔" دادی کی شہزادی کو اب تک بھی شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے ہوئے "ہائے۔ بیچاری شہزادی۔" کہہ کر پھر سے کہانی شروع کر دیتیں۔ کبھی کبھی شبو مان محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور کوئی نہیں، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا۔ نہیں ملے گا۔ دل میں ڈر لئے کبھی کبھی وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔

"دادی بی! پھر اس شہزادی کے لئے شہر ممنوع کے دروازے کھلے؟" مگر یہاں پہنچ کر وہ آس بھی دھواں بن کے اڑ جاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شبو مان کے منہ کا تالا کبھی نہ کھل سکا۔

"ہا، بیچاری شہزادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گذرا، اور ایسا گذرا کہ شہزادی کے بالوں پہ برف سی پڑ گئی۔"

شبو مان نے گھبرا کر اپنا مرجھائے پھول ایسا چہرہ پاندان میں لگے آئینے میں دیکھا۔

"دادی بی ـــــ" وہ چلا اٹھی۔ "کوئی دوسری کہانی سناؤ۔ دوسری کہانی۔ دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے مجھے سب معلوم ہے دادی بی۔" اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سہارا

بچپن میں شجو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا، پھر اردو کی اور چار چھ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ماموں، چچا سے پہلے تو رفت رفتن کی گردان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی "گلستاں" "بوستاں" بھی پڑھ ڈالیں۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونے والے دولہے میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دوسے شروع کیا اور بیس تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے، مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی الٹ جائیگا۔ اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائیگا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں، اسحاق چچا کی بیٹیوں کو الف بے کی تختی یاد کروانی شروع کی۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کی ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں، وہ بھی پاس آکر بیٹھنے لگیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ شجو ماں کی اچھی خاصی جماعت جڑ گئی۔ دس برس کے اندر کے لڑکے بھی آنے لگے اور یوں ادھر ادھر کے ملا کے بیس پچیس بچے ہو گئے اور شجو ماں باقاعدہ "آپا بی" بن گئیں۔ بڑے پیار سے وہ ہر ایک کو بغیر گھڑکے جھڑکے پڑھاتی۔ دل تو سدا کا پھوڑا تھا دکھتا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہو گا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا! سارے بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا بی سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا، مگر ادھر صبح ہوئی نہیں کہ اکدم دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہو جاتیں۔ اور سب آ آ کے دیوان خانے میں بیٹھتے جاتے۔ اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے۔ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو بھجاتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شجو ماں کو مجبوراً رات کو بھی پڑھانا پڑتا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی۔ اتنی مصروفیت میں بھی شجو ماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا۔

اور یوں، جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو۔ آپ ہی آپ وہ چھجے پر جا کھڑی ہوتی اور ہولے ہولے پکارتی۔

"کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا۔"

کوے دھوم مچاتے۔ کائیں۔ کائیں۔ کائیں ــــ مگر وہیں بیٹھے رہتے۔ بالم کا سندیسہ کبھی نہ آیا اور اب تو شبو ماں کی آنکھیں بھی روتے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آنسو تھے، ایک طرف انتظار۔ کس کا انتظار؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس روئے جاتی اور پکارے جاتی۔

"تو تو اڑ جا ــــ کاگا رے کاگا۔"

مگر کوؤں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اڑنا تو دور رہا پر تک نہ پھڑپھڑاتے۔

"ہا ــــ بیچاری شہزادی! بڑی کرموں جلی تھی بیچاری۔ راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں۔ ارے جس کے سر پر باپ کا سایہ ہو اسے کاہے کا ڈر؟ یہ چھتر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگہ مست تھے۔ انھیں کیا فکر! بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی۔"

"وہ کیوں دادی بی؟" جماعت کی کوئی معصوم سی بچی پوچھ بیٹھی۔

دادی بی گھورتیں۔ "پھر ٹوکا دیا نا تجھے؟ ارے راجہ کی پسند کی رانی کہاں تھی؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی۔ پھر دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے منے بچے ہیں بکے چلی جاتیں۔"

"اور کھوٹ بھی ایسی ویسی تھی! ارے ایک سیدھے دو چار بچے ہی کیسے ہو گئے۔ سو ہو گئے ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ جی اپنی رانی سے باقاعدہ ماں بہن کا جیسا برتاؤ رکھتے۔ ہاتھ تک نہ لگاتے، ارے یہ بازو تک نہ بیٹھتے تو بچوں کچوں کا

کیا سوال؟" مزید ثبوت کو وہ سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور بولتیں۔
"ارے پاس آکے بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے پیدا ہو بھئی۔ ہاں تو پھر یہ دوری اتنی بڑھی، اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی۔ اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا؟ ماں گھلتی رہتی مگر فکر دور نہ ہوتی۔

"ہاں تو پچھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی؟"۔

"ہاں، تو اللہ کا نام بڑا، اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک مصیبت کا مارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آنکلا۔"

شجو ماں ربو کی چوتھی بیٹی کے لئے اون کے موزے بن رہی تھی اکدم چونک پڑی۔ سلائیاں اور اون کا گولہ اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔ کیا شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے، شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں؟

"دربان نے آکے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔ شہزادی نے اسے خاص اپنے حرم میں بلوا لیا۔"

"اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا؟" عائشہ بول اٹھی جواب دسویں میں تھی اور اسے بار بار سینے پر دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔

"لے تو بی بی اب شہزادی اتنی سمجھدار تھی، بھلا یہ پردے جھرڑے کی اُسے کیا ضرورت؟ ہاں تو بھئی شہزادی نے شہزادے کو بلا ہی لیا، مگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بدن پر بڑے بڑے کپڑے تھے اور سفر سے اس کی صورت بھی بڑی ہونق ہو گئی تھی۔ بال بھی بڑھ گئے تھے۔ شہزادہ تو گیا

ہاں صورت سے قیدی ضرور لگتا تھا۔"

دادی بی خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے، مگر شجو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔

"اب تم جانو شہزادی سو عقلمندوں کی ایک عقلمند۔ اس نے سوچا۔ اونہوں، ایسے نہیں اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے بس تو شہزادی نے نوکروں کو حکم دیا کہ رنگا رنگی کپڑا خرید لائیں ــــ ہر ہر قسم کا کپڑا ــــ اور اس کے گدے تیار کریں۔ بس جی نوکر خریدی کے لئے دوڑے۔ پورے شہروں میں ستر رنگوں کا کپڑا ملا۔ جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا۔ معلوم ہے کیسا بستر؟"

دادی بی کی کہانیوں میں دل بھر کے ناقابل یقین باتیں ہوتی تھیں، پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سنتے۔

"ہاں تو بستر کیسا تھا؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پر تیسرا، تیسرے پر چوتھا ــــ ایسے ستر گدے ایک پر ایک لگوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ اٹھا کر کے رکھ دیا۔"

"چنے کا دانہ! وہ کیوں؟" چھجو حیرت سے بولا۔

"ارے آگے سنو نا بیچ بیچ میں منہ کیوں مارتے ہو رہے؟۔ تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے رکھ دیا۔ رات ہوئی، سب سو گئے۔ صبح ہوئی، شہزادی نے منہ ہاتھ دھویا نہ کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ پوچھا۔

"کیوں جی، آپ کی رات کیسی گذری۔"

"شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا۔ جی رات تو آپ کی بدولت اچھی ہی گزری مگر..... "، اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

"کیا؟" شہزادی نے پوچھا۔

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا۔

شہزادی نے اس کی قمیص الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی ہو رہی تھی۔ تب شہزادی کو یقین آ گیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے۔ کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہو سکتے ہیں کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے۔

"جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ سچ مچ کا ہی شہزادہ ہے اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے کی محبت پیدا ہو گئی۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی، اور شہزادہ بھی خاصی بڑی عمر کا تھا۔ تو تم جانو دھان کا پودا گھٹنے گھٹنے پانی میں ہی پروان چڑھتا ہے۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اٹھا رکھا تھا کہ چوڑیاں زیور اور رنگ برنگی کپڑے وپڑے پہننا سب ترک کر دیا تھا۔ گویا بیوگی اٹھالی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی، جھکا جھول کپڑے پہنے۔ چم چماتی، کھن کھناتی چوڑیاں پہنیں؟ جھومر لگایا۔ شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا۔ اور اسوقت تو بڑا مزا آیا جب"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجہ میں بولے۔

"اجی بھابی جان سنتی ہو! غیر کریں تو پھر غیر ہیں، یہ تو اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اڑاتے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں....." اکدم وہ رک سے گئے۔

"کیا کہتے ہیں؟" بڑی چچی نے ہولا کر پوچھا۔

دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھی شجو مان انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آواز نیچی کرکے بولے۔
"کہتے ہیں ربو سدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے"۔
اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش رہ گئے۔

"اور وہ تمہاری ممیری بہن" وہ پھر بول اٹھے۔ "کمبخت کدھر کی، کہتی تھی شجو مان کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑے ہیں؟۔ اور کھانا تو برائے نام کھاتی ہے۔"

"میاں!" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تمہی کہو میری شجو مان ایسی ویسی لڑکی ہے!"

"ارے نہیں جی بھابی جان! میں یہ کب کہہ رہا ہوں؟۔ میں تو تمہیں ذرا سنانا چاہ رہا تھا کہ تمہارے والے ایسے گنوں ہیں۔"

"میاں!" بڑی چچی پھر بڑے سہمے ہوئے لہجہ میں بولیں جس میں گھگھیاہٹ بھی شامل تھی۔ "بلا سے عمر ڈھل گئی، آج بھی کوئی ملے تو ہاتھ پیلے کر دیں اس کے۔ تمہاری نظر میں کوئی نہیں؟"

"بھابی جان! بھلے کو شجو مان کوئی حرامی پلہ ہی جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگنی ہوئی بیٹھی کی بات ٹوٹ کر تو۔ اونہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔"

جلتے تیل کی بوندیں سی شجو مان کے کانوں میں گر رہی تھیں۔

"اوہ خدا — یہ جوانی! کیا میں اب بھی جوان دکھائی دیتی ہوں کہ لوگ یوں نام دھر سکیں۔" اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ڈھلتا سورج زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ "بس شام ابھی ہوا چاہتی ہے۔" پھر یہ دنیا — اور دنیا والے۔

اماں نے ایک بار پھوپھی بی کے رنڈاپا چڑھایا تھا۔ پھوپھا میاں راتوں رات چیٹ پٹ ہو گئے تھے۔ اماں بی نے پھوپھی کی کچ کچاتی ہری ہری چوڑیاں پتھر مار مار کے

پھوڑی تھیں۔ گلابی ریشم کی پھول دار ساڑی نوچ کر بیوگی کی موٹی سی سفید چادر اوڑھا دی تھی۔ کالی کانی پوت کا لچھا کھینچ کر گلا سونا سونا کر دیا تھا۔ اور کلائیاں کر دا کر دا کے مسی کی دھڑی چھڑوائی تھی۔

" میں بھی رنڈاپا چڑھا لوں گی "

مگر وہ کہاں ہے جس کے نام سے مجھے رنڈاپا اور رنڈاپے کی کفنی مل رہی ہے؟"

اس نے بھرے دل سے سوچا۔ پھر پچھواڑے کے آنگن میں جا کر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی موباف تھی، اسے پھاڑ پھینکا پھر کمرے میں آ کر زعفرانی اوڑھنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی۔

اتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا، مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیر الدین کا بھانجا بڑا نکھٹو تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بڑا بودا۔ اسکول میں چھبیس مرتبہ تو بٹھایا ہوگا، مگر اٹھا اٹھ کر بھاگ آتا۔ نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اسے دنادن ٹھوکتے۔ آٹھ چوروں کی مار اس اکیلے کو پڑتی، مگر وہ الف بے کی تختی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نویں برس تو بچے چوتھی پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں۔ شبو ماں کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی۔ کہ دو دو کلاسیں ہو رہی ہیں ماں نے بھائی سے کہا۔

" بٹھا دو گے شاہجہاں بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائیگا رستہ سے "

نصیر میاں کے دل کو بھی بھا گئی۔ ستھرے صاف کپڑے پہنائے بغل میں بستہ دلوا کے شبو ماں کے گھر آئے۔ یہ دیوان خانے میں اپنی فوج کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پہ دستک دی۔ شبو ماں نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا اور دستک دینے والے کو کہا۔

"اندر آجاؤ۔"

آگے آگے رؤف میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں۔ ایک دم شجو ماں سٹ پٹا کر کھڑی ہوگئی۔ الف بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا۔ اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل سر پہ لرز رہا تھا اور وہ سمٹی سمٹائی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی۔

"یہ ..... ب ..... ب ..... بچہ پڑھتا ہی نہیں ..... ب .... بالکل ..... وہ ہے" نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھی۔

"جی ..... م ..... میں پڑھاؤں گی۔ یہاں تو سبھی ڈھیٹ آتے ہیں" وہ گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے۔ "جی ہاں ــــ ذرا دھیان سے پڑھا دیجئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سُنی ہے۔" اور وہ سلام کر کے، جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے۔!"

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے۔!!"

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے۔!!!"

شجو ماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سنی ہے۔؟"

"ہاں آپا بی ــ آپ بہت ــــ بہت اچھی ہیں" سب آگے پیچھے بول اٹھے۔

یہ نصیر میاں جو تھے، اب تو جیسے کچھ بھی تھے، تھے! مگر جوانی میں ان کا بڑا زور تھا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت من کو نہ بھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے اوپر ہوتے کو آئے مگر اب تک بھی آدم بنے کسی گمنام حوا کو کھوجتے رہتے۔ ہزاروں ہی بھلی بری صورتیں تو آنکھوں سے گزری ہوں گی، مگر دل پر کوئی نہ چڑھی۔ بڑی چچی کے قریبی سگوں میں آتے تھے۔

بڑے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی چوڑی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو۔ کتے والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیزداری تھی مگر آنا جانا سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی فیصر میاں کے باپ علی گڑھ جا کر پڑھ آئے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی لانبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے، اور ایک فوٹو بھی تھا۔ کالا کالا جبہ سا پہنے، سر پر ترچھی ٹوپی لگائے پورے خاندان والوں میں وہ فوٹو گھومتا پھرا۔ اور کئی لوگوں نے تو کچھ آس بھی باندھ لی۔ مگر بیچ میں یہ کتے آن پڑے۔ علی گڑھ سے آتے آتے انور میاں اپنے ساتھ ایک ولایتی کتا اور کتیا لے آئے تھے، جو ان کو کسی انگریز دوست نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جھبرے کتے کہ دور سے دیکھو تو شیر سے نظر آتے۔ اس زمانے میں پورے خاندان پر دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے۔ دو دو حج کیے وہ الگ۔ مہینے کے چار پانچ روزے تو کہیں نہیں گئے تھے۔ ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے ساتھ کتے بھی اٹکا لائے ہیں تو پہلے پیار دلار سے سمجھایا کہ "دیکھو میاں جس گھر میں کتے ہوں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔ فضول ناپاکی ہوتی ہے۔ بڑا نجس جانور ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے" مگر انور میاں کہاں سننے والے تھے؟ ادھر باپ کی ضد! اُن کا گھر میں آنا جانا ہی بند ہو گیا۔ اب یہ بات اتنے غصے پتے کی بھی نہ تھی، مگر غصہ میں ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔ دادا حضرت نے جڑ ہی اکھاڑ پھینکی اور ان کو گویا ذات باہر ہی کر دیا۔ انور میاں بھی دھن کے، زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی ضد کے ایسے پکے تھے کہ ذرا کبھی تو اثر نہ لیا اور اوپر سے غیر کفو کی بیگم بھی بیاہ لائے۔

انور میاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھر والے طعنے سے۔ "اجی وہی کتّے والے سید انور" کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ مٹتے مٹتے انور میاں کا نام ہی "کتّے والے سید صاحب" پڑ گیا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتے تو پالے، مگر کیا ہے جو اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ دیوان خانے کے باہر ہی ایک چبوترہ سا بنا دیا گیا تھا۔ جہاں دن بھر یہ دونوں کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پرچھائیاں لیا کرتے تھے۔ یوں تو علی گڑھ سے انگریزی پڑھ آئے تھے، ڈھیر ساری کتابیں چاٹ ڈالی تھیں۔ مگر تھے وہی سچے سیدھے مسلمان۔ اور خود ہی تو بولتے۔

" ارے میاں یہ علم ہمیں یہ تھوڑی ہی سکھاتا ہے کہ اپنا دین اور مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں۔" یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی کبھی کبھار پہن لیتے، مگر مرتے مر گئے، وضع داری نہ چھوڑی، وہی شرعی پاجامہ، کھلی آستینوں کا کرتا، چار کلی والا۔ سر پر رام پوری کالی ٹوپی اور ہاتھ میں نانا باوا کی دی ہوئی چھڑی۔ صبح کی نماز بھی شاذ ہی قضا ہوتی۔ ہاں عشاء کی نماز میں اکثر غیبہ مار دیتے۔ بولتے "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی گنگی آجاتی ہے آنکھوں میں۔"

انہی کی اولاد یہ نصیر میاں تھے۔ جیسا بیج ویسا پودا۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کہاں کی کہاں پہنچ رہی تھی۔ مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے۔ باپ چڑ چڑاتے۔

"ارے کم بخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ سونگھ کر چھوڑ دے۔" ہنس کر رہ جاتے۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہو گئے تھے، یہ ابھی تک پتنگیں اڑاتے پھیرتے تھے۔ کہتے تھے۔

" جب تک کنوارے ہو، بچے ہو! شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا۔"

اپنے بھائے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے۔

شام کو چار بجے رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو ماں نے کہلوا بھیجا۔

"اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا۔" رؤف میاں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ اب شجو ماں جان جان کر پہاڑے بھولنے لگیں حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نصیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

"واہ بھئی واہ۔ یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دونی بتیس ہوتے ہیں۔ آپ چھتیس بتا رہی ہیں۔" یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکراہٹوں پر سے راشن اٹھ گیا تھا۔ جی کھول کے مسکراتی، قہقہے لگاتی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی، شجو ماں سوچتی، کہ ہزار منتوں سے پکارنے کے باوجود ایک بھی کوا تو نہ اڑا تھا۔

اور پھر بڑی انہونی سی بات یہ بھی ہوئی کہ شجو ماں نے بقرعید پر اپنی پسند سے ہری بانکیں پہنیں، ان کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے گوٹے چڑھوائے، اور پیسے ادا کر منہارن کو جب سلام کیا تو اس نے بھی دل بھر کے دعائیں دیں۔

"اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے۔ جی کے ارمان نکالے۔ ہمارا بھی بھلا ہوئے۔" اور شجو ماں جو کسی کے بھی منہ سے یہ دعائیں سن سن کر سفید پڑ پڑ جاتی تھی، شرم سے تپ کر دودھ میں ابلی گاجر کی طرح لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجو ماں، جو پورے خاندان میں گھنّی مشہور تھی ٹھیل ٹھیل کر ماں سے کہتی۔

"اماں، آخر انور چچا نے کتے پال لئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا۔ مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا؟ اب کرنے والے تو مر کھپ کے مٹی میں مل گئے، فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ؟ آپ ان کے گھر آتیں جاتیں کیوں نہیں؟"

نصیر میاں جو بھابھی کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبریں لیتے رہتے۔ کبھی کھانا۔ کبھی چائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شجو ماں جو ساری دنیا سے منہ موڑے راہبہ بنی بیٹھی تھی، پھر آدم حوا کی ہنستی گاتی دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی ہوا کہ نصیر میاں کو کھانے پر روک لیا اور خود ہی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آ گیا۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے" نصیر میاں مسکرا کر بولے۔ "آپ بھی دعا کیجئے۔"

صاف اشارہ تھا! اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ شجو ماں شرما گئی۔ منہ تپ گیا۔ آنکھیں اٹھا کر بولی۔

"آپ کوشش کیجئے۔ میں دعا کروں گی آپ کے لئے۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کتے والے سید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی۔ اور جو سنسنی خیز خبریں سننے اور سنانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جو ان بیاہی ہے۔ کے ہاں جا جا کر بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونے والی ہے۔

لاکھ بات بھی ہونے والی تھی، مگر تھی تو کنواری ہی شجو ماں! ماں نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی، مگر ملے نہیں۔ شجو ماں ایسی دیسی عمر اور چال کی تو تھی نہیں کہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی۔ بولتیں بھی کیا؟ پھر بھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں۔

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی۔ ہماری پھوپھی بی بیاہی بھری، دو بچوں کی ماں، صاف لگا ہی دیا لگانے والوں نے کہ انو میاں سے ہنستی ہیں۔ انو میاں ان کے رشتوں کے بھائی ہوتے تھے۔

شبو ماں نے سنا ضرور، مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا مسکرا کر بات کرتے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بات کرتے ہیں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بیچارے، ورنہ ہزار بار تو گھر توڑ تنہائیاں میسر آئیں۔ کوئی جیسے ہوتے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا، مگر انہوں نے کبھی تو ہاتھ تک نہ لگایا۔ پان بھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے۔

"وہاں میز پر رکھ دیجئے، ابھی حساب میں الجھا ہوا ہوں۔"

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شبو ماں کے دل میں دگنی ہو گئی تھی۔

شبو ماں کی دھندلائی آنکھیں، جو نیند سے بیگانہ تھیں، اب سپنے دیکھتیں۔

ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکرا رہا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا۔ پھر نظر آتا کہ پیچھے پر کھڑی کوؤں کے پیر میں سونے کی پائلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوے اپنے کالے کالے پر پھٹ پھٹاتے کائیں کائیں کرتے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ پروں کی پھٹ پھٹ اتنی تیز ہوتی کہ شبو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔

شہر ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سنائی تھی۔ آج وہ پھر پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں۔

"ہاں۔ بیچاری شہزادی۔ تھی نانصیبوں کی پوری۔ شہزادے کو ہر ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا پلایا، اس کی محبت اپنے دل میں پالی۔ اور آخر کو وہ دغا دے گیا۔ پیارا دن پٹیا کبوتر کی طرح پھر سے اڑ گیا یہ کہہ کر کہ۔

چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کروں گی۔ اب اس کے جوتے سفر میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم!"

آج اسحاق چچا کلائمیکس میں گڑبڑ پیدا کرنے عین موقع پر نہ ٹپکے۔ بڑے آرام سے آئے، ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بولے۔

"کیا زور دار شادی کی بھئی۔ دلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا"۔

"کس کی شادی کا ذکر ہے میاں؟ بڑی چچی جھپکیاں لیتی پڑی تھیں کروٹ بدل کر بولیں

"ارے آپ کو نہیں معلوم! نصیر میاں کی شادی سے تو آ رہا ہوں"۔

"ہائیں!" بڑی چچی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "نصیر میاں کی شادی؟ - ہمیں تو رقعے بھی نہیں آئے مگر۔۔۔۔۔۔"

اسحاق میاں نے بہن کی زور دار گالی دی۔" وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نا۔ وہ تو ہم سے کانٹے کھاتا ہے۔ مجھے تو جلیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے"۔

"کس کی بیٹی کی؟" بڑی چچی نے ڈوبتے لہجہ میں پوچھا۔

"عنبر گُل کی ہے۔ نواب جانی کی پوتی ہے نا۔ اتنے دنوں سے یہی تو جھنجھٹ چل رہی تھی۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام!"

"ہاں تو بھئی وہ کہانی ختم ہوئی۔ اب یہ دوسری سنو۔ ایک تھا......"

"دادی بی!" آنسو بھری آنکھیں لئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے شبّو ماں پوری طاقت سے چلا اٹھی، "آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجئے۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں۔"

شبّو ماں اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدوں کی آڑ میں کر لئے۔

"اوئی — میں نے کس کی زندگی تباہ کی؟ کہانی جیسی کہانی تھی، سنا دی۔ اے لو اور سنو۔" اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں۔

اک دم شبّو ماں کے سارے بال سفید پڑ گئے۔ چوڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں۔ آنکھیں دھندلا گئیں اور گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شبّو ماں نے بغدادی قاعدہ اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی۔

"پڑھو میرے بچو!

الف سے انار۔

بے سے بکری۔

تے سے تلوار۔"

گلستاں سے قبرستان تک

اور اسی رات منو بچا شہر روانہ ہو گئے

سوچ رہی ہوں اس کہانی کو کس طرح شروع کروں؟ اگر یہ کہانی کسی راجہ یا رانی سے متعلق ہوتی تو بلاشبہ میں وہی روایتی اندازِ بیان اختیار کرتی۔

"ایک تھا راجہ، اس کی تھی ایک رانی۔"

مگر بڑی بات تو یہی ہے کہ یہ راجہ رانی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ میری کہانی ہے۔ یہ میری دادی اماں کی کہانی ہے جو رانی نہیں تھیں عام انسانوں جیسی انسان تھیں۔ جن کے دل میں ماں تھی، پیار تھا اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے، اپنے بچوں سے، اس گھر سے جو کسی زمانے میں کسی طرح ایک محل سے کم نہ رہا ہو۔ مگر آج ایک کھنڈر ہے۔ یہ کہانی اسی کھنڈر سے متعلق ہے اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں لوٹی تھی۔

گاڑی "گلستان" میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے یوں ہی نظر اٹھا کر بڑے پھاٹک کی طرف دیکھا اور میں کانپ کر رہ گئی۔ ہمارا یہ پرانا مکان، جس میں نہ جانے ہماری کتنی پشتیں زندگی بسر کر چکی تھیں۔ اب اس کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ کلس اور مینارے جھڑنے لگے تھے۔ سفیدی جگہ جگہ سے کھرچ گئی تھی اور در و دیوار پر عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی بان نے زور سے قمچی چلائی اور بیل دھڑ دھڑ کرتے پھاٹک سے گذر کر "گلستان" میں داخل ہو گئے۔ ٹپ ٹپ دو آنسو میری آنکھوں سے گر پڑے

اور میں بوجھل دل لے کر گاڑی سے کود پڑی۔

دادی اماں اپنا پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ سامنے صافی پر ہرے ہرے پان بچھے ہوئے تھے اور وہ بڑے اطمینان سے کتھا چونا تھوپ رہی تھیں۔ سب سے پہلے میری توجہ جس چیز نے کھینچی وہ چاندی کے اس بڑے سے پاندان کی کلھیاں تھیں جن میں برائے نام چھالیہ کی دو تین ڈلیاں اور دس بارہ لونگیں پڑی تھیں۔ ابھی آنکھوں کی نمی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میری آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔ میں نے دادی اماں کو سلام کیا۔ انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کر زور سے لپٹا لیا۔ ایک دم میں نے محسوس کیا کہ دادی اماں بے حد دبلی ہو گئی ہیں۔ پہلے جب وہ یوں مجھے لپٹا لیا کرتی تھیں تو مجھے ان کی صحت کا احساس ان کے نرم اور دبیز بازوؤں سے ہوا کرتا تھا مگر اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ بھرے بھرے بازو اب لکڑی سے زیادہ سخت ہیں۔

"دادی اماں یہ اتنے سارے پان کس لئے بنا رہی ہیں آپ؟" میں نے اپنی رقت چھپانے کے لئے بے معنی سا سوال کر ڈالا۔

دادی اماں کی بوڑھی آنکھیں ایک لمحے کو چمکیں، پھر وہ دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔

"سیٹھ صاحب آئے ہیں۔" ان کی مسکراہٹ میں درد گھلا ہوا تھا۔

"سیٹھ صاحب!" میرا ماتھا ٹھنکا اور دل دھڑک کر رہ گیا۔ "کیوں خیر تو ہے؟" میں گھبرا کر بولی۔

"مکان کا جھگڑا چل رہا ہے سارا۔" وہ بیزاری سے سروتہ چلاتے ہوئے بولیں۔

میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ دادی اماں کی کمزور انگلیوں میں اتنی بھی تو سکت نہ رہ گئی تھی کہ چھالیہ ہی کاٹ سکیں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے سروتہ لے لیا۔

"لائیے دادی اماں، میں چھالیہ کاٹتی جاؤں اور آپ مجھے یہاں کی باتیں سنائیے۔ اتنے دنوں بعد لوٹی ہوں، میرا دل چاہ رہا ہے خوب سی باتیں سنوں اور سناؤں۔"

"گلستان رہن رکھ دیا گیا ہے۔" دادی اماں نے ابھی جملہ پورا بھی نہ کیا ہوگا کہ سروتہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔

"گلستان رہن رکھ دیا گیا ہے! مگر یہ ہوا کیسے؟" میں چیخ اٹھی۔

"سب قسمت کی بات ہے بیٹی۔" اور دادی اماں سر جھکا کر گلوریاں موڑنے لگیں۔

بڑے چچا، منو چچا اور میں اس رات بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آدھی رات گئے جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بازو والے کمرے میں دادی اماں سو رہی تھیں۔ اس کے بازو والے کمرے میں بڑے چچا، اور داہنے ہاتھ والے کمرے میں منو چچا سو رہے تھے۔ پھوپھی کے کمرے میں بتی جل رہی تھی مگر تھوڑی دیر بعد وہ بھی بجھ گئی۔ سارا گھر سو رہا تھا اور میں پڑی جاگ رہی تھی۔ میں دھیرے سے اپنے پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔ سفر کی تکان سے میں نڈھال تھی، اور یوں اصولاً مجھے اس وقت گہری نیند میں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر گلستاں کے ٹوٹے ہوئے کلس میری نگاہوں میں تھے۔ ہماری دوکانیں، ہماری زمینیں، ہماری جائداد؟ یہ سب کدھر ملیا میٹ ہو گئیں۔ ان کی آمدنی کیا ہو گئی کہ اب یہ نوبت آگئی تھی کہ گھر شکستہ حالت میں پڑا تھا۔ مگر انھیں مرمت کے لئے پیسہ نہ جڑ رہا تھا؟ میری آنکھوں میں دھند سی چھانے لگی۔ شاید یہ آنسو ہی تھے!!

میں نے سرہانے سے قندیل اٹھائی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔ سب سے پہلے میں بڑے دالان میں گئی۔ رات کے اندھیرے میں بھاری بھرکم ستون بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ میں نے قندیل اوپر اٹھائی اور دیکھا جگہ جگہ سے ہر سفیدی جھڑ چکی ہے اور جھڑ رہی ہے۔ میں نے قندیل پھر نیچے کر لی۔

دیوان خانے کے دروازے پر میلا میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر

پردے کو آہستگی سے تھاما اور اپنے گالوں پر رگڑنے لگی۔ بڑی محویت کے عالم میں میں بہت دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ پھر میں نے قندیل اٹھا کر دیکھا۔ پردے میں جگہ جگہ سوراخ ہو رہے تھے اور ایک جگہ بہت بڑا پیوند لگا ہوا تھا۔ میں نے دھیرے سے پردہ چھوڑ دیا۔ گرد کا ہلکا سا بادل اٹھا اور میں نے منہ میں پلو ٹھونس لیا۔

ایک ہاتھ میں قندیل اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پائنچے سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی۔ اب سامنے والا کمرہ میری نظروں کی زد میں تھا۔ یہاں ہمیشہ سے ہمارے خاندان کی لڑکیاں مایوں بٹھائی جاتی رہی تھیں۔ یہاں ان کے مہندی لگائی جاتی، مسی لگائی جاتی، یہاں ان کے سہاگ چڑھتا۔ آرسی مصحف ہوتا اور یہ کمرہ دلہنوں کے ساتھ ساتھ سراپا دلہن بنا رہتا۔ یہاں ریشمی پھولدار اطلس کے سرخ پردے لٹکے ہوتے۔ مالن روزانہ پھولوں کے گجرے اس کے دروازے پر لٹکا جاتی۔ خوشبوؤں اور پھولوں سے مہکا مہکاتا یہ کمرہ! میں نے قندیل اٹھائی دیواریں میلی اور ان میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ پردے سرے سے ندارد اور پھولوں کی خوشبو کی بجائے ایک بدبو کا بھبکا میری ناک میں گیا۔ میں نے قندیل اندر کی اور دوسرے ہی لمحے باہر کھینچ لی۔ دو آنسو میری آنکھوں میں امنڈ آئے جنھیں میں بڑی خوبصورتی سے پی گئی۔ اندر کتیا نے بچے دے رکھے تھے۔

پھر دھیرے دھیرے میں قندیل لئے تمام کمروں میں گھومتی رہی۔ میرے غرارے کے پائنچے آہستہ آہستہ یوں سرسرا رہے تھے گویا سسکیاں سی لے رہے ہوں۔ میں دھیرے دھیرے سے پچھواڑے کے حصے میں نکل آئی جہاں پھولوں کے درخت تھے، پھلوں کے درخت تھے اور ننھے منے رنگ برنگی پھولوں کے پودے تھے۔ یہ پچھواڑہ جہاں لڑکیاں جھولے جھولتیں، پیا ملن کے گیت گاتیں۔ برہ کے راگ چھیڑتیں اور ہلستیں بولتیں۔ مگر اب یہ سوکھ

چلے تھے۔ صرف نیم کا درخت باقی رہا تھا جس کی ایک مضبوط سی ڈال سے ایک بوسیدہ سی رسی لٹک رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی مضبوطی دیکھنی چاہی تو وہ ایک جھٹکے سے میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ پھولوں کے پودے بے برگ و بار تھے۔ میں نے قندیل چبوترے پر رکھدی اور خود وہیں بیٹھ گئی۔ اپریل، مئی کا صاف نیلا آسمان میرے سر پر تھا۔ غم ناک سی ٹھنڈی ہوا تھی۔ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تارے اور اداس چاند سارا ماحول مجھے گلستاں کی بے بسی پر ماتم کرتا نظر آیا۔ میں نے پتھر پر سر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ گھر —— یہ محل —— یہ گلستاں —— ہمارے اسلاف کا بنایا ہوا پر شکوہ مکان —— جس میں جانے ہماری کتنی پشتیں گزریں۔ اگر کوئی اینٹ بھی جھڑ گئی تو ہم نے اپنا خون پانی کر دیا۔ اب اس حالت میں پڑا ہے کہ رہن ہے اور اینٹیں جھڑتی ہیں تو چونا گارا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ آج رہن پڑا ہے کل نیلام اٹھے گا۔ اور ہماری عزت، برسوں کی محبت اور اس کے چپے چپے سے کیا ہوا بے لوث پیار سٹ جائے گا۔ اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور پھر کون جانے ہمارا کیا حشر ہو؟۔ اور دادی اماں۔ جنھیں بڑے چچا، منو چچا، پھوپھی سے بھی شاید اتنی محبت نہ تھی جتنی اس گھر سے۔ اس محل سے، جو اب کھنڈر ہوتا جا رہا تھا۔ کیا دادی اماں کو اس کا احساس نہ تھا۔ یا پھر روزانہ دیکھتے دیکھتے وہ اس کی زبوں حالی کی اتنی عادی ہو گئی تھیں کہ انھیں فرق ہی محسوس نہ ہوتا تھا! گلستاں کو رہن رکھنے کی غرض و غایت جب مجھے معلوم ہوئی تو ایک لمحے کو میں بھونچکی ہی رہ گئی۔ مکان رہن رکھ کر مکان کی مرمت کو پیسہ حاصل کرنا!! اتنی مضحکہ خیز بات تو میں نے کبھی نہ سنی تھی۔

"زمینداروں کے قرضوں، دکانوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اماں گھر کی مرمت

کروانا چاہتی تھیں، اور اسی لئے اسے رہن رکھ دینا پڑا۔" منو چچا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں باوجود غصہ کے بھی مسکرانے سے باز نہ رہ سکی۔ مگر میری مسکراہٹ میں نشتر چھپے ہوئے تھے۔ مگر یہ نشتر میرے ہی سینے میں پیوست ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ گلستاں کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ اتنی طویل مدت کے بعد آج میں گاؤں لوٹی، اور گلستاں کو دیکھا تو پاگل ہو اٹھی۔ میں، جسے اس مکان سے کوئی خاص انس بھی نہ تھا۔ مگر دادی اماں، جو ایک بچے کی طرح اس کے چپے چپے کی دیکھ ریکھ کرتی رہتی تھیں! دادی اماں کے سوکھے بازو، جھریوں بھرا اداس چہرہ اور نم نم سی آنکھیں، میری آنکھوں میں گھوم گئیں۔ قندیل ایک لمحے کو زور سے بھڑکی، تھوڑی دیر بھڑکتی رہی اور بجھ کر رہ گئی۔

میرا دل کانپ گیا۔

پرانے وقتوں کی لے دے کے دو چار چیزیں ہی ایسی رہ گئی تھیں جنہیں دادی اماں متاع گم شدہ کی یادگار کے طور پر سینے سے لگائے ہوئے تھیں۔ چاندی کا بڑا سا پاندان! منو چچا کی ہونیوالی دلہن کا جڑاؤ گلوبند! پھوپھی کے دولہا کی انگوٹھی، جس میں سچا ہیرا جڑا ہوا تھا اور خود دادی اماں کے کانوں کی ہیرے کی لونگیں جو دادا ابا نے آج سے سالوں پہلے دادی اماں کا منہ دیکھ کر پہلی رات کو پہنائی تھیں۔ ان چیزوں کا بچ رہنا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ دادی اماں کو انتہائی عزیز ہیں جنہیں وہ کسی صورت اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتیں۔

پھوپھی بیمار پڑیں، اور ایسی پڑیں کہ ان کے کنوارے اور معصوم سپنے سدا کے لئے بکھر کے رہ گئے۔ جانے کب سے وہ دق میں گھل رہی تھیں! بظاہر وہ ہنستیں، بولتیں، کھاتیں، مگر ان کے ہر انداز سے ایک بے نام سا غم ٹپکتا۔ کسی نے سمجھا، کسی نے نہ سمجھا مگر میں سمجھ گئی کہ اس ماحول میں جو بھی ایسا حساس، دل لے کر پیدا ہو گا وہ یقیناً دق میں مبتلا ہو جائے گا۔ ان کے دولہا کے لئے ہیرے کی انگشتری دادا ابا نے

بطور سلامی دینے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ بیماری کے علاج کے لئے کسی نے اس کو توڑنے کے بارے میں سوچا تک بھی نہ تھا۔ اور جب کنوارپنے کی ساری حسرتیں اور ارمان سمیٹے کپھوپھی ہمارے خاندانی قبرستان میں جا سوئیں تب بھی کسی نے یہ نہ سوچا کہ انگوٹھی توڑ ہی لیتے تو علاج کروانے کی حسرت تو دل سے نکل جاتی! مگر ان کی موت کے چند ہی دنوں بعد میں نے دیکھا کہ دادی اماں نے وہ انگوٹھی نکالی اور سوئیں بیچ آئیں۔ گارا، مٹی، چونا سارے گھر میں بکھرا نظر آنے لگا۔ گلستاں کی مرمت ہو رہی تھی۔

دادی اماں کی دیوانگی دیکھ دیکھ کر رونا تو بڑی بات ہے میں ہنس بھی نہ سکتی تھی۔ وہ اس گھر کے پیچھے خود کو لٹانے پر تلی ہوئی تھیں۔ منو چچا نے بتایا تھا " اماں نے گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز! زیور، برتن، بھاری کپڑے وغیرہ توڑ ڈالے ہیں! بیچ ڈالے ہیں۔ ہر سال مرمت کرواتی ہیں مگر گھر پہلے سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چاہتی ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے یہ گھر نہ اجڑے، یہ اینٹیں نہ ٹوٹ ٹوٹ کر گریں! چونا نہ اکھڑے! مٹی نہ جھڑے۔ مگر بادل پھٹے تو کون پیوند لگا سکتا ہے؟" منو چچا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ "پہلے پہل جب اماں کو پتہ چلا کہ مکان رہن رکھ دیا گیا ہے تو بہت چڑچڑائیں مگر جب اس کی مرمت کے لئے ان کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں تھما دی گئیں تو وہ یوں خوش ہو گئیں جیسے مکان رہن سے چھوٹ گیا ہو۔"

یہ تو میں بہر صورت جانتی تھی کہ اب مکان نیلام ہو کر رہیگا۔ مگر دادی اماں اسے اب تک پہلوٹھی کے بیٹے کی طرح چاہے جا رہی تھیں۔ مٹی، گارا اور چونا ختم ہو گیا اور مکان کی آدھی مرمت بھی نہ ہو سکی!۔

"دادی اماں گلس تو بالکل برباد ہو گئے ہیں۔" میں نے اوپر نگاہ اٹھائی اور

دادی اماں کو مخاطب کیا جو اس وقت نیم کے جھاڑ کو پانی دے رہی تھیں۔ دادی اماں روزانہ سارے سوکھے، بن سوکھے مرجھائے جھاڑوں پودوں کو بلاناغہ پانی دیتیں۔ پھول مسکرانا بھول چکے تھے۔ پتیاں جھومنا بھول چکی تھیں۔ ڈالیاں کبھی اپنے وزن سے نہ لچکتیں۔ مگر دادی اماں اپنے فرض کو پوری پابندی اور تندہی سے انجام دیتیں۔ پھر بھی جانے کیسی آگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی کہ پھولوں پودوں پر بار نہ آتا۔

"کلس برباد ہو گئے!" وہ حیرانگی سے بولیں۔ "کہاں دیکھے تونے؟"

مجھے اک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ دادی اماں پستیوں کو بلندیوں تک لے جانے پر تلی ہوئی تھیں۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ بلندیاں آپ زمین سے ہمکنار ہونے جھکی چلی آ رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں پر سوکھے ہاتھ کا پردہ تانا اور گردن اٹھا کر اوپر دیکھنے لگیں۔ کنگورے جھڑ رہے تھے، کچھ جھڑ چکے تھے اور پیپل کے وہ چمکدار کلس، جو دھوپ میں سونے کے مانند چم چم چمکا کرتے تھے، مدھم پڑ چکے تھے اور دو تین جگہ سے ٹوٹ گئے تھے۔

دادی اماں نے جھارا وہیں رکھ دیا اور کانپتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ دوسرے دن منو چچا کی ہونے والی دلہن کا گلوبند ہاتھ میں لئے نظر آئیں تو میں باوجود کوشش کے اپنے کو سسک سسک کر رونے سے باز نہ رکھ سکی۔

میں نے طے کر لیا کہ اب پڑھنے نہیں جاؤں گی بس بہت پڑھائی ہو چکی۔ دور رہ کر میں قطعاً نابلد تو نہ تھی کہ میرے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں۔ مگر اتنی گہرائی سے تو میں نے ہرگز ہرگز نہ سوچا تھا۔ بارشیں شروع ہو چکی تھیں اور گلستاں کی ہر اینٹ، ہر شہتیر رحم کی درخواست کرتا نظر آتا۔ میں نہ مہنوں والے کمرے میں جھانکتی تو مجھے وہاں پھوپھی نظر آتیں۔

ہاتھوں میں گجرے، پیروں میں پازیبیں، پتلی پتلی انگلیوں میں جگمگاتی انگوٹھیاں اور گلے میں وہی جڑاؤ گلوبند، سرخ سرخ کپڑے پہنے، وہ جھینپتی جھینپاتی کیسی گڑیا سی لگتیں۔ اور پھر بادل گرجتے، بجلی چمکتی تو مجھے تصور حقیقت کی دنیا میں لا پٹکتا۔ چونا جھڑتا ہوا کمرہ، بوسیدہ دیواریں اور اطلس پردوں کی بجائے کھدر کا پیوند لگا پردہ۔ موتیا اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو کے بدلے بدبو کے جھونکے آتے اور پردہ اڑتا تو میں دیکھتی اندر کتیا اپنے درجن بھر بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔

میں نے ان دنوں کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ زندگی کے بارے میں اتنے منفی پہلو سے میں نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔

دادی اماں بیمار ہی تھیں، مگر بیماری نے زور پکڑا تو بستر سے لگ گئیں۔ چاندی کا پاندان، گلوبند اور انگوٹھی تو اب گلستاں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اب ان کی لوؤں میں سہرے چمکا کرتے وہ بار بار گرتی دیواروں اور بوسیدہ چھتوں کو دیکھتیں اور اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتیں۔ کانوں پر اس طرح ہاتھ رکھنے کا مطلب میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ کیا وہ دادا ابا کی پہلی اور آخری نشانی کو ہمیشہ کے لئے بچا رکھنا چاہتی تھیں؟۔ یا پھر وہ اس لئے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھیں کہ اب سے کبھی گلستاں پر کچھ نہ خرچ کریں گی۔ میں ان کے سرہانے بیٹھی ان سے پرانے دور کی باتیں سنتی رہتی جب کہ گلستاں صحیح معنوں میں گلستاں تھا اور یہاں کی ہر چیز صحیح معنوں میں سرسبز۔

"دادی اماں! مکان تو رہن پڑا ہوا ہے، پھر آپ اس پر اتنا بے بھاؤ کیوں خرچ کرتی ہیں؟" ایک دن میں نے بہت جھنجھلا کر دادی اماں سے پوچھا۔

"رہن ہے تو کیا ہوا؟" دادی اماں یقین اور اعتماد سے بھرپور ہنسی ہنسیں۔ "اری بیٹی آج رہن ہے، کل تو رہن نہیں رہے گا!"

میں کانپ اٹھی۔ دادی اماں اس منزل پر پہنچ کر بھی "کل" سے بھی امیدیں وابستہ رکھتی ہیں۔ میرا دل چاہا کہہ دوں۔

"دادی اماں کل کے بھروسے پر نہ رہیئے۔ آج تو ہم سر چھپائے بیٹھے ہیں، کل کو شاید یہ سہارا بھی نہ رہ جائے۔ گلستاں نیلام ہو جائیگا، پھر کیا ہوگا؟"، گھر نیلام ہو جائے گا! اس کے آگے میں نہیں سوچ سکتی تھی ـــــ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"پھر بھی دادی اماں، اتنے پرانے مکان پر اتنا پیسہ اٹھانا ٹھیک نہیں تھا۔" میں نے پرانی چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

اور دادی اماں تڑپ اٹھیں۔ "ٹھیک نہیں تو کیا گھر کو گر جانے دوں؟ یہ عزت جو بچی ہوئی ہے اسی کے سہارے ہے۔ صدیوں کی بنی عزت یوں لٹ گئی تو؟" دادی اماں زور زور سے چلا چلا کر مجھے سنانے لگیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کے کان سن ہو گئے تھے۔ اور وہ بہری ہو گئی تھیں۔ ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر بات کہنی پڑتی، تب وہ سنتیں اور جواباً زور زور سے بات کرتیں۔

"میں ذرا اچھی ہو جاؤں، پھر میں موتیا کے پودے لگواؤں گی۔ اور پھاٹک کے پاس جو آم کا پیڑ ہے اس میں کھاد ڈلوانی ہے۔ وہ نیم کا پیڑ تو بالکل برباد ہوا جا رہا ہے۔ منو بیٹے سے میں نے کہا بھی تھا باغبانی پر کوئی اچھی سی کتاب منگائے۔ تمہارے دادا کو کتنا شوق تھا نئے نئے پودے اور پھلوں کا!"

بادل گرج رہے تھے بجلیاں چمک رہی تھیں۔ میں گھٹنوں میں سر دیئے ساکت و صامت بیٹھی تھی اور دادی اماں باتیں کئے جا رہی تھیں۔ "میں آم کے پیڑ میں کھاد ڈلواؤں گی!" یہ کل پر اعتبار!۔

اور ایک اداس سی شام کو نیم کے سائے تلے میں فانی کو پڑھنے بیٹھی تو میں نے محسوس

کیا اگر میں نے کتاب بند نہیں کر دی اور اس بوجھل سائے سے اٹھ نہ بھاگی تو پھر کبھی دوبارہ سانس نہ لے سکوں گی۔ آسمان پر جو گھٹائیں چھاتیں ان کا مقابلہ میں اپنی ان گھٹاؤں سے کرتی جو میری آنکھوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔

دادی اماں فرسیش تھیں۔ گلستان کی دیواروں سے مٹی تو ہر دم ہی جھڑتی رہتی۔ ہر لمحے یہ محسوس ہوتا گویا یہ محل دھڑام سے زمین پر آ پڑے گا۔ بارشیں بہت ہو چکی تھیں۔ بوسیدہ دیواروں میں پانی ٹھیر گیا تھا اور آدھی اونچائی تک دیواریں نم ہو گئی تھیں۔ ہر لمحے اس بات کا خطرہ تھا کہ کوئی نہ کوئی دیوار دھم سے گر پڑے گی۔

ایک دن میں دادی اماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ منو چچا اور بڑے چچا دیوان خانے میں بیٹھے سیٹھ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ شیخ صاحب بلند آواز سے چیخ رہے تھے اور بار بار میں کانپ اٹھتی تھی۔ رہن کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ سیٹھ صاحب جتانے کے لئے آئے تھے کہ نیلام اٹھ جائیگا۔ یہی شرط رکھی گئی تھی اور نہ بھی رکھی جاتی تو انجام ہوتا بھی کیا؟ میں دم سادھے بیٹھی تھی مگر دل کانپ رہا تھا۔ اس لمحے میں نے شکر ادا کیا کہ دادی اماں بہری ہیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ سن لیتیں تو۔ اک دم دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ جیسے بہت دور کوئی چیز گری ہو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنا چاہا مگر کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا چیز گری ہو گی۔ مگر دوسرے ہی لمحے دادی اماں اپنا بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھیں "کوئی دیوار گری ہے گلستاں کی!" وہ اعتماد سے بولیں۔ "دیوار؟" میں حیرت سے بولی۔

دادی اماں بہری تھیں۔ بالکل بہری۔ یہ آواز انھوں نے کدھر سے سن لی؟۔ "آپ کو دھوکا ہوا ہو گا دادی اماں۔ یہاں تو کوئی بھی آواز سنائی نہ دی!"

دادی اماں نے اپنے سفید بالوں کو ہاتھوں میں جھلا کر کہا۔" یہ بال عمر کے ساتھ ساتھ سفید ہوئے ہیں گڑیا بیٹی۔ میرے دل میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے کہ کچھ ہوا ضرور ہے۔"

اور وہ چیلی پہنتی باہر کو نکل گئیں۔ ان کے اس طرح اٹھ بھاگنے پر میں اتنی حیرت زدہ رہ گئی کہ انھیں سہارا بھی نہ دے سکی۔ ان دنوں دادی اماں کو سہارا دیکر اٹھانا پڑتا تھا اور وہ بغیر سہارے کے ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھیں! ان کے پیچھے میں بھی لپکی۔ پچھواڑے کے دالان کے قریب وہ جا کر رکیں اور دھم سے بیٹھ گئیں۔ سامنے اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ دالان کے سامنے والی دیوار گری تھی۔

دادی اماں کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا گیا تو میں یہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ کبھی نہ اٹھ سکیں گی۔ مگر دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے جنھیں وہ پونچھتیں تو اور تیزی سے بہنا شروع ہو جاتے۔ رات ہو چکی تھی۔ آسمان پر جو اِکی دُکی بدلیاں تیر رہی تھیں انھوں نے گھٹاؤں کا روپ دھارن کر لیا۔ اور بوندا باندی ہوتے ہوتے زور سے بارش ہونے لگی۔ پھر دادی اماں نے اپنے کانوں پر ہاتھ پھیرے اور دھیرے دھیرے کیلیں کھولنی شروع کیں۔

"وہ دیوار اٹھا دینی چاہیئے منو بیٹا۔ گھر کھنڈر بن کر رہ جائے۔"

برسوں کا اٹوٹ بندھن ٹوٹنے کو جا رہا تھا۔ ان لونگوں میں جو ہیرے چمک رہے تھے وہ صرف ہیرے ہی نہ تھے۔ اس چمک میں ہیروں کی چمک بھی تھی اور محبت کی چمک بھی تھی۔ آرزوؤں، ارمانوں اور امیدوں کے اجالے اور چمک بھی تھی۔ یہ دولہا دلہن کا پیار تھا جو ہیروں کی شکل میں چمک رہا تھا۔ یہ وہ بندھن تھا جسے موت بھی نہ توڑ سکی تھی۔ دادی اماں نے چوڑیاں توڑ دی تھیں۔ پوت بکھیر دی تھی۔ رنگین کپڑے بھی اتار دیئے تھے۔ مگر لونگیں ان کے اپنے جسم کا ایک حصہ بن کر ان کے کانوں سے چمٹی رہیں اور آج دادی اس چمک کو، اس پیار کو، اس محبت کو بیچ رہی تھیں جو ایک

گھر سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وہ کیلیں کھول رہی تھیں۔ ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آسمان بھی رو رہا تھا۔ میں بھی رو رہی تھی۔ ہر ذرہ روتا نظر آ رہا تھا! اک دم منو چچا نے دادی اماں کے ہاتھ پکڑ لیئے۔

"اماں آپ یہ لونگیں نہیں اتاریں گی۔ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں!"

سائیں سائیں ہوائیں چل رہی تھیں معلوم ہوتا تھا دادی اماں کی ہچکیاں پر سسکیاں بھر رہی ہو۔

"دیوار گر گئی ہے بیٹا!" دادی اماں بدقت بول پا رہی تھیں۔ "دیوار گرتی ہے تو ایک عظمت گر جاتی ہے۔ دیوار گرتی ہے تو عزت بھی گر جاتی ہے۔ مٹی کے ساتھ ساتھ وہ پیار بھی گر جاتا ہے جو اس مٹی کے ذرے ذرے میں رچا ہوتا ہے۔ مگر لونگیں اترتی ہیں تو محل کی دیوار تو کھڑی ہو جاتی ہے۔ عزت بن جاتی ہے۔ پیار کا سر اونچا ہو جاتا ہے۔ یہ لونگیں جو......" اور وہ پھپھک پڑیں۔

"اماں!" منو چچا کو میں نے آج تک روتے نہ دیکھا تھا۔

"ان لونگوں میں بھی پیار رچا ہوا ہے اور ان مٹی کے ذرّوں میں بھی۔ بولو کونسا پیار زیادہ قیمتی ہے؟"

"اماں!" منو چچا اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں شہر جاؤں گا۔ اماں! وہاں نوکری کروں گا اور بہت سارا پیسہ جمع کر کے لوٹوں گا۔ پھر گلستان بھی چھوٹ جائے گا۔ اور آپ اس کی مرمت بھی کروا سکیں گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اماں میں ضرور آؤں گا۔"

"تو شہر جائے گا؟ نوکری کرنے؟ نہیں بیٹا، یہ ہمیں زیبا نہیں۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے نوکری نہیں کی۔"

"اماں یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ یہ قدریں پرانی ہو چکی ہیں۔ آپ یقین کیجیئے میں ضرور آؤں گا۔ مگر اماں آپ یہ لونگیں نہ اتاریئے۔ نوکری کرنا بری بات نہیں ہے۔ میں آؤنگا

میری اماں، اور پیسہ لے کر آؤں گا۔ میں ضرور لوٹوں گا اماں۔ کبھی نہ کبھی ضرور واپس آؤں گا۔ اتنا آپ یقین رکھئے۔" اور اسی رات منو چچا شہر روانہ ہو گئے۔

اب تک گلستان کی صرف ایک ہی دیوار گری تھی۔

دادی اماں اب تک فریش تھیں۔ اب تو وہ چلنا پھرنا بھی بھول چکی تھیں۔ گھر میں اکثر فاقے ہوتے۔ کبھی کھانا پکتا کبھی نہ پکتا۔ جو کچھ پکتا وہ دال پر مشتمل ہوتا۔ دادی اماں کبھی رات کو بھوکا نہ سونے دیتیں۔ ہر رات دال ہی پکتی، مگر ضرور پکتی۔ دادی اماں ہر رات دو روٹیاں اور ایک کٹورہ دال اپنے سرہانے والے محراب میں رکھوالیتیں۔

"میرا منو بیٹا آئے گا۔ کون جانے وہ بھوکا ہی لوٹے! وہ پہلے تو مجھی سے ملنے آئے گا۔ میں اسے سب سے پہلے کھانا کھلاؤں گی۔ پھر بات چیت ہو گی۔" اور روزانہ صبح سویرے میں وہ کھانا کسی فقیر کو دے آتی۔ جو اکثر گلستاں کے پھاٹک پر بیٹھے ہوتے۔

منو چچا کے زندگی سے بھرپور خط آتے۔ بڑی بڑی امیدیں، بڑے بڑے دلاسے اور ڈھارسیں۔ مگر کسی خط میں تو ایسا لکھا نہ آیا کہ "مجھے نوکری مل گئی ہے۔" یا یہ کہ "میں خوب پیسہ کما رہا ہوں اور جلد ہی لوٹوں گا۔" دادی اماں ان دنوں بڑے سنہرے روپہلے خواب دیکھتیں۔ ہر دوسرے تیسرے وہ مجھے بٹھا کر سناتیں۔

"بیٹی میں نے دیکھا منو اچھے اچھے کپڑے پہن کر موٹر پر بیٹھ کر گھر آیا ہے۔ موٹر اس کی اپنی ہے۔"

"خواب کی تعبیر سدا الٹی ہوا کرتی ہے۔ تجھے معلوم ہے یہ بات؟" ایک دن بڑے چچا نے دادی اماں کا خواب سن کر مجھ سے فکر مند لہجہ میں پوچھا "اور تجھے شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ پچھلے پہر کے خواب سدا الٹی تعبیر دیتے ہیں۔"

دادی اماں کی صحت گرتی چلی گئی۔

دو روٹیاں اور دال کا کٹورہ روزانہ کوئی فقیر لے جاتا رہا۔ منو چچا کے خط اکدم بند ہو گئے۔ دادی اماں ہر آہٹ پر چونک اٹھتیں۔ "دیکھو تو سہی منو تو نہیں آیا میرا۔" ان دنوں ان کا بہرہ پن بالکل دور ہو گیا تھا۔ سرگوشیاں تک سن لیتیں۔ ہم بات کرتے ڈرنے لگے تھے۔

اور ایک دن پھر دادی اماں خواب سنا رہی تھیں۔ "بیٹی اس کے جسم پر چمکیلے کپڑے تھے۔ جوتا اتنا چمکدار کہ اس میں صورت دیکھ لو۔ اس کی کلائی پر سونے کی گھڑی بندھی تھی۔ وہ اپنی ذاتی موٹر میں بیٹھ کر آیا تھا۔ اور اس کی جیبوں میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

"دادی اماں آپ نے یہ خواب کب دیکھا تھا؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"تیسرے پہر کو!"

میں کانپ کر رہ گئی۔

"اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ گلستان کی دیواریں نئی نئی ہیں۔ باغ میں پھول پودے جھوم رہے ہیں اور پھاٹک تو اتنا شاندار بنوایا ہے میرے منو بیٹے نے کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔"

میں سُن سُن کر کانپتی رہی۔

اور پھر کئی دن گذر گئے۔

زندگی اور بھی مہربان ہو گئی۔

اس اثنا میں ساری دیواریں گر گئیں۔ دیواروں میں پانی جذب ہو گیا تھا۔ کہاں تک سہارتیں؟ صرف پھاٹک باقی رہ گیا۔

اور پھر ہماری زندگی میں وہ دن بھی آیا کہ قرض خواہ ہمارے گلستان کی بولی اٹھا رہے تھے۔ صرف گلستان ہی نیلام نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ہر اس پیار بھرے لمحے کی بولی

اٹھ رہی تھی جو اس گھر میں بیتا تھا۔ اور یہ لمحہ صرف ایک ہی نے تو نہیں بتایا تھا۔ یہاں تو اسلاف کی پشتوں کی پشتیں پڑی تھیں۔ زندگی نیلام ہو رہی تھی! موت نیلام ہو رہی تھی۔

دادی اماں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بھلا گلستاں نیلام ہو سکتا ہے؟" ان کی سانس پھولنے لگی۔ "میرے جیتے جی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میرے کانوں نے سنا۔" بولی اٹھاؤ ـــ دو ہزار۔ بولی۔"

دادی اماں ہڑبڑا گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی کیلیں کھولنی شروع کیں۔

"کاش دادی اماں بہری ہوتیں۔" میں نے سوچا۔

گلستاں پر قبرستان کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

"منو بیٹا نہیں آیا؟" دادی اماں نے جیسے کہیں دور سے پوچھا۔ سوائے آنسوؤں کے میرے پاس کیا جواب تھا؟ بڑے چچا یوں سر جھکائے کھڑے تھے گویا کوئی بے جان بت ہوں۔

"سیٹھ کو یہ کیلیں دے دو ریاض بیٹا، مگر گھر بچا لو۔"

بڑے چچا نے تڑپ کر دیکھا۔ دادی اماں اب تک کیلیں کھول رہی تھیں۔ برسوں پہلے کی پہنی ہوئی لونگیں مضبوطی سے جم گئی تھیں۔

"اماں مکان اتنا سستا نہیں ہے۔" بڑے چچا بے بسی سے بولے۔

"دھڑ ـــ دھڑ ـــ" دادی اماں اور میں بری طرح چونک پڑے۔ بڑے چچا کھڑکی کی طرف دوڑے۔

پھاٹک گر چکا تھا اور منو چچا اب تک نہ لوٹے تھے۔

"بٹیا" دادی اماں کے منہ سے ایک سہمی ہوئی آواز نکلی اور ان کے ہاتھ کانوں

پر سے ہٹ گئے۔ کیلیں کسی حالت میں کھلنے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔

"چھ ہزار — چھ ہزار — ہے کوئی بولنے والا؟ ہے؟؟؟"

بولی چھ ہزار پر آ کر رک گئی۔

گلستاں نیلام ہو گیا۔ باغ اجڑ گیا۔ بہاریں لٹ گئیں!۔

دادی اماں نے گھبرا کر تکیے پر سر ٹیک دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لئے ہی موند لیں۔

صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ اُجالا پھیل رہا تھا مگر ہماری قسمت پر سیاہی چھا رہی تھی۔ گھر بک چکا تھا، نیلام ہو چکا تھا۔ اب کیا ہو گا؟۔

دادی اماں کتنے مطمئن انداز سے سو رہی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے ان کی نیند پر رشک سا آ گیا۔

ان کے سرہانے اب تک دال کا کٹورا اور دو روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بوجھل بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میں پھاٹک تک پہنچی جہاں مٹی اور اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑے پہنے گلستاں کی طرف پیٹھ کئے ایک فقیر کھڑا تھا دال کا کٹورا اور روٹیاں میں نے اس کی طرف بڑھائیں۔

"لو بھائی کھا لو اور مرنے والی کے لئے دعا کرو۔" دوسرے ہی لمحے روٹیاں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑیں۔

یہ منو چچا تھے۔!!!

کالے بادل

کھڑبڑ سے شکور کی آنکھ کھل گئی۔ تکیئے سے سر اٹھا کر دیکھا تو حمیدہ کھاٹ کے پاس کھڑی کھڑی، دیوار سے لگے تختے سے کوئی چیز نکال رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہے اتنی رات گئے؟" وہ وہیں پڑے پڑے بولا۔

"جانے پیٹ میں کیا گڑبڑ ہے۔ نہ لیٹا جائے نہ بیٹھا جائے اجوائن کھا رہی ہوں۔"

شکور تیزی سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ "پیٹ میں گڑبڑ ہے؟" وہ چیخنے کے سے انداز سے بولا۔

حمیدہ نے حیرت اور ذرا خوف سے پلٹ کر دیکھا۔ "ہاں ہاں! مگر تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ کیا پیٹ میں درد ہونا ایسی انہونی بات ہے؟"

وہ اس کی بات ٹال کر بولا۔ "یہ تو بتا تیرا کون سا مہینہ چل رہا ہے۔"

حمیدہ نے ذرا شرما کر سر نیہوڑایا اور پھر انگلیوں پر حساب جوڑتی ہوئی بولی۔ "اس چاند کو پورے آٹھ مہینے تو ہو گئے۔

"تو تیرے حسابوں یہ نواں چل رہا ہے نا؟" وہ تشویش سے بولا۔

"ہاں۔" وہ ذرا رک گئی۔ "پھر تمہارا مطلب؟"

"اری نیک بخت تو ہی تو کہہ رہا ہوں کہ پیٹ میں ساری گڑبڑ بچے کی ہے۔"

وہ اچک کر بولا۔ "اری تو کیسی ماں ہے کہ یہ تک پتہ نہیں چلا سکتی کہ درد کاہے کا ہے؟"

"ایسے کون سے میں نے دس بارہ بچے جن ڈالے ہیں کہ پتہ چلاؤں گی۔" وہ تنک کر

بولی۔ "اور تم بھی جانے کیا بک رہے ہو۔ ابھی تو مہینے پورے تو ہوئے بھی نہیں۔"

"رہی عقل کی بودی ہی بودی۔ اری پاگل، نویں کی چھاؤں پڑ جائے بس ہے۔ میں تو کہتا ہوں اب گھنٹہ دو گھنٹہ میں ہوتا ہی ہے بچہ! تیرا رنگ تو دیکھ پیلا پڑا جا رہا ہے۔" وہ تجربہ کار دائی کے انداز سے سر ہلا کر بولا۔

حمیدہ مچل گئی۔ "ہونہہ! رنگ پیلا پڑا جا رہا ہے۔ فاقے جو ٹوٹتے رہتے ہیں آئے دن، اس کا کوئی خیال ہی نہیں۔ اور کیا گالوں پر گلال برسے گا؟"

اس کی بات نہ سن کر شکور اپنی ہی ہانکے گیا۔ "ارے ارے کیا بری بات ہوئی۔ میرے قبر میں سونے کا دن اور تیرے بچہ جننے کا دن ساتھ ہی ساتھ پڑا۔ بھلا بچے کو چھوڑ کر میرا دل قبر میں کیسے لگے گا؟"

حمیدہ پیٹ کو دباتی ہوئی چلا پڑی۔ "دیکھو میں کہے دیتی ہوں آج سے تم یہ بیہودہ کام نہیں کرو گے۔ اتنے دن جو کر لیا سو کر لیا، مگر اب تم ایک بچے کے باپ بن رہے ہو۔ تمہیں میرا کوئی خیال نہیں، اپنے بچے کا تو آئیگا۔"

شکور چاپلوسی سے بولا۔ "میری رانی یہ تو تو نے ٹھیک کہا کہ قبر میں سوؤں نہیں۔ مگر پھر یہ تو بتا کہ کھائیں گے کیا؟ تو سمجھتی ہے تیرا مرد الیا ہی بڑا زمیندار ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" حمیدہ کا چہرہ اتر گیا۔ "تم نے سدا اپنے دل کی کی ہے۔ کبھی مجھے یہ سمجھنے کا حق ہی نہیں دیا کہ میں تمہاری کچھ لگتی بھی ہوں۔ مگر تم سے سچ کہتی ہوں اب میں تمہیں قبر کے اندر پاؤں دھرنے بھی نہ دوں گی۔ کوئی حد ہے۔ صورت تو دیکھو۔ آنکھوں میں حلقے۔ گال پچکے ہوئے۔ سینہ کمزور، سارے جسم کی رگیں ابھری ہوئی۔ اور اس پر جب دیکھو تب قبر میں کود پڑتے ہو۔ مجھے نہیں چاہیئے ایسی روٹی۔"

"تو پھر فاقے کرتی رہ۔" شکور زچ ہو کر بولا۔

"ہاں ہاں کروں گی۔ ضرور کروں گی۔ تمہارے ساتھ رہ کر تو دوزخ بھی مجھے جنت کے برابر ہے۔"

شکور چڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہونہہ! بڑی جنت والی آئی۔ اب یہ شتر مرغ کا بچہ جن رہی ہے تو اسے کیا کھلائے گی؟ میرا سر یا اپنا؟"

حمیدہ نے پیار سے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ "شتر مرغ کا بچہ۔ واہ! ایسا کیا تمہیں بھلا لگتا ہے شتر مرغ کہنا۔ تمہیں کیا، میں کچھ بھی کھلاؤں، نہ بھی کھلاؤں تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ تو کیا بھوکا مارے گی؟"

حمیدہ مسکرا کر بولی۔ "بھوکا کیوں ماروں گی۔ ارے تمہیں تو پتہ ہی نہیں۔ ماں بن کر تو بھوک پیاس سب مٹنے لگتی ہے۔ ماں نہ کھائے، تب بھی فرق نہیں پڑتا۔" وہ کھوئے ہوئے بولی۔ "جب سے میرا ایک جی سے دو جی ہوا ہے یقین کرو مجھے ایسا لگتا ہے کہ بس دنیا زمانے کی ساری خوشیاں مل گئی ہیں۔"

"ہونہہ۔ خوشیاں مل گئی ہیں۔ تبھی یہ منہ سرسوں کا کھیت بنا ہوا ہے۔"

ابھی اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ حمیدہ چکر کھا کر گر پڑی۔ شکور بستر سے اچھل کر اسے سنبھالنے کو بھاگا۔ دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر لایا اور کھاٹ پر ڈال کر دھیرج سے بولا۔

"کیسا لگ رہا ہے میدہ؟"

حمیدہ کے دیدے بند ہوئے جا رہے تھے، کراہ کر بولی۔

"جانے کیسا کیسا لگ رہا ہے۔ اس درد کا واسطہ، تم سے ایک وعدہ چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" شکور دکھ سے بولا۔

"یہی کہ میری خاطر، اپنے ہونے والے بچے کی خاطر تم آج کے بعد کبھی قبر میں نہ اترو گے۔"

یہ بڑا کٹھن لمحہ تھا۔ ایک طرف موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا بیوی کا دل اور دوسری طرف پیٹ کا سوال۔ وہ شش و پنج میں رہ گیا۔

"حمیدہ نادان نہ بن۔ تو آج سے پہلے بھی بار بار کہہ چکی ہے اور میں بھی یہی جواب دے چکا ہوں کہ بھلے ہی میں گھر میں بیٹھ جاؤں۔ مگر پھر جینے کا کیا بندوبست ہوگا۔ سب دروازے بند دیکھ کر ہی تو میں نے یہ راہ نکالی ہے، ورنہ کیا تو سمجھتی ہے مجھے اپنی جان پیاری نہیں۔ تیری جان عزیز نہیں اور کیا یہ ننھا سا بچہ عزیز نہیں؟ مگر۔ مگر۔"

وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگا۔

پھر اس کا دل ہاتھ میں کر لینے کو آخری وار پھینکا۔ "تو کیا اپنے جگر گوشے کو بھوکا مارے گی؟ جب وہ بھوک سے تلملا تلملا کر تیری سوکھی چھاتیوں پر ہاتھ مارے گا تو تو کیا کرے گی؟ جب وہ بھوک سے نڈھال ہو ہو کر یونہی مردہ سا ہو کر پڑ جایا کریگا۔ تو تو اس وقت کیا کریگی؟" "تو کیسی بات کرتی ہے حمیدہ! ماں بننے سے پہلے عقل مند بننا پڑتا ہے، مگر تو ماں تو بن رہی ہے۔ عقل کا دور دور پتہ نہیں۔"

حمیدہ نے پسینے کا ریلا پونچھ کر، کراہ کر اس کی صورت دیکھی اور دھیمے دھیمے بولنے لگی۔ "تمھاری صورت دیکھو۔ پچھلی بار جو قبر میں اترے تھے تو آج تک صحت نہیں سدھری۔ میں تو یہ سوچ کر ہی گھٹے جاتی ہوں کہ تم یوں مٹی کے تلے مسلسل بارہ بارہ گھنٹے کیوں کر سو سکتے ہو؟"

شکور پیٹ ٹھونک کر بولا۔ "پیٹ کی خاطر، صرف پیٹ کی خاطر۔"

"آگ لگے ایسے پیٹ کو۔ میں نہیں سنوں گی۔ اب تم گھر سے قدم تو نکال کر دیکھو ذرا۔"

اس کا چہرہ دم بدم رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

"یہ تو زندگی بھر چلتا ہی رہے گا۔ میدہ تو ناحق دل کڑھا رہی ہے۔ دیکھ ایسے وقت غم کھانا اچھا نہ ہوگا۔"

حمیدہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نرمی سے بولا" میدہ اگر آج سے نو مہینے پہلے تو یہ بات کرتی تو شائد میں مان بھی جاتا۔ مگر اب..... اب۔" وہ خوشی سے بولنے لگا۔" تو اور میں ایک بچے کے ماں باپ بن رہے ہیں۔ بھلا اس کو کیسے بھوکا رکھیں؟"

حمیدہ پیٹ دبائے کھاٹ پر اٹھ بیٹھی۔ اس کی سانولی گردن پر پسینے کی دھاریں بہی جا رہی تھیں، آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، بال جھول کر سامنے آگرے تھے۔" تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ اب تم صرف ننھے جی کی خاطر قبر میں سونے پر مجبور ہو۔"

"ہاں۔" وہ جیسے بات ٹالنے کے لئے بولا۔

"تو۔ تو۔" حمیدہ نے دو ایک بار تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی پھر بولنے پر آمادہ ہوئی۔" تو میں ننھے کو ڈاکٹرنی کے ہاتھ بیچ دوں گی۔ ہزار پانچ سو جو مل جائیں گے اس سے تم کوئی دھندہ کر لینا۔ بچوں کا کیا ہے۔ تم سلامت رہے تو اللہ اور دے گا۔" اور وہ ضبط کی کوشش کرتے کرتے پھوٹ پڑی۔

شکور پوری طاقت سے چلّایا۔" کیا کہا ننھے کو بیچ دے گی؟ اس سے ہٹ کر کوئی بات نہ سوجھی تجھے؟ اس سے اچھا تو یہی ہے کہ مجھے اپنے ہاتھوں مار ڈالے۔ تو جانتی ہے میدہ۔" وہ اس کے قریب جھک آیا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی اور آنسو امڈ پڑنے کو بے قرار ہو رہے تھے۔" تو جانتی ہے نا کہ مجھے بچے کی کتنی آرزو تھی۔ تو نے تو کبھی نہیں کہا۔ مگر شادی کے بعد سے آج تک۔ آج تک میرا ایک

دن بھی ایسا نہ گزرا جب میں نے اپنے پہلو کو ایک بچے سے سونا محسوس نہ کیا ہو میرا جی ان سات برسوں بچے کے لئے کتنا ترسا؟ اور اب تو کہتی ہے کہ ہزار پانچ سو کے لئے میرے بچے کو، اپنے بچے کو، اپنی جان کے ایک حصے کو، اپنے دل، تیرے میرے خون کو بیچ ڈالے گی۔ بول حمیدہ تیرا اتنا دل گردہ ہے کہ ایسا سوچ بھی سکے۔ کیا تو چاہتی ہے کہ میں جیتے جی مرجاؤں؟"

حمیدہ نے بڑے دکھ کے ساتھ سر اٹھا کر اس کو دیکھا، پھر بڑے دکھ کے ساتھ بولی۔

"مگر اب تمہاری حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ تین برس سے دم گھونٹے گھونٹے تمہاری کیا حالت ہو گئی؟ ناک کا بانسہ تک نکل آیا ہے۔ میں ایسی نیند کی ماتی بھی نہیں، جانتی ہوں کل رات تم ٹھسک ٹھسک کھانس بھی رہے تھے۔ کیا تمھیں اپنے بچے کا سکھ نہیں دیکھنا تم تو......"

ابھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زور سے چلائی۔ چیخ کی آواز سن کر دالان میں سوئی ہوئی چچی لپکی آئی۔ شکور نے گھبرا کر حمیدہ کو جلدی سے لٹا دیا اور خود دائی لینے کو چل دیا۔!

"میں کب نہیں کہتا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ مگر کیسی الٹ پلٹ باتیں سوچتی اور سمجھاتی ہے۔ نوکری ملے گی کہاں؟ شہر تو گیا ہی تھا اور چار برس کارخانے میں نوکری کی بھی۔ اب مزدوروں کے ساتھ میری بھی چھنٹنی ہو گئی تو میں بھی کیا کر سکتا تھا؟۔ یہاں گاؤں میں کون پاپڑ نہ بیلے مگر کیا ملا؟ اب تنگ آکر قبر میں سوتا ہوں تو یہ سمجھتی ہے کہ جان بوجھ کر مرنے پر تلا ہوں۔ بھلا یہ نہیں سوچتی کہ ایک شوہر ہوں اور اب ایک باپ بھی ہو رہا ہوں۔ کس کا دل اب اس عمر میں مرنے کو چاہتا ہے۔

اف یہ کھانسی! میں تو اپنے بھائے رضائی میں منہ چھپائے کھانس رہا تھا اور ادھر اسے تو رتی رتی کی خبر رہتی ہے۔ ابھی بول رہی تھی ناکہ میں تمہاری کھانسی کی آواز سن رہی تھی۔ ہونہہ، خدا ایسا بے رحم بھی نہیں۔ ارے گاؤں میں رہتے عمر کٹ گئی ہے ہزار بار دیکھا کہ کالے کالے بادل آسمان پر چھائے اور برس گئے۔ تو کیا ہمارے سر کے کالے بادل کبھی نہ برسیں گے۔ برسیں گے کیسے نہیں؟۔ ذرا بات تو سنو۔ کہتی تھی بچہ بیچ ڈالوں گی۔ ایسے کیسے بیچے گی؟ اور میں کیا پاگل پن کی باتیں سوچ رہا ہوں۔ بھلا ایک ماں کبھی اپنے بچے کو بیچ سکتی ہے؟ سب مجھے گرانے کی باتیں ہیں۔ ارے! دائی کا گھر آبھی گیا اور میں اپنے اوندھے سیدھے خیالات میں ہی غلطاں پیچاں ہوں؟"

حمیدہ اور شکور ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ابھی ابھی دائی ساری غلاظت سمیٹ کر باہر چلی گئی تھی اور اب ماما کی ساری ٹھنڈک اور اطمینان کے ساتھ حمیدہ اپنے پہلو میں چھوٹے سے بیٹے کو لئے پڑی تھی۔ شکور کے چہرے کی ساری زردی، ساری تھکن اس وقت سرخی اور تازگی سے بدل گئی تھی۔ باہر رات کا سیاہ اور گہرا اندھیرا چھایا تھا مگر دونوں کے دلوں میں بھر دوپہری کا سورج سا چمک رہا تھا۔

"آج سات برس بعد خدا نے یہ دن دکھایا ہے میدہ"۔ وہ بھیگی بھیگی آواز میں بولا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے مالک کا شکر کیسے ادا کروں۔ سچ ہے اوپر والے کے یاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں"۔

حمیدہ ابھی دو چار گھنٹوں پہلے کی بات بھولی نہ تھی، اور یہ لمحہ تو ایسا لمحہ تھا کہ سارے گناہ بخش دینے اور سارے راز اگلوا لینے کا لمحہ تھا۔ اس نے بڑے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔

"لاڈ آرہا ہے بچے کا؟"

خوشی سے بھر کر وہ بولا۔ "واہ کیا بات پوچھی ہے۔ بھلا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھ

خود ہی جواب مل جائے گا۔"

"اگر یہ کچھ مانگے گا تو؟"

"ارے یہ کیا مانگے گا؟۔ اس کی زبان کہاں ہے ابھی!" وہ ہنس دیا۔

"بچے کی زبان تو بند رہتی ہے مگر اس کا انگ انگ بولتا رہتا ہے۔ اور اب اس وقت تمہارے لاڈلے کا انگ انگ کہہ رہا ہے، بابا مجھے تمہاری زندگی چاہئے۔ تمہیں میرے لئے جینا ہے۔ میری ماں کے لئے جینا ہے۔"

شکور سر سے پیر تک لرز لرز گیا۔ "کیسی بات کرتی ہے میدہ" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"سیدھی سادی سی بات ہے جی۔ تم یہ دھندہ چھوڑ دو۔ خدا کوئی نہ کوئی بندوبست تو کر ہی دیگا۔ کیا ایسا ظالم ہو گیا کہ بھوکا ہی ماریگا!"

ایسے مسرت بھرے دن بھی حمیدہ وہی روزی اور روٹی کا جھگڑا اٹھا رہی تھی۔

وہ ذرا رک کر بولا۔

"اچھا اچھا —— چھوڑ دیتا ہوں یہ دھندہ۔ ابھی، آج اسی وقت، اسی لمحہ۔ مگر مجھے روپیوں کی بھری تھیلی لا کر دے کہ اس سے اور کچھ نہیں تو کپڑے کا ٹھیلا ہی چلا سکوں۔"

"اگر میں آج ہی رقم کا بندوبست کر دوں تو چھوڑ دوگے یہ دھندہ سچ کہہ رہے ہو تم؟" وہ اعتماد سے بولی۔

"ہاں ہاں اور کتنی بار کہوں کہ......"

ایک دم باہر سے ڈھنڈھی والے کی آواز سنائی دینے لگی "آج گیارہ بجے شکور نائک قبر میں سوئے گا اور پورے بارہ گھنٹے بعد باہر نکلے گا۔ زندہ آدمی مردہ قبر بالکل ڈھانک دی جاتی ہے۔ جس کسی کو یقین نہ آئے طبیلے والے میدان میں آجائے تماشہ کی قیمت صرف چار آنہ۔ صرف چار آنہ۔"

حمیدہ کا دل اچھل اچھل کر دھڑکنے لگا۔ شکور نے ہنس کر بیوی کو دیکھا۔

"اری شیخ کی بیوی ہو کر دل چھوٹا کرتی ہے۔ اب میرے لئے کون بڑی بات رہ گئی ہے؟ تین سال سے عادی ہو گیا ہوں، مگر تو تو ہر بار یوں دل چھوٹا کرنے بیٹھ جاتی ہے جیسے پہلی بار ہو۔ واہ وا۔ کیا بودی عورت ہے بھئی!"

حمیدہ غم سے بولی۔ "مہینے میں دو دو باریوں بارہ بارہ گھنٹے کے لئے بند قبر میں سو کر لوگوں کو تماشہ دکھانا اور محض بیس بائیس روپے کی خاطر! جانے کس نے ایسی عقل سکھائی ہے۔؟"

"پیٹ نے رانی، پیٹ نے۔" وہ حسب معمول پیٹ ٹھونک کر بولا۔

ڈھونڈھی والا دالبیی میں پھر حمیدہ کا دل اچھالتا گیا۔ مگر شکور بغیر کچھ نوٹس لئے چدر اٹھا نہانے کو چل دیا۔

دس بجے کے قریب وہ حمیدہ کے پاس آیا اور بچے کو پیار کرتا ہوا بولا۔

"دودھ نہیں اترا ابھی؟"

ایک بار تو حمیدہ کا دل بھی کانپ اٹھا، پھر رک کر بولی۔

"ابھی تو نہیں اترا۔ چچی کہتی تھی کھلائی پلائی زیادہ ہو تو جنائی سے پہلے ہی دودھ ٹپکنے لگتا ہے نہیں تو....." وہ رک گئی۔

"اچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "شام کو واپسی میں تیرے لئے میوہ لیتا آؤں گا۔ اچھا اب جاؤں۔ انتظام کرنے والے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے اور پھر مجھے بھی تو آج گھر آنے کی جلدی ہے نا" وہ ہنستا ہوا اٹھا اور حمیدہ اور بچے کے گالوں پر ایک ساتھ پیار کرتا ہوا چل دیا۔

شکور کے جوتوں کی پٹ پٹ دور ہوتی گئی اور حمیدہ کا دل اسی رفتار سے

تھمتا گیا اور پھر سہم کر آہستگی سے دھڑکنے لگا۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔
اس نے پہلو میں پڑے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔ سرخ سرخ چہرہ، کالے کالے بال پیشانی پر بکھر کر رہ گئے تھے۔ سوکھے سوکھے ننھے ننھے ہونٹ۔ وہ دنیا کی ہر حسرت اور غم سے بیگانہ ماں کے پہلو میں سکون کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا سرخ چہرہ ماں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا گیا۔ اور پھر اس کی جگہ ایک تھیلی باقی رہ گئی۔ تھیلی۔! جس میں روپے ہی روپے بھرے ہوئے تھے۔
"دیکھ حمیدہ یہ غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ایسی باتوں پر زیادہ سوچا نہیں کرتے۔ تو جانتی ہے اس وقت تو ایک ایسے خزانے کی مالک ہے کہ پلک جھپکتے میں تیرے پاس پانچ سو روپے ہوں گے اور ذرا یہ سوچ کر ان پانچ سو روپوں سے کیا کیا کام لے سکتی ہے۔ شکور کپڑوں کی دوکان کھول سکتا ہے۔ کھلونوں کی دوکان لگا سکتا ہے۔ چاہے تو کرائے کا ٹھیلہ لگا سکتا ہے۔ بس پیسہ ہو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ پھر کیا سوچ رہی ہے ؟۔
"ارے بچے کی طرف دیکھتی کیا ہے ؟۔ تیرا شکور سلامت رہے ایسے کئی بچے ہو جائیں گے۔ شہر کی ڈاکٹرنی ہر مہینے دوسرے مہینے گاؤں کا پھیرا لگاتی ہے کہ حرامی اور لاوارث بچے خرید لے۔ بھول گئی کیا تاجے چاچا نے اپنا پانچ برس کا بچہ کس مزے سے بیچ دیا۔ ان کے اور بھی چھ بچے تھے! تو کیا فرق پڑتا ہے ؟ تجھے بھی اور ہو جائیں گے۔ مگر اس وقت تو تجھے اپنے میاں کے لئے روپیہ چاہیئے۔ اس کی صحت اس کی حالت تجھے دکھائی نہیں دیتی ؟ بند قبر میں لیٹے رہنے سے اس کا چہرہ کیسے دق زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا سینہ جو پہلے اتنا چوڑا چکلا تھا کیسے سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اور جب بارہ گھنٹوں بعد قبر سے نکل کر آتا ہے تو کیسے مردہ مردہ دکھائی دیتا ہے کہ

اب سوائے اس کے سوچنے کا وقت نہیں حمیدہ۔ گزرا ہوا لمحہ کبھی پلٹ کر نہ آیا ہے نہ آتا ہے۔ چل اٹھ پھر سوچ کیا رہی ہے۔ بچے کی یاد آئے گی؟ بیوہ سے خالی کوکھ کہیں اچھی ہوتی ہے۔ حمیدہ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ تو خالی کوکھ ہی رہے۔ ایک بار درخت پھل دینا شروع کر دے تو پھر رکتا نہیں۔ اب تجھ پر بہار آ رہی ہے، پھر یہ وسوسے کیسے؟ مسلمان کا بچہ اور عیسائیوں کے ہاتھ پڑ جائے! یہ خدشہ ستا رہا ہے تجھے؟ ہونہہ! تیرے خدا نے تیرے ساتھ کون بڑا اچھا سلوک کیا ہے کہ تجھے مذہب کی پڑی ہے۔ ارے سب سے بڑا مذہب پیسہ ہے پیسہ۔ یہاں آ کر سارے مذہب وذہب ختم ہو جاتے ہیں۔ عیسائیوں میں رہ کر بھی وہ تیرا بیٹا ہی رہے گا۔ یادوواد کا مت سوچ حمیدہ۔ عورت کے سہاگ پر بن جائے تو پھر وہ اولاد کو دیکھتی ہے نہ خود اپنی زندگی کو پھر تو کیا سوچ رہی ہے؟ یہ نہ بھول کہ ایسے موقعے بار بار نہ آئیں گے ـــ تو تھوڑی دیر کو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لے کہ تجھے ابھی بھی اولاد پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ جیسی سات سال سے تھی ویسی اب بھی ہے۔ چین نہیں آتا؟ دل پہ پتھر رکھ لے حمیدہ، سب کچھ بھول جائے گی۔ ایک لمحے میں فیصلہ کر لے تجھے اپنی کون سی چیز زیادہ پیاری ہے ـــ پھولوں کی طرح لہکتا مہکتا سہاگ یا بچہ؟۔ جیون مرن کا ساتھی یا یہ بھری کوکھ؟ شوہر یا اولاد؟ شوہر، جس کے دم سے اولاد ہوتی ہے۔ اولاد شوہر نہیں دلا سکتی، ہاں شوہر......"

حمیدہ نے تڑپ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ دل کی آواز کو اور زیادہ سنتے رہنے کی اس میں تاب نہ تھی۔

"مجھے اپنا شوہر زیادہ عزیز ہے۔ مجھے اپنے سہاگ کے پھول زیادہ عزیز ہیں۔ مجھے ـــ مجھے۔" اس نے اپنا دل دبوچ لیا۔

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اٹھی۔ بچے کی پیدائش کو ابھی کل چار پانچ گھنٹے ہی ہوئے ابھی بچے کے جسم کی وہ قدرتی نمی سوکھ بھی نہ پائی تھی۔ ابھی اس کی آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں۔ ابھی اس نے ماں کی چھاتیوں کا رس بھی نہ پیا تھا اور وہ دور کیا جا رہا تھا۔

حمیدہ نے اپنی ساڑی کے آنچل میں اسے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا تو چچی باورچی خانے میں بیٹھی پھونکیں مار رہی تھیں۔ اس کی پیٹھ صحن کی طرف تھی۔ حمیدہ نے شکر سے سانس لیا اور ڈولتے ڈولتے قدموں سے صحن سے نکل گئی۔ باہر نکل کر اس نے ایک سانس بھری۔ تھوڑی دیر رکی، پھر چلنے لگی۔ لاوارث اور یتیم بچے خریدنے والی ڈاکٹرنی بڑے زمیندار جی کے گھر کے بازو والے لال گھر میں ٹھیرا کرتی تھی۔ حمیدہ نے دھیرے دھیرے ادھر ہی اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی ہی دور چل کر اس کی سانس پھولنے لگی۔ مگر وہ دل سنبھالے (دل جو اس کے پہلو میں تھا۔ اور دل جو اس کے سینے سے بھی چمٹا ہوا تھا) بڑھتی ہی گئی۔

سامنے ہی لال دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ اور وہ کمزوری کے باوجود چل پڑی۔ وراندے میں عیسائی ڈاکٹرنی فٹنگ کر رہی تھی۔ حمیدہ کو آتے دیکھ کر اس نے مسکرا کر اون کے گولے اور تیلیاں پاس پڑی تپائی پر رکھ دیں۔ حمیدہ نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا، دھیرے سے کرسی پہ اس ننھی سی جان کو لٹا دیا۔ اور ڈاکٹرنی کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

"میری ممتا کی قیمت"، بھنچی ہوئی آواز بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ڈاکٹرنی نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

"حرام کا ہے؟" حمیدہ کے چہرے پہ زہر خند مسکراہٹ چھا گئی "حرام حلالی سے نہیں پڑتا مالکن۔ محبت تو وہی رہے گی۔ چاہے ماتھے پہ بدنامی کا ٹیکہ ہو یا عزت کا جھومر"

ڈاکٹرنی نے ہنس کر اسے دیکھا، پھر اٹھ کر کرسی تک آئی اور کپڑا ہٹا کر بولی۔

"ارے بیٹا ہے!"

حمیدہ کا دل اچھل کر منہ میں آگیا، مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

"کیا لوگی؟" وہ پھر کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"یہ تیری کیسی خدائی ہے مولا جہاں پیٹ کی اولاد کی بھی بولی اٹھائی جاتی ہے؟" حمیدہ نے سوچا اور پھر دھیرے سے بولی۔

"پانچ سو سے کم نہیں، زیادہ جو آپ کے دل میں آئے۔"

ڈاکٹرنی نے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور بولی۔

"کئی دفعہ تو ہمیں مفت میں بھی بچے مل جایا کرتے ہیں۔"

"میں نے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔ میں اپنی بات کہہ رہی ہوں۔ یہ میری پہلی اولاد ہے، وہ سورج جو سات سال بعد گھور اندھیرے میں چمکا ہے مگر میں پھر اندھیرا اپنا رہی ہوں۔" وہ جھکی اور ڈاکٹرنی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ "مالکن کوئی ماں اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔ مگر کرتی ہے تو صرف سہاگ کی خاطر۔ میرا شوہر ہر بندھوا ڑے قبر میں سوتا ہے، تماشہ بنتا ہے تاکہ پیسہ کما سکے۔ اگر وہ اور یونہی کرتا رہا تو ایک دن پھٹ سے مر جائے گا۔ اس کی صحت بالکل تباہ ہو رہی ہے۔ مگر وہ سنتا ہی نہیں۔ میری خاطر میرے بچے کی خاطر۔ بس یہی چاہتا ہے کہ پیسہ کمائے۔ میں نے سوچا میں بھی تو پیسہ کما سکتی ہوں۔ عورت کیا نہیں کر سکتی مالکن؟ بس سینے پر پتھر رکھنے کی بات ہے۔" اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔

ڈاکٹرنی نے اور کچھ نہیں کہا۔ اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی اور واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کڑکڑاتے نوٹوں کا ایک بنڈل تھا۔

حمیدہ نے نوٹوں کو دیکھا اور پھر کرسی پر پڑے بچے کو اور اکدم وہاں سے نظریں ہٹالیں۔ بڑی دیر بعد وہ بولی۔

"مالکن آپ یہاں کب تک رہیں گی؟" "میں آج شام کو ہی جارہی ہوں۔ چار بچے اور بھی میرے ساتھ ہیں۔" وہ اسے مطمئن کرنے کو بولی۔

"آج شام کو ہی!" حمیدہ کا دل ٹوٹ گیا۔

"اچھا ہی تو ہے نا، ورنہ جتنے دن دیکھتی رہوں گی۔ خواہ مخواہ دل اٹکتا رہے گا۔" حمیدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کو دبوچ لیا۔ ڈاکٹرنی نے اسے دیکھا اور جیسے سمجھ کر بولی۔

"دودھ کا زور ہو رہا ہو تو پلا دو۔"

"نہیں" حمیدہ مضبوطی سے بولی۔ "میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی۔"

"کیوں؟" ڈاکٹرنی حیرت سے بولی۔

"مالکن۔" وہ بھنچی ہوئی آواز سے بولی۔ "ایک ماں جب اپنے سینے سے اپنی اولاد کو ممتا کا رس پلا دیتی ہے تو یہ محبت بالکل ہی اٹوٹ اور نہ بچھڑنے والی ہو جاتی ہے۔ دودھ کی دھار جب ماں کی چھاتی سے نکل کر بچے کے منہ میں پڑتی ہے تو دونوں کے بیچ ایک واسطہ ہو جاتا ہے۔ ایک خاموش معاہدہ کہ میرے بچے میں تجھے سدا یونہی اپنی چھاتیوں کا رس پلاتی رہوں گی۔ میں۔ میں اپنے بچے سے جھوٹا وعدہ کیسے کروں مالکن؟" اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہہ اٹھے۔

حمیدہ نے دھیرے سے نوٹ تھامے اور پلٹ گئی۔ دروازے کے پاس جاکر وہ رکی پھر دوڑتی ہوئی بچے کے پاس آگئی۔ بچہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی۔

"مالکن آپ اسے کیسے پالیں گی؟ کیا پلائیں گی؟"

ڈاکٹرنی ذرا دکھ سے مسکرا کر بولی۔ "آخر میں بھی ڈاکٹرنی ہوں اور کئی بچے حاصل کر چکی ہوں، دل چھوٹا نہ کرو، تمہارا بچہ بالکل اچھا رہے گا۔"

"مالکن" وہ پھر سے بولی۔ "میں بھی اگر اسٹیشن تک آپ کے ساتھ چلوں تو؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہاں تم اپنے دل کا سوچو۔"

حمیدہ وہیں گھٹنوں میں سر دبا کر بیٹھ گئی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ دھبے ناچنے لگے۔ کچی زچہ اتنی دور کی تھکن، اور سب سے بڑھ کر بچے کی جدائی؟ اس کا بند بند درد کر رہا تھا۔

گھوڑا گاڑی دروازے سے لگی اور پھر وہ سب اسٹیشن پہنچ گئے۔

"مالکن،" وہ ہچکیاں لے کر یہ بولنے لگی۔ "آپ ڈاکٹرنی ہیں، جانتی ہونگی کہ ایک ماں کتنے کڑے دردوں کے ساتھ بچہ پیدا کرتی ہے۔ آپ نے بھی کتنے ہی بچے پیدا کروائے ہوں گے۔ آپ کے پاس بھی عورت کا دل ہے۔ مالکن جب جب ننھا روئے گا میرا دل کٹ کٹ کے بہا کرے گا۔ آپ یہ سوچ لیا کریں مالکن کہ وہ میرا نہیں آپ کا — آپ کا ہی بچہ ہے۔"

ریل چھک چھک کرتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ حمیدہ کے سینے میں ہلچل سی ہونے لگی۔ دودھ سے لبریز چھاتیاں ننھے منے ہونٹوں کے لمس کو بے قرار تھیں اور پھر مامتا کی ماری دو ندیاں چھل چھل کرتی امڈ ہی پڑیں۔ حمیدہ نے سر نہوڑا کر دیکھا اس کا سب کچھ چلا گیا تھا۔ خالی کوکھ اسے رہ رہ کر ڈس رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو جکڑ لیا۔ "میرا بچہ!"

ریل چلی گئی اور حمیدہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے

اسے ہوش آیا اور کمر میں روپیوں کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ شکور کو کیا منہ دکھائے گی؟۔ سات برس اس نے جس لگن سے ننھے مسافر کی چاہت کی تو کیا اسی دن کے لئے کہ یوں بچھڑ جائے! میں کہہ دوں گی کہ یہ سب تمہارے ہی لئے تو کیا ہے۔ تم جیو میرے سر کے تاج! ایسے کئی پھول کھلا دو گے۔ ایسا ہی تمہیں بچے کی یاد ستائے تو ــ تو میں کیا کہوں گی؟۔ کون جانے کس دیش کو وہ مسافر گیا ہے؟ میں ــ میں کیا کروں؟۔ کیا سوچوں؟۔ سینہ بیٹھا جا رہا ہے۔

اری دیوانی! تیرے سر پر تو تاج سا جگمگا رہا ہے۔ تیرے سر کا تاج سلامت ہے تجھے اور کیا چاہیئے؟ کوکھ پھر بھی بھر جائے گی۔ سہاگ بار بار کہاں ملتا ہے! دیوانی آنسو پونچھ بھی لے، پونچھ بھی لے۔

طبیلے کے میدان کے گیس ہنڈولے یہاں سے صاف نظر آتے تھے۔ اسٹیشن اور میدان کا فاصلہ ہی ایسا کتنا تھا؟ شکور جس دن قبر میں سونے والا ہوتا چھوٹا موٹا میلہ ہی وہاں لگ جایا کرتا۔ رات تو ہو ہی گئی تھی۔ کیوں نہ وہ میدان تک چلی جائے کہ شکور کو ساتھ لے لے۔ گھر پہنچ کر خالی کوکھ دیکھ کر تو اسے بڑا ہی طیش آئیگا۔ یہاں روپے بتا دوں گی تو اسے ذرا سکون مل جائے گا۔

ہاں یہی ٹھیک ہے۔ اور اب یہ آنسو نہیں بہنے چاہئیں۔ اب تو خوشیاں آئیں گی۔ کالے بادل ہٹ گئے، روشنی جھانکتی آ رہی ہے۔ اب کھانے کو پیٹ بھر روٹی ہوگی۔ پہننے کو تن بھر کپڑا۔ اور منا؟ ننھے جنوں کا کیا ہے، سال دو سال میں گھر بھر جائے گا۔

خیالات کی رو میں بہتی بہتی وہ عین میدان کے بیچ پہنچ گئی۔ لوگ ہنڈولے جھلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چیخ چہاخ تھی۔ وہ اپنے کچے زخموں کو چھپائے

سراسیمہ سراسیمہ سی کھڑی تھی کہ اکدم کوئی اس کے قریب سے گذرا۔

"ارے کوئی اس کی چچی اور بیوی کو خبر کر دے۔ بے چارہ قبر ہی میں گھٹ کر رہ گیا۔ آخر لاش گھر کیسے پہنچے۔؟"

"ہوا کیا؟" دوسرا آدمی تاسف سے پوچھ رہا تھا۔

"ارے تمھیں پتہ نہیں بھائی، وہ شنکر ناٹک قبر میں سوتا تھا کہ نہیں۔ تو آج ہمیشہ کے لئے ہی سو گیا۔ صبح ہی کھانس رہا تھا اور اس کی صحت بھی خراب دکھائی دے رہی تھی، مگر پیٹ برا ہے بھائی، کیا کرتا؟ اور سنا ہے غریب آج ہی ایک بچے کا باپ بھی بنا تھا۔!"



سُہاگن

(۱)

سلیمان میاں تو سدا کے بگڑے دل تھے ۔ اس میں ان کا اتنا اپنا قصور بھی نہ تھا۔ جتنا کہ ماں باپ کا! ۔ اور باپ سے بڑھ کر ماں ۔ اکلوتی اولاد تھے ۔ جو بولتے ماں پورا کر دکھاتیں ۔ جوانی آئی مگر ان کے چلن میں کوئی فرق نہ آیا ۔ بس وہی کریں گے جو دل میں سمائے گی ۔ ماں باپ نے چھوٹ ہی ایسی دے رکھی تھی ۔

بھری برسات کے دن! ۔ نالے میں پانی اچھل اچھل کر کتھئی رنگ کا ہو گیا ، بھراٹے دار ہوا اور جھراٹے کا بہاؤ ۔ ایسے میں بھلا کوئی یوں تیرنے کو جایا کرتا ہے ۔

باہر نکلنے لگے تو ماں نے پوچھا بھی ۔ "کہاں جاتے ہو سلو میاں؟"

بولے ۔ "ایسے ہی ذرا باہر گھوم کر آتا ہوں اماں۔"

"وہ ئی ایسے میں کہاں گھومنا ہے میاں؟ سارے میں چپچپاہٹ ہو رہی ہے ۔ ایسے میں گھر بیٹھتے ہیں یا سیر سپاٹے کو جاتے ہیں؟"

"آپ تو چاہتی ہیں میں لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں بیٹھا رہا کروں ۔ بھلا اس موسم میں تیرنے کا جو مزہ ہے وہ پھر کہاں؟" دھڑاک سے دروازہ کھول باہر نکل گئے ۔

صبح سے دوپہر ہوئی ، دوپہر سے سہ پہر ، سہ پہر سے شام اور پھر کالی گھور اندھیری رات۔

رات کے سناٹے میں محلے والے سلو میاں کی لاش حفیظ میاں کے گھر پہنچا گئے ۔

"ہائے میرا لال!" حفیظ میاں دھاڑے ۔

اندھیرے کو ٹٹولتی ہوئی ماں دروازے تک آئیں تو دیکھا کھڑی چارپائی پو دھلی دھلائی لاشیں بچھی ہے اور کچھ ان سے دیکھا نہ جا سکا۔ دھڑ سے چوکھٹ پر گر پڑیں۔

اختر، بھائی کے بچے کو گود میں لئے دودھ روٹی کا چورما کھلا رہی تھی۔ "راجہ کیا کھائیگا؟"

"ہپیا۔ منا منہ پھاڑ کر بولا۔

"راجہ کیا پئے گا؟"

"ممانی۔"

"اور راجہ دولہا کیسے بنے گا بھئی؟"

"ڈھم۔ ڈھم۔ ڈھما۔" منا دونوں ہاتھوں سے ہو ہو کرکے تالیاں پیٹنے لگا۔ اختر زور زور سے ہنسنے لگی۔

ایک دم باہر سے عزیز میاں لپکے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں مسلا مسلایا پوسٹ کارڈ تھا۔ اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اختر کو یوں بے تحاشا ہنستا دیکھ کر ان کا منہ کھنچ گیا۔ اپنی ساری طاقت سمیٹ کر وہ بڑی مشکل سے پکارے۔

"اجی کہاں ہو؟ سنتی ہو!"

وہ بوکھلائے بوکھلائے اختر کی اماں آوازیں دینے لگے۔

"جی۔" عارفہ بیگم کھلا سر ڈھانپتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے نکل آئیں۔

"ذرا انڈے تلوا رہی تھی، ماما تو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ توبہ میری آپ بھی یوں چلانے لگتے ہیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے موا۔" اک دم ان کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "کس کا کارڈ آیا ہے؟"

عزیز میاں کہیں بہت دور سے بولے۔ "سلیمان میاں کہیں، تیرنے گئے تھے۔"

اختر کے کان کھڑے ہو گئے۔ عارفہ بیگم کا منہ ذرا کھل گیا۔ میاں رک گئے تو بے تابی سے بولیں۔

"ہاں ہاں تو کیا ہوا پھر؟"

"آدھی رات کو ان کی لاش گھر لائی گئی۔"

"لاش؟" عارفہ بیگم نے سوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "لاش؟"

سفید آنچل ان کے سر پہ پھڑپھڑ کرنے لگا۔ اختر کے ہاتھوں سے دودھ روٹی کا نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جا گرا۔ اک دم عارفہ بیگم دوڑیں اور اختر سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔

"ہائے میری بیٹی! ہائے میری دلاری۔ ابھی تیرے سہرے کے پھول کھلے بھی نہ تھے کہ بیوہ ہو گئی۔ ہائے!" ماں کے آنسوؤں سے اختر کا منہ دھل رہا تھا اور وہ سہم کر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس قدر بوڑھی ہو گئی تھیں۔

سلو میاں خود تو قبر کی گود میں جا سوئے اور اختر کے نصیبوں کو روگ لگا گئے! اختر گیارہویں سال میں تھی۔ زمانہ ہوا سلو میاں سے نسبت طے پا چکی تھی اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی گڑبڑ مچ رہی تھی۔ چھوٹی سی دھان پان سی گڑیا۔ یوں تو گیارہ برس پورے ہونے کو آ رہے تھے مگر ذرا بھی سمجھ نہ تھی۔ اس کی بھی خوشی تھی کہ گڑیا ایسی بہو گھر میں چھم چھماتی چلے۔ ادھر ماں کہتی تھیں۔ "کچھ نہیں تو بٹیا کو ہرا دوپٹہ تو اڑھا دوں۔"

اب لاکھ ننھی تھیں بی اختر، مگر یہ تو سمجھتی ہی تھی کہ اپنی نسبت لگ چکی ہے۔ خالہ کے بیٹے سلو میاں کبھی چھوٹی خالہ سے عید بقر عید کو ملنے آتے تو اماں پھٹکارتیں۔

"دوئی لڑکی شرم ہے یا نہیں؟ اندر جا کر بیٹھ۔ کیا ہونے والے مرد سے دیدے لڑائے گی؟"

اندر جاکر بیٹھ تو جاتیں، مگر دروازے کی جھری سے آنکھ لگ جاتی۔ "کالی ٹوپی، ناسی رنگ کی اچکن، چست پاجامہ۔ ہائے کیا پیارے شہزادے سے لگ رہے ہیں۔ میں مر جاؤں! اماں نے ان کی پیشانی پر کیسے چٹ سے بوسہ لے لیا۔ لو وہ بیٹھ بھی گئے۔ جانے کیوں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا شرم! بھئی اماں اتنے چاؤ سے سیویاں کھلا رہی تو کھا کیوں نہیں لیتے۔؟"

"اور تو گھر میں سب خیریت ہے خالہ بی؟" وہ بڑی شرما شرمی سے پوچھ ہی لیتے۔ خالہ بی کے چہرے پر ہنسی کی لہر سی آتی، مگر وہ سنجیدہ ہو جاتیں۔

"ہاں اللہ کا فضل ہے۔"

"اے لو۔ کیسی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ اب بھابی دلہن سامنے بیٹھی ہیں۔ منا وہیں اچھل پھاند رہا ہے، بھیا ساتھ بیٹھے سیویوں میں حصہ لگا رہے ہیں۔ ابا تو ہوں گے ہی بیٹھک میں؟۔ پھر آپ کس کی خیریت پوچھتے ہیں؟۔ بھئی واہ، ذرا سی شرم بھی تو نہیں آتی!۔"

بھابی دلہن جان بوجھ کر اندر آجاتیں اور نند ہونے کے ناطے مذاق کرنے سے کبھی نہ چوکتیں۔

"اے بی یہ جھری سے لگ کر کیوں بیٹھی ہو؟۔"

"ہائے بھابی دلہن، قسم لے لو جو میں نے کسی کو دیکھا ہو۔ مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اماں تو پاس بیٹھی خود ہی منہ میں لاڈ سے سیویاں بھرے جا رہی ہیں، پھر میں ...."

"کیوں ری بد ذات! تو نے دیکھا نہیں تو آپ ہی آپ یہ غیب کا حال کیسے معلوم ہو گیا؟۔"

" اب بھابی دلہن سے کون بتائے! بھلا منگیتر کو دیکھے بنا کیسے رہا جا سکتا ہے؟ ہائے اتنی دور سے تو بے چارے عید کو آئیں اور کوئی انھیں دیکھے بھی ناں! ایسا کیا بھابی نے کبھی بھیا کو نہ دیکھا ہوگا۔" وہ جان بوجھ کر ہاتھ ہلانے لگی کہ چوڑیاں کھن کھنا اٹھیں۔ اور وہ سمجھ لیں کہ اتنی دور آنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔ "ہاں جی تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی سرحد میں داخل ہونے ابھی تھوڑے بہت دن باقی تھے، مگر اکّو ماں یہ تو جانتی تھیں کہ سلیمان میاں کے نام سے ان کی کلیاں مہکنے والی ہیں۔ اب جو جان جوان موت کی خبر ان کے کانوں میں پڑی تو اسی دم وہ کلیاں مرجھا گئیں۔ اتنی دیر میں کتنے خیال آئے اور چلے گئے آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ اماں ایسے ہلک ہلک کر رو رہی تھیں۔ "ہائے میری اکو کا کیا بنے گا؟ ہائے میری لاڈلی!"

اماں کو یوں روتے دیکھ اختر کی آنکھوں سے بھی ندی سی امڈ پڑی۔

(۲)

اس دن صبح اختر اپنے بستر پر سے اٹھی تو چھوٹی سی ریشمی رضائی کو لات مار کر دور گرا دیا۔ " اتنی سی رضائی نے کے میرے پلے باندھ دی۔ سر ڈھانکوں تو پیر باہر نکل پڑتے ہیں۔ پیر ڈھانکوں تو کم بخت سر کھلا رہ جاتا ہے۔" وہ بستر پر سے انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ عارفہ بیگم نے سہم کر سر اٹھایا۔

جوانی یوں چپکے سے کیسے گھر گھس گئی؟ ارے بیٹی کی جوانی تو ڈھول تاشے بجاتے آتی ہے۔ پہلے آنکھوں کی پلکیں گہری اور لمبی ہو جاتی ہیں، پھر آنکھیں آپ ہی آپ جھکی جھکی رہنے لگتی ہیں۔ بازوؤں پر صندل کی شاخوں کا گمان ہوتا ہے اور پیر سونے سونے بھی رہیں تو لگتا ہے چلتے ہیں پائلیں سی چھنک رہی ہیں۔

یہ کیسی جوانی ہے خدایا! جو یوں خاموشی سے گھر میں گھس گئی۔ پلکوں کی وہ

جھالر چھپی چھپی کیوں سی تھی؟ آنکھوں میں وہ شرمیلا انداز کہاں تھا؟ بازو صندل کی شاخوں ایسے کب لگے؟ اور نوادر چلتے میں کبھی پائل نہ چھنکی۔ اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہو گیا۔ راتوں رات اس باغ پر بہار کیسے آ گئی کہ کالی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ دبیز سے دبیز تر ہو گیا۔ آنکھیں جھل مل جھل مل قندیلیں سی بن گئیں۔ رہ رہ کر جگمگاتی اور کانپتی سی قندیلیں! بازوؤں میں رس بھر گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ اور جب اکو ماں بستر سے اٹھ کر حمام تک گئی تو خاموش آواز کے ساتھ یہ چھما چھم کیسی؟ مگر اب بہار کو قید کیسے کیا جا سکتا تھا؟ سرسراتی ہوائیں تو آپ بتا دیتی ہیں۔

"لو بھئی بہار آ گئی ___ بہار آ گئی ___ بہار آ گئی!"

عارفہ بیگم کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ وہ سہمے ہوئے دل سے اس بہار کی منتظر تھیں۔ بھرے گھر میں یہ ایسی کیسی بہار آئی کہ بجائے خوشی کے دل ڈوبنے لگا۔

عزیز میاں کے لئے حقہ گرم کر کے بیٹھک میں لے گئیں تو عارفہ بیگم یوں چپ چپ تھیں۔

"کیا بات ہے؟" عزیز میاں حقہ گڑگڑا کر بولے۔

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ذرا بے بسی سے بولیں۔ "اپنی اکو ماں سیانی ہو گئی۔" اپنے لگائے ہوئے درخت پر پھول کھلیں، بہار جھومے تو چہرے پر ہنسی آتی ہی ہے۔ خوش ہو کر بولے۔

"اچھا؟"

عارفہ بیگم نے حیرت سے میاں کو دیکھا۔ "آپ تو یوں مطمئن ہیں، ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کہوں یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہوئی؟"

عزیز میاں نے حقہ گڑگڑایا۔

"اور مجھے تو اس میں رنج ہونے کا کوئی نکتہ نظر نہیں آتا۔ بھلا اس میں پریشانی

کی کیا بات ہے ؟ اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے کہ بیٹی جوان ہوگئی ؟ ۔"

عارفہ بیگم نے ترس بھری نگاہوں سے نادان میاں کو دیکھا ۔ ؟"

"مزدور اپنا بوجھ زمین پہ اتار کر خوش ہوتا ہے ۔ سر پہ دھرا رہے تو اس کی جان کھوکھلی پڑ جاتی ہے ۔"

عزیز میاں نے چونک کر بیوی کو دیکھا ، پھر خود کو مطمئن بنا کر بولے ۔" وہ تو ٹھیک کہا تم نے ، مگر خواہ مخواہ فکر مول لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا ؟ ۔"

" خواہ مخواہ کی فکر ؟" وہ درد سے مسکرائیں ، " یہ تو اتنی بڑی پریشانی کا سودا ہے ۔ میری تو ابھی سے جان آدھی ہوتی جا رہی ہے ۔"

" ارے دنیا کی بیٹیاں جوان ہوا کرتی ہیں ، مگر کہیں مائیں یوں پریشان ہوا کرتی ہیں ؟ ہم نے تو ایسے موقعوں پہ ماؤں کو مٹھائی بانٹتے دیکھا ہے ۔ خوشی خوشی عزیز رشتہ داروں کو جوڑتی ہیں ، گانا بجانا ہوتا ہے ، ہنگامے ہوتے ہیں ۔ اور بات ہے بھی ٹھیک ۔ مالی پھول کے کھلنے پر اداس نہیں ہوتا ، وہ تو پھولوں نہیں سماتا کہ چلو میری محنت ٹھکانے لگی ۔"

" مگر ہمارا پھول ......" وہ آگے کچھ نہ بول پائیں ۔

" ہائے ! آپ اتنی بڑی بات بھول رہے ہیں ۔ بھلا اس کی شادی کیسے ہوگی ؟"

عزیز میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہوگئے ۔

" کمال کی بات ہے ! ارے ہماری آکو ماں اتنی حسین ، اتنی پیاری ہے کہ اس کے لئے سترہ پیام آئیں گے اور ایک سے بڑھ کر ایک آئیں گے ۔ بلکہ تمھیں تو یہ پریشانی اور الجھن ہوگی کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں ۔"

عارفہ بیگم نے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھ لیا ۔" کاش ایسا ہی ہوتا ۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا؟" میاں چمک کر بولے۔ "اس میں یوں روہانسا اور آزردہ ہونے کی کیا بات ہے بھئی؟ ہوگا اور ایسا ہی ہوگا۔"

"مگر آپ اتنی بات بھول رہے ہیں، ہماری اکو کا منگیتر سال بھر پہلے ہی جوان مر چکا ہے۔"

عزیز میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہم چاروں کی کتنی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جاتا! ہو تو جاتا، مگر قسمت کو کیا کہہ سکتے ہیں؟ کیسے جوڑ کو جوڑ تھا۔ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر عارفہ خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ سوائے افسوس کے۔!"

دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف حقہ کی گڑگڑاہٹ باقی رہ گئی۔ عارفہ بیگم نے خاموشی سے کہنا شروع کیا۔ "کل دلہن بیگم کہہ رہی تھیں حسینہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"پھر؟" عزیز میاں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"ان کا خیال تھا کہ اختر کو اپنے بیٹے کو......"

عزیز میاں نے مارے خوشی کے حقہ کی نے چھوڑ دی۔ "دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ اختر کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اجی دیکھا اس کے لئے ایک چھوڑ سو آئیں گے۔ ہاں مگر وہ لڑکا کرتا کیا ہے؟ شاید ریلوے میں ملازم ہے! بھلا تنخواہ کیا ہے اس کی؟"

"ساڑھے تین سو" وہ مرے ہوئے لہجہ میں بولیں۔

انہوں نے خوشی خوشی پھر حقہ کی نے پکڑ لی۔ "تب تو سب ٹھیک ہے۔ آجکل کے زمانے میں ساڑھے تین سو کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ اور پھر وہ بی۔ اے پاس بھی تو ہے"

بیگم کچھ نہ بولیں تو پھر بولے۔

"اور ماشاءاللہ صورت شکل بھی خاصی ہے۔"

وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگے۔ عارفہ بیگم ٹھنڈے لہجہ میں بولیں۔

"تو حسینہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہے چاہو تو چاند سورج کے مقابل بٹھا دو۔ مگر ایسی منحوس لڑکی کو اپنی بہو کیسے بنا لیں جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو!"

"منحوس۔" عزیز میاں چلّائے، نے پھر ہاتھ سے چھوٹ گری۔ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو!"

کتنی ہی دیر خاموشی رہی، پھر عارفہ بیگم بولیں۔

"بس اتنے دنوں سے مجھے تو یہی ڈر لگا ہوا ہے ورنہ کون بیٹی ایسی ہوگی جس پیام نہ آتے ہوں؟ برے بھلے، کھٹے میٹھے، کیسے ہی بیر ہوں، پتھر تو مارے ہی جاتے ہیں مگر...."

دونوں نے بڑی بے بس نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غم نے جیسے ان کے چہروں کی تازگی چھین لی۔ دونوں کی آنکھیں خشک اور بے جان نظر آ رہی تھیں۔

مگر عزیز میاں اور عارفہ بیگم جس بات سے پریشان تھیں وہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ ابھی مہینہ بھر بھی نہ گذرا ہوگا کہ اکو ماں کے لئے نسبت والے آ گئے۔ لڑکا شہر میں کوئی ملازمت کرتا تھا۔ پچیس چھبیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ یعنی لڑکے اور اکو ماں کی عمروں میں آدھوں آدھ کا فرق تھا۔ تنخواہ یہی کوئی ڈیڑھ دو سو کے قریب تھی۔ ماں باپ نے ان باتوں میں سے ایک کو بھی برا نہ جانا۔ چار پانچ برس گزریں گے، دو چار بچے ہو لیں گے تو عمر کا فرق مٹ جائیگا۔ جسم بھاری ہو جائیگا تو خود اکو ماں میاں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے گی۔ تنخواہ کا کیا ہے؟ کھانے والی اپنی قسمت سے کھاتی ہے۔ بڑی چھان بین کر کے دو مگر کھانے والی کے نصیب میں نہ ہو تو ہرا بھی سوکھا ہو جاتے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

اور خاندان کا کیا پوچھنا پاچھنا تھا؟ مسلمان تھے اور شریف تھے۔ یہی بس تھا۔ منگنی کے وقت انگوٹھی پہنانے جب انہوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو گو کہ یہ علین ناممکن سی بات تھی (بھلا شریفوں میں کہیں یوں بیٹیوں کی صورت شکل دیکھی بھالی جاتی ہے؟) پھر بھی عارفہ بیگم نے مصلحت اسی میں جانی کہ چپکے سے دلہن کی شکل بتا ہی دیں ورنہ کل کلاں کو وہ کہنے کو بیٹھیں گی۔

" بھئی کیا شادی کرتے؟ لڑکی کی ایک جھلک تو نہ بتائی۔ اب ہم کیا جانیں کیا بھید تھا جو بیٹی چھپائی گئی؟۔ اے کیا ہم مرد تھے کہ بٹیا کو کونے میں لے جا کے بٹھا دیا۔؟"

بیٹی کی شکل جس نے دیکھی اس کے منہ سے "ہا" نکل گئی۔ کسی منہ پھٹ نے تو منہ پھوڑ کے پوچھ بھی لیا۔

"اے ایسی چاند سی صورت پر اتنی عمر ہو گئی؟"

عارفہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" دوئی بہن چاند سی صورت کا کیا ہے؟ بیٹی سیانی ہوتی تبھی وداع کرتے نا کہ ے کے یونہی کچی ہنڈیا دستر خوان پر برت دیتے۔ اور اتنی کم عمری میں ان کے باوا کی مرضی بھی نہیں۔"

سمدھیانے میں لوگ یوں ہاتھ لمبے کر کر کے لڑنے بھڑنے کو تو جاتے نہیں ہیں۔ چپ رہ گئے۔ مگر عارفہ بیگم کے جی کو ادھر پنکھے لگ گئے۔

نکاح خوانی کے چار بول جب تک نہ پڑھائے جائیں، میرا جی تو یوں ہی ہڑکے گا۔ پھر بعد کو نیک بخت پر جو بھی گزرے سو گزرے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میاں ہڑبڑا کر بولے۔

" ہوتا کیا؟ بٹیا کی صورت دیکھی تو وہیں سامنے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ

ایسی چاند سی صورت والیاں تو پنگوڑے میں ہی دوسرے کی ہو جاتی ہیں اور یہ تو اتنی بڑی ہو گئیں کہ چلنے میں زمین ہلا رہی ہیں۔"

عزیز میاں کھنچا کر بولے۔

"ہونہہ! بکنے والوں کو بکنے دو۔ شادی ہو جائیگی تو آپ ہی سبھوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔"

سمدھیانے والوں نے جب بنارسی سرخ دوپٹہ اڑھا کر انگوٹھی پہنائی تھی تو بنا سنگار پٹار کے اختر کی صورت ایسی چاند ایسی چمکنے لگی کہ سسیا بی لوٹ پوٹ ہو گئیں اور جاتے جاتے بول گئیں۔

"دولہن جلد ہی اپنی بہو کو بیاہ لے جاؤں گی۔ ایسے اجالے تو میرے گھر میں ہونے چاہئیں نا بہن؟" وہ عارفہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

"ہاں بہن۔ آپ ہی کی لڑکی ہے، جب بھی لے جائیے؟ چاہے اسی وقت۔"

"ناں بہن، اس وقت کہاں لے جا سکتی ہوں؟۔ ابھی تو بیٹے کو چھٹی نہیں ملی۔ ورنہ میرا بس جو چلتا تو ساتھ ہی لے کر چلی جاتی۔"

کہاں تو بہو اتنی پیاری تھی کہ بار بار دروازے میں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں اور جلد سے جلد اٹھا لے جانے کا جتن تھا یا اب دو مہینے چھوڑ چھ مہینے گزر گئے اور کوئی ٹھور ٹھکان ہی نہیں۔ ایک ایسی ہی ملگجی شام سمدھیانے کا آدمی ایک پرچہ پکڑا گیا۔

بہن صاحبہ!

آداب عرض۔ ہم تو بیٹی کی پیاری شکل دیکھ کر تبھی چونکے تھے کہ ضرور دال میں کالا ہے۔ مگر آپ نے بات کی تہہ تک نہ جانے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا کہ صاحبزادی منحوس ماری ہیں اپنے منگیتر کو کھائے بیٹھی ہیں۔ ورنہ جانے ہمارے

گھر کا کیا حشر ہوتا۔ بہن آخر آپ کے دل میں بھی دَیا محبت تو ہوگی ہی،
پھر آپ اپنی اولاد کے لئے دوسرے کی اولاد کا برا کیوں چاہتی
ہیں؟۔ آپ کے رویہ سے ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے۔ وہ تو اللہ
بھلا کرے ان بیچاروں کا جنہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ
کیا اور صورتِ حال سے مطلع کیا۔ ورنہ ہمارے گھر میں بھی
الو بول جاتا۔ ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ ہمارا سرخ دوپٹہ اور سونے کی انگوٹھی،
جو پورے سات ماشے کی تھی، واپس کر دیں گی۔

آپ کی بہن، سلطانی بیگم

پرچی ہوا کے زور سے اڑی، دیواروں سے ٹکرائی، برآمدوں میں گھومتی پھری۔
دالانوں میں رکی اور پھر ہوا کے ایک زناٹے دار جھکڑ کے ساتھ اکو ماں کی گود میں جا پڑی۔

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!!"

ہواؤں نے زور باندھا اور چلائیں۔

"صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔!"

"دیواریں سرگوشیاں کرنے لگیں۔"

"صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔!"

دالان، پیش دالان، برآمدے خاموش آوازوں سے چلانے لگے:۔

"ہاں سچ ــــ صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔!"

بی بی نے گھبرا کر میاں کی صورت دیکھی۔ "میں نہ کہتی تھی کہ اب زندگی نے آزمائش شروع کر دی ہے۔"

میاں کچھ نہ بولے۔ بولنے کو تھا بھی کیا۔؟

"جانے ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہوگا جو یوں راندے جا رہے ہیں۔" عارفہ بیگم تھکی ہاری سانس لے کے بولیں۔

"سکھ دکھ سب اسی کی دین ہے بی بی، برداشت کرو۔" عارفہ بیگم کے آنسو بہہ اٹھے۔

"نہیں ہوتا برداشت۔ بالکل نہیں ہوتا۔ کھایا پیا انگ نہیں لگتا۔؟ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ دل کا چین، آرام مٹ گیا۔ ہائے میری معصوم بچی۔!"

"برداشت کرو بی بی، برداشت کرو۔ اوپر والے کے پاس انصاف ہے۔ ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ برداشت کرو۔!"

(۱۳)

دوسرے دن عارفہ بیگم روز کی طرح صبح صبح چائے کی پیالی لے کر میاں کے بستر کے پاس گئیں تو وہ روز کی طرح بی بی کے قدموں کی چاپ سن کر اٹھ کر نہ بیٹھے۔ بی بی کندھا پکڑ کر ہلایا۔

"چائے لیجئے۔ کلی کا پانی بھی یہاں رکھے جا رہی ہوں۔"

عزیز میاں منہ اندھیرے ہی اٹھا کرتے تھے۔ پاس والی مسجد میں جا کر نماز پڑھ کر آتے۔ منجن مل کر دانت صاف کرتے منہ ہاتھ دھوتے، پھر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتے۔ بارہ سے دو بارے پڑھ کر وہیں پلنگ پر لیٹ جاتے۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ ادھر چولھے بھی جل جاتے۔ بی بی میاں کو سوتا پا کر جلدی جلدی خود اپنے ہاتھوں چائے تیار کرتیں اور چائے کی پیالی اور کلی کے لئے پانی لے کر جگانے آتیں۔

نیند گہری ہوتی تو وہ پانی اور چائے کی پیالی وہیں پٹی کے سرہانے دھر کر چلی جاتیں۔ پانچ دس منٹ کے بعد پھر آواز دیتیں۔

"اے اٹھئے بھی۔ ٹھنڈی پالا ہو جائے گی تو کیا مزہ آئیگا۔؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے۔

آج بیٹھے بیٹھے انہوں نے آواز دی۔ "اجی اٹھئے بھی"

مگر میاں یونہی سر سے پیر تک رضائی اوڑھے پڑے رہے۔ پانچ، دس، پندرہ، بیس منٹ چھوڑ گھنٹہ گزر گیا۔ بی بی اٹھیں اور ذرا الجھ کر بولیں۔

"ووئی ایسی بھی کیا نیند کہ جوانوں سے بڑھ کر ہوگئی۔ اس سے جلد تو ظہیر میاں اٹھ جاتا ہے"

قریب آکر زور سے شانہ ہلایا۔ پھر بھی نہ اٹھے تو منہ پر سے رضائی کھینچی۔ بڑی مشکلوں سے رضائی کھینچ سکیں۔ وہ منہ پر جھکیں۔

"ووئی کم بخت چائے تو دیکھئے کہ......"

مگر الفاظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے۔ ایک دم وہ چلانے لگیں۔

"ارے دیکھو تو ـــ سنو تو ـــ یہ تو بولتے ہی نہیں۔!"

بیٹا، بیٹی اور بہو دوڑتے ہوئے آئے رضائی الگ کر کے دیکھا کہ ابا میاں ہمیشہ کے لئے سو چکے ہیں۔

(۴)

جیسا وقت عارفہ بیگم پر پڑا، خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ امیر گھر کی لاڈوں، نازوں میں پلی اکلوتی اولاد تھیں۔ بھلا گھر میں کس بات کی کمی ہوگی۔؟ شادی ہو کر سسرال کو آئیں۔ یہاں بھی اللہ کا فضل تھا۔ بڑی ساری زمینداری تھی۔ اگر روپوں کو کھوندلتی

نہ چلتی تھیں تو یہ بھی نہ تھا کہ پیسے کو ترستی ہوں۔ ہزاروں سے اچھی حالت تھی۔
پھر سسرے مرے تو جائداد کا بٹوارہ ہوا۔ تین دیور، دو جیٹھ، ساس، نندیں سب کے حصے بکھرے لگے۔ پھر بھی خوش تھے۔ یوں کہ اپنے آگے دال روٹی ــ وہی بس تھی اگر دل کو اطمینان اور سکون میسر رہے تو دال روٹی تو پھر بھی اچھی بات ہے۔ فاقے بھی برے نہیں لگتے۔ اور اطمینان و سکون کیوں نہ ملتا؟ میاں دل و جان سے واری۔ اولاد بھی اللہ نے دے رکھی تھی۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ زندگی سکون سے گزرتی تھی۔ گھر کی آمدنی تو تھی ہی۔ جوان ہوئے تو بیٹے ظہیر میاں بھی نوکری سے لگ گئے۔ یہیں بڑے زمیندار خلیل خاں کے کاموں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ ڈھائی سو دو سو ان کے بھی آتے تھے۔ بیٹا جوان ہو تو ماں باپ کو اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ اور پھر کماؤ پوت بھی ہو تو پھر گھر میں خوشیوں کی بھری برسات برسنے لگتی ہے۔

مگر یہ تو پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کس کے نصیبوں میں کیا بدا ہے۔
بیٹی کی نسبت بھی بچپن ہی سے خلیری بہن کے بیٹے سے لگی ہوئی تھی۔ بیٹے کی شادی جیٹھانی کی بیٹی سے ہو چکی تھی۔ کسی بات کی اگلی پچھلی کی فکر ہی نہ تھی۔ اطمینان سے بیٹھے تھے کہ بیٹی جوان ہوگی تو بہن اٹھالے جائے گی۔ گھر میں جی بہلانے کو پوتا تھا۔ اور دوسرے کی آمد آمد تھی۔

مگر بیٹھے بٹھائے یہ ہوا کہ داماد سہرا ٹیکا باندھنے سے پہلے ہی کفن لپیٹ بیٹھے۔ بھرے گھر میں دھول اڑ گئی۔ جوان بیٹی کا ساتھ اور سارے میں یہ دھم ہوگئی کہ منحوس ماری ہے۔ برے بھلے میں دل کو سہارنے والے میاں تو سنگی ساتھی تھے، سو وہ بھی ان دکھوں کو سہار نہ پائے اور چین سے آنکھیں موند کر ایسے سوئے کہ پھر کبھی تو نہ اٹھے۔

"اب کیا ہوگا۔؟" عارفہ بیگم اپنے آپ میں بس یہی سوچے جاتیں اور کڑھتی جاتیں۔ میاں کا چالیسواں ہوتے ہوتے اس کڑھاپے نے انھیں بڑھاپے کی آخری سرحد پرے جاکر بٹھا دیا۔ آنکھیں سیاہ گڑھوں کے اندر چلی گئیں۔ ناک کا بانسا نکل آیا۔ ہاتھ پیر جھولا ہوگئے۔ دیکھ کر ترس آتا۔ اگر اکو ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو حالت اتنی تباہ نہ ہوتی اور اکدم سے اتنی بوڑھی نہ ہو جاتیں۔ مگر اب تو بھرے گھر میں کوئی چھپایا ہوا تھا تو بس اکو ماں۔ بیٹیوں کی جوانیاں تو پونم کا چاند ہوتی ہیں جو بادل کی اوٹ میں رہے یا نہ رہے چمکے ہی جاتا ہے۔ بادل نہ ہو تو پھر تو کیا کہنا، صاف سیدھی طرف آسمان پہ جگمگاتا رہتا ہے۔ مگر کالی سیاہ بدلیاں ڈھانپے رہیں پھر بھی اندر سے جھلک مارتا ہی ہے۔ ایسے چاند کو کون سی بدلی ڈھانپنے کا حوصلہ کرے جس نے اپنے پورے پندرہ دن پورے کر لئے ہوں۔؟

اتنے دن ہو گئے تھے، کوئی تو نہ پلٹا جہاں وہم، وسوسے اور اندیشے گھیر لیں وہاں نہ بیٹی کی خوبصورتی کام آئے نہ روپیہ پیسہ؟ سلیقہ کام آئے نہ تعلیم و تربیت۔ عارفہ بیگم کھاتے پیتے بیمار ہو گئیں۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ہنستے روتے بس یہی فکر، یہی دھن گھن کی طرح کھائے جاتی۔

"اکو ماں کا کیا ہوگا۔؟ اکو ماں کا کیا بنے گا۔؟"

یہ گت تو انھیں آج کل سے نہیں اسی گھڑی سے نظر آرہی تھی۔ جب سے کہ سلو میاں جان جوان اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ کوئی ننھی سی امید کی کرن پھر بھی باقی تھی ہی جو بھرے گھر میں اجالا کرنے کو کافی تھی؟ وہ میاں کا ساتھ تھا۔ مگر وہ کرن بھی جلتی بجھتی آخر کو دم توڑ گئی۔

سسرے کی موت نے دلہن بیگم کو شیر بنا دیا۔ پہلے یہ تھا کہ زمینداری کی

آمدنی اور ظہیر میاں کی تنخواہ مل جل کر آتی اور گھر کا خرچ چلتا تھا اور بغیر کسی چپقلش کے گزر ہوتی تھی۔ اب بھی وہی حال تھا! مگر ادھر عزیز میاں کیا مرے کہ دلہن بیگم نے یہ فرض کر لیا کہ گھر کی ساری ضرورتیں بس میرے میاں کے پیسے سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یہ خیال جو ان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا تو انہوں نے ساس نند کے دل چھید ڈالے۔ میاں کا دل پھیر دینے میں کوئی جتن نہ اٹھا رکھا۔ باپ کی موت پر جائداد بیٹے کو ملنی ہی تھی، اور ملی بھی۔ اب ماں بہن کا کیا رہ گیا تھا؟ بس دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑے کی حقدار تھیں۔ وہ میرے بھلے مل جاتا تھا۔ نہ بھی ملتا تو کیا کر لیتیں۔؟ اختر سے اگر کوئی چیز غلطی سے گر پڑ جاتی تو منہ زور جوانی کو طعنے پڑتے۔

"وہ ئی بی دیکھ کر نہیں چلتیں۔ یہ ٹکریں مارتی کیوں چلتی ہو؟ دودھ کا پیالہ گرا دیا۔ اب رات کو منا روئے گا تو کیا پلاؤں گی؟ تمہارا خون۔؟"

اس پر بس ہوتا تو سہارا جا سکتا تھا۔ مگر کنواری نند کو ایسے طعنے دیتے بھی نہ چوکتیں۔

"میری توبہ! اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ دہلیز کی مٹی اکھاڑ دی۔ یوں جوانی زور پر آئی ہوئی ہے تو جا کر میاں سے کشتیاں کیوں نہیں لڑتیں۔؟"

عارفہ بیگم سہم کر بولیں۔ دلہن بیگم کنواری بٹیا کے سامنے خدا کے لئے ایسی گمراہ کن باتیں مت کیا کرو۔ وہ کیا سوچے گی۔؟"

"اے لو۔! سنو! گمراہ کن باتیں! جیسے تمہاری بٹیا تو بڑی بھولی ہے نا۔ سکھی سہیلیوں سے گھنٹوں سر جوڑے کیا باتیں ہوتی ہیں؟ کوئی جانتا ہی نہیں جیسے۔!"

تمہارے آگے بھی اولاد ہے دلہن بیگم، یوں جھوٹے الزام نہ تراشو۔! کون اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں جڑی ہوئی ہیں کہ وہ باتیں سنھارے گی۔؟"

دلہن بیگم کو تراز نہ آتا۔ ننھے بچے کے منہ میں چھاتی گھسیڑتے ہوئے بولیں۔

"اب کیا لیا سنائیں کیا کیا دیکھتے ہیں۔ میرے بچوں کو یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ بے چاری کرے بھی کیا؟ بچوں کے لئے دل چاہتا ہوگا، مگر ماں نے تو کولھے سے لگا کر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ارمان پھلیں بھی کیسے۔؟"

اختر کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ "بھلا کون پھوپھی ہوگی جو اپنے بھتیجوں سے پیار نہ کرتی ہوگی؟ بھلا کیا میں اس لئے پیار کرتی ہوں کہ میرا جی ماں بننے کو ترستا ہے؟" دلہن بھابی اتنی گہری اور گھنی ہیں، اسے آج پتہ چلا۔ اماں تو ادھر سن ہی رہ گئیں۔

"دلہن بیگم، خدا کے لئے یوں اپنا آپ بھول کر بات مت کرو۔ بھلا کہیں کنواری نندوں کو یوں طعنے دیئے جاتے ہیں۔؟"

"اے لو، طعنے دیئے ہی کس کم بخت نے ہیں؟ جو حقیقت تھی وہ بیان کر دی۔ ایسی ہی کڑوی حقیقت طعنے بن بن دل چھیدتی ہے۔ تو بٹیا کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں؟" دلہن بیگم نے جانتے بوجھتے صاف طعنہ مارا۔

"پیدا کرنے والے نے غم دیا ہے بی بی، خوشی بھی وہی دیگا۔!" عارفہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

اکو ماں اب تک عمر کے ایسے دور میں تھی کہ جوانی کا احساس تو تھا۔ مگر اپنے مقدر کی تباہی کو اس سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کے بجائے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی کہ کنواری بیٹھی ہوں۔ سب ہی لڑکیاں ایک خاص عمر تک کنواری رہتی ہیں اور پھر ایک نہ ایک دن دلہن بن جاتی ہیں اور پھر سہاگن کہلاتی ہیں۔ دیر سویر سب ہی پر یہ سب کچھ گزرتی ہے مگر بھاوج کے آئے دن کے طعنوں نے تو اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل سی مچا دی۔ وہ رہ کر وہ اپنے سراپے کو آئینے میں جا جا دیکھتی اور سوچتی۔ "ہائے میری برات کب چڑھے گی۔؟"

اور یہ بات تو اس پر کھل ہی چکی تھی کہ منگیتر کی موت نے اسے سارے میں منحوس قرار دے دیا ہے۔ پھر کون ایسا حاجی گرنے والا تھا کہ دیکھتے بھالتے اپنے بھرے پرے گھر کی تباہی کے لئے منحوس کو بیاہ لے جاتا! سامنے ہی بوڑھی ماں تھیں جو ہر لمحہ موت کی طرف لپک رہی تھیں۔

" میں نہ ہوتی تو اماں کو یہ غم کیوں کھاتا؟" غم ہلکا کرنے کا واحد طریقہ دونوں ماں بیٹی کے پاس یہی تھا کہ آنسو بہائیں، اور اب تو وہ حد آ رہی تھی جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

ایک دن ماں نے بیٹے سے سہمے سہمے کہا۔" بیٹا ظہیر میاں جوان بہن کا بوجھ سر پر ہے۔ تمہیں فکر نہیں ہوتی؟ کوئی پیام ڈھونڈو نا، آخر کب تک کنواری کو بٹھائے رکھو گے؟"

ظہیر میاں نے نوالہ اٹھاتے اٹھاتے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولے۔" ہاں اب ہر گھر پہ جاکر دستک دونگا اور کہوں گا کہ بھئی میری ایک جوان بہن ہے، تمہارے ہاں کوئی لڑکا ہو تو میری بہن کو کر ڈالو نا۔!"

ماں نے حیرت اور بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

" دوئی بیٹا ایسی جلی کٹی باتیں کاہے کو کرتے ہو۔ میں نے بھلا یوں کب کہا۔؟"

" اور آپ کا مطلب کیا ہے؟ بس مجھے اتنا ہی تو کام رہ گیا ہے کہ مشاطہ بن کر پیام ڈھونڈتا رہوں۔ انسان دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ بھلا کیا لڑکے بازاروں میں مولی گاجر کی طرح بکتے ہیں کہ گئے اور سیر دو سیر تلوا لائے۔"

" میں نے ایسا تو نہیں کہا میاں! ہاں ذرا خیال دلانے کی بات کی تھی۔ میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی تو بہن ہے۔ تمہارے آس پاس دوست احباب تو ہوں گے ہی۔ خاندان کی بات ایسی ہے کہ سب ہی جانتے ہیں کہ سلو میاں کی جوان موت سے اکو ماں پہ یہ قہر ٹوٹا۔ باہر والوں کو مشکل ہی سے پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہہ سنکر

بات لگو اسکو تو اچھا ہی ہے ۔تمہارے چچا تایا کی اولاد ہیں، یا تو شادی شدہ ہیں یا پھر اکو ماں سے چھوٹی ، ورنہ میں آپ ہی منہ پھوڑ کر بول دیتی کہ میری بیٹی کو اٹھا لو ۔

" بھلا میرے دوستوں میں کون اس لائق ہے ؟ ابا میاں کوئی ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں ، ہماری برابری کا کون ہے ؟ "

اماں نے دبی زبان سے کہا ۔

" شکور میاں تو مجھے بھلے خاصے دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ برابری ورابری کا سوال اٹھا پھینکو بیٹے ۔بس شادی ہو جائے یہی غنیمت ہے ۔ لاکھ تمہارے باپ کا نام بڑا تھا ۔ مگر شکور میاں کے باپ بھی کون گرے پڑے ہیں ! بس غریبی سے مارے گئے ورنہ خاندان تو ایسا ہے کہ کوئی کھوٹ خرابی نہیں اور میرے خیال میں شکور میاں کی تنخواہ چار سو سے کیا کم ہوگی ۔؟ "

" اماں ! " ظہیر میاں ہاتھ روک کر بولے ۔ " پہاڑ کتنا بھی اونچا رہے، آسمان سے نیچا ہی رہتا ہے ۔ شکور میاں لاکھ امیر کبیر ہو جائیں ۔ ہماری ساکھ کو کیا پہنچیں گے ۔ میں کب نہیں کہتا کہ کھاتے کماتے نہیں ہیں ۔ مگر ان کی خود ہی ہمت نہ پڑے گی کہ اس گھر میں پیام بھیجائیں ، جہاں سے ان کی روزی بٹتی تھی ۔ "

روزی بٹتی تھی تب بٹتی تھی ، اب تو اللہ نے ناک اونچی کر دی ہے ۔ کہنے والے یہی کہیں گے نا کہ عزیز میاں کی بی بی نے اپنی بیٹی فقیروں میں دے دی ۔ سو کہتے پھریں ہماری بیٹی خیر سے اٹھ جائے گی ۔

کسی زمانہ میں جب عزیز میاں کا بول بالا تھا تب انھوں نے رحیم بیگ کے بیٹے شکور میاں کے لئے وہ کچھ کیا جو ایک باپ ہی اپنی اولاد کے لئے کر سکتا ہے ۔ محلے ٹولے کے بچے اسکول جاتے تو شکور میاں پھس پھس روتے ۔

"میں بھی اسکول جاؤں گا۔ میں بھی پڑھوں گا۔"

اسکول جانے کے لئے کتابیں لگتی ہیں، فیس لگتی ہے، اچھے کپڑے لگتے ہیں اور یہ سب ان کے پاس کہاں تھا۔؟ یوں ہی ایک دن عزیز میاں رحیم بیگ کے ہاں بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ اندر سے دھنا دھن مارنے کوٹنے کی سی آواز آنے لگی۔

"یہ آواز کیسی ہے؟" وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔

رحیم بیگ ہنسے۔" بی بی باجری کے بھٹے ٹھونک رہی ہیں۔

"ہیں؟ اس موسم میں باجری کے بھٹے کہاں سے آئے؟ وہ حیرت سے بولے۔

" اجی جناب لونڈے نے دھوم مچا رکھی ہے کہ اسکول میں ہی پڑھوں گا۔ اس کا باپ کوئی رئیس اعظم تو ہے نہیں۔ سالا پڑھے کیسے۔؟ روز وہی سبق دہراتا رہتا ہے اور کبھی ماں سے پٹتا ہے اور کبھی باپ سے۔"

عزیز میاں غصے سے بولے۔" خود جاہل رہے اولاد کو بھی جاہل رکھو گے؟ داخل کر کیوں نہیں دیتے؟ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی۔ اس کی پڑھائی میں۔؟"

شکور میاں اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ مہینے کے مہینے چپکے سے فیس، کتابیں، کپڑے، قلم اور کاغذ سب کچھ پہنچ جاتا۔ باپ کو کبھی پریشانی کا احساس ہونے ہی نہ پایا۔ وہ تو اچھا تھا کہ اختری بی کی نسبت بچپن ہی سے خالہ زاد بھائی سے طے تھی ورنہ لوگوں نے پہلے تو ٹوہ لگا کر یہی افواہ اڑانی چاہی کہ۔

"میاں جی بٹیا کے لئے بر ڈھونڈ رہے ہیں۔!"

ایک درجے سے دوسرا درجہ، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا اور پھر وہ دن آیا کہ شکور میاں نے ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اور اب تو وہ سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے تھے۔ اور مہینے کے ختم پر ساڑھے چار سو کے کرکرے نوٹ جیبوں میں ٹھونسے گھر آتے۔

شہر میں گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ماں باپ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا تھا؟۔
شکور میاں تھے تو باپ کی اولاد، مگر اپنے باپ کی ذرا تو خو بُو نہ تھی۔ باپ جھکی ہوئی ڈال تھے جس سے ملیں گے جھک کے، بیٹے سدا اکڑے اکڑے رہتے۔ عارفہ بیگم کو خالہ بی خالہ بی بولتے تھے۔ اب بچپن سے ہی آنا جانا ہو تو کون پردہ کرتا ہے۔ نہ خالہ بی سے پردہ تھا نہ اکو ماں سے۔ اب تو وہ شہر میں نوکر ہو گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ بھی ملا ہوا تھا۔ کبھی ماں باپ سے ملنے گھر آتے تو خالہ بی سے ملنے چلے آتے تھے۔ کوٹ پتلون اڑلئے ہوئے۔ اونچے، پورے وجیہ، شکیل۔ اپنے میں آپ مرے جاتے مگر نگاہ نیچے کی اوپر نہ ہوتی۔ کبھی اختر سامنے سے گزرتی تو یوں چھچلتی نظروں سے دیکھ لیتے جیسے بڑا بیگار ٹال رہے ہوں۔ نہ چہرے پر مسکراہٹ، نہ کوئی ہنسی کی جھلک۔ وہ سلام کرتی تو نظریں چرا کر جواب دیتے۔

"آداب عرض۔!" معاملہ ختم۔

بھلا عزیز میاں اور عارفہ بیگم کو پڑی بھی کیا تھی کہ ان کے اس سلوک کا برا مناتے۔ ہاں بھئی اگر بیٹی دینے دلانے کا سوال ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ مگر وہ تو بیاہی جیسی تھیں۔ مگر اب تو عارفہ بیگم کو شکور میاں کے رنگ ڈھنگ کھل کھل جاتے۔ ان کے تو سارے گھرانے کو پتہ تھا کہ بٹیا کی بچپن کی نسبت ختم ہو گئی ہے۔ منحوس تھیں یا مبارک تھیں جیسی بھی تھیں، تھیں تو ان کے محسن کی بیٹی۔ کیا جاتا اگر دلہن بنا لے جاتے؟ مگر وہ تو ایسے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔

اس دن بھی، کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے۔ خالہ بی سے ملنے چلے آئے۔ بیٹھے خالہ بی سے باتیں کر رہے تھے کہ اختر اندر سے پان لئے آئی۔ دھان پان سا جسم۔ گوری گوری رنگت۔ آنکھیں کیسی چنچل چلبلی بجلیاں سی۔ شاید نہا کر اٹھی تھی

کہ بال شانوں سے گر کر ساری پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں آ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تو کون جی ڈالا تھا کہ مر نہ مٹتا؟ مگر وہ شکور میاں کہ ایک لمحے کو چونک کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے یوں گھبرا کر نگاہیں ہٹا لیں جیسے اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو نگاہیں جل ہی تو جاتیں۔

ایسے ڈھنگ ہوں تو کوئی کیا آس باندھ سکتا ہے۔

بیٹے اگر کسی لڑکی پر ریجھ جائیں اور اڑ کر بیٹھ جائیں کہ "نہیں کروں گا تو بس اسی سے" تو ماں باپ لامحالہ ہار جاتے ہیں۔ مگر ماں باپ کسی بیٹی کو پسند کر لیں اور بیٹے کی جان کو آئیں تو بات بالکل نہیں بنتی۔ زندگی تو بیٹے بہو کو گزارنی پڑتی ہے اگر بنا مرضی گلے میں ڈھول لا کر باندھ بھی دیا تو وہ بجائیں گے کاہے؟ کون جانے رحیم بیگ اور ان کی بی بی نے دل ہی دل اختر کو بہو بنانے کے بارے میں سوچا بھی ہو مگر شکور میاں کے تیور بتاتے تھے کہ وہ تو بس خاموش ہی رہیں گے۔

اتنے پر بھی عارفہ بیگم خاموش نہ ہوئیں۔ مانا کہ شہر کی کوئی چھبانک دل پر چڑھ بیٹھی ہوگی۔ مگر پھر بھی شادی ہو جائے گی۔ اور چار بال بچے ہو جائیں گے تو خود ہی دل میں لجائیں گے۔ گھر بھر جاتا ہے تو پھر منہ نہیں پھیرا جاتا۔

ہیر پھیر سے پوچھا بھی، خود ظہیر میاں کے دوستوں نے بھی ٹوہ لگائی مگر کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔ وہ تو ہونٹ سئے بیٹھے تھے۔ نہ یہ پتہ چلا کہ مرضی ہے یا نہیں، نہ یہ پتہ کہ پھر آخر کس سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں! عجب کم بخت لوگ ہیں۔

اختر بی بی کے نصیبوں کا یہ ستارہ بھی ایک جھلک دکھلا کے چمکا اور پھر ڈوب گیا۔

(۵)

بھاوج تو چاہتی تھیں کہ جیسے بنے تیسے نند اس گھر سے ٹلے۔ ان کی چلتی تو کسی بھک منگے کو اٹھا کر دے ڈالتیں۔ مگر قسمت سے کوئی بھک منگا بھی تو نہ پلٹتا۔ بھائی جیسے بھی تھے، جو چیز لاتے دونوں کے لئے چاہیے وہ کھانے پینے کی ہو یا اوڑھنے پہننے کی۔ انھیں یہ حصہ داری بھلا کاہے کو بھاتی۔؟

"وہ ئی بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بتایا کرتیں۔ اتنی عمر میں تو ہم نے دو بچے پیدا کر لئے تھے، اور حمل ساقط ہوا وہ الگ۔"

محلے ٹولے میں شادیوں کا موسم آتا تو آئے دن دعوتیں آتیں۔ نہ جائیں تو رشتے ناطے کیسے باقی رہیں۔؟ ورنہ مغرور گنائے جائیں۔ جانا ہی پڑتا۔ اختربی پڑھی لکھی، گنول بھری، اور پھر عزیز میاں زمیندار کی بیٹی۔ اوپر اوپر چھیلی جاتیں۔ گھر والیاں ان کے ذمہ میں سارا کام لگا دیتیں۔ دلہن کا سنگھار مسی بھی وہی کریں۔ دان دہیز بھی لوگوں کو وہی بتائیں۔ بیٹیاں کام سے منہ کیسے پھیریں؟ ننھی منی دلہنیں۔ کوئی بارہ کی، کوئی تیرہ کی، کوئی چودہ کی، کوئی پندرہ کی، کسی کی بہت ہی عمر ہو گی تو سولہ کی —— حد ہو گئی سترہ —— یہ ہونٹوں پر مسی کی تہہ جماتیں تو کوئی طعنہ دل چھید جاتا۔

"وہ ئی بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بتایا کرتیں!"

سسرال کا چڑھاوا چڑھاتیں۔ کالی پوت کا لچھا پہناتیں تو سنسناتا تیر آتا۔

"یہاں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ کرے بھی کیا بے چاری۔؟"

ذہن کے اندر جو بیج سویا ہوا تھا، بھاوج نے پانی ڈال ڈال کر اگا چھوڑا۔ باہر کس قدر تیز دھوپ تھی۔ کیسی کٹھن اور تلخ زندگی! یہ پودے اگا ہی کیوں کرتے ہیں۔

کہ فضول تیخ بھری ہواؤں اور جلتے سورج کا سہن کرنا پڑے۔

خدا دعائیں نہ سنے، دلی آرزوئیں پوری نہ کرے تو انسان کا یقین ڈگمگا جاتا ہے۔ یہیں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ کفر کا فاصلہ یہاں سے کم رہ جاتا ہے۔

گاؤں کی سرحد سے لگ کر ایک ندی بہتی تھی اس سے لگ کر کالی مسجد تھی اور کالی مسجد سے لگ کر بڑے پیر کا سفید مزار۔ کہنے والے کہتے تھے یہاں مانگی گئی ہر مراد پوری ہو جاتی تھی۔ اور خصوصیت سے کنواری بیٹیوں کی ماؤں نے جب بھی پریشان ہو کر بروں کی دعا مانگی۔ دیر سویر، بر سے بھلے بر جڑ ہی گئے۔ اتنے اونچے سارے مزار کی ایک مجاور رکھوالی کرتا تھا۔ نیاز نذریں بھی وہی قبول کرتا تھا

اس دن عارفہ بیگم نے بیٹی کے ہاتھ میں چوڑیاں لاکر پہنائیں تو اختر کا جی ڈوب سا گیا۔ دل خون ہو کر جیسے بہہ اٹھا۔

"اماں یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔؟"

ماں نے بیٹی ہی سے راز چھپانا چاہا۔ "ایسے ہی منیاری والے کے پاس اچھی چوڑیاں نظر آئیں تو تیرے لئے لے آئی۔" مگر وہ مزار کی ہری باریک سی چوڑی سب سے الگ نمایاں نظر آ رہی تھی اور اختر کا منہ دیکھ کر جیسے منہ پھوڑ کر بول اٹھی۔

"نہیں نہیں، مجھے تو تمہاری اماں منت مان کر مزار سے لائی ہیں۔ میں بھلا ان بانکوں کی بہن لگتی ہوں؟۔ میں تو تمہارے سہاگ کی حسرت ہوں۔ مجھے توڑو نہیں۔ مجھے کھوؤ نہیں۔"

اختر نے بےبسی سے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

"اماں خدا کو نہ بھولئے۔ وہی سب سے بڑا سہارا ہے۔ وہی دلوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔"

گھٹنوں میں دھنسا ہوا سر، رہ رہ کر کانپتا رہا۔

کوئی دو چار دن بھی نہ گزرے ہوں گے، عارفہ بیگم چوڑی کی کرامت کی منتظر ہی تھیں کہ اس دن ان کو اکو ماں کے ہاتھ ٹھونٹھے نظر آ گئے۔

ان کا جی دھک سے رہ گیا۔

"چوڑیاں کیا ہوئیں بٹیا؟" انھوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"حمام میں ٹھوکر لگی اور ساری کرچی کرچی ہو گئیں۔ دو ایک باقی رہ گئیں تو میں نے آپ ہی پھوڑ ڈالیں" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"ہائے بیٹی ان میں تیرے سہاگ کی چوڑی بھی تھی" انہوں نے چلا کر کہنا چاہا مگر آواز وہیں کہیں دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

"منت ماننے سے سہاگ نہیں ملا کرتا اماں۔ سب قسمت کی بات ہے" اس نے رو کر کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے گلا پکڑ لیا۔

"سب قسمت کی بات ہے، سب قسمت کی بات ہے"

(۶)

عید پر پندرہ دنوں کی رخصت لے کر شکور میاں گھر آئے ہوئے تھے۔ عید سے پہلے خالہ بی سے ملنے آئے۔ خالہ بی کے دل میں چاند سا چمکا "یہ بار بار میرے گھر کے پھیرے کیوں کرتا ہے؟"

اختر باہر آئی، تو شکور میاں نے سہم کر، اور پھر چونک کر یوں جلدی سے نگاہیں ہٹا لیں کہ اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو وہ نگاہیں وہیں جل کر رہ جاتیں۔

نفرت کا وہی پرانا انداز! خالہ بی کے دل کا چاند وہیں ڈوب گیا۔

"میاں، مروت بھی کوئی چیز ہے۔ خلوص، محبت، انسانیت تو دنیا سے اٹھ ہی

گئی ہے۔ بھلا یہ شکور میاں اختر ایسی بیٹی کو کرلیں تو کیا برائی ہے۔؟ اختر ایسی دلہن سے تو گھر بھر میں جھما جھم اجالے بھر جائیں۔ مگر کرے کون۔؟ انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔

ایک دن صبح اکو ماں ناشتہ کرتے کرتے بولی۔" اماں میں نے رات بڑا عجیب سا خواب دیکھا۔"

"کیا؟" اماں نے لاپرواہی سے پوچھا۔

" نہیں اماں مجھے ایسا لگا کہ آپ اور میں، وہ کالی مسجد کے ساتھ والا اونچا سا مزار ہے نا، وہاں کھڑی ہیں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دھکا دیکر مجھے ندی میں دھکیل دیا۔ اس نے معنی خیز نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

اماں چونکیں اور چلاّ کر پوچھا۔" میں نے؟"

اختر نے سکون سے جواب دیا۔" ہاں اماں آپ نے۔"

عارفہ بیگم ہنسنے لگیں۔" واہ ری لڑکی! خواب بھی کیا دیکھا نا۔ سیدھی کروٹ سویا کر۔"

دوسرے دن ناشتے پر اختر ماں سے بولی۔

" اماں رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا، جیسے میں اور آپ مزار کے اونچے چھجے پر کھڑی ہیں اور اکدم آپ نے دھکا دیکر لوٹ دیا۔" وہ رکی اور ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔" اور اماں میں چلا رہی ہوں، میں مرنا نہیں چاہتی۔ اماں مجھے دھکا نہ دیجئے۔' مگر آپ نے ایک نہ سنی اور لولیں۔

" نیرا مرنا ہی ٹھیک ہے، اور مجھے لوٹ دیا۔ جانے کیسا خواب ہے۔!" اس نے ماں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

" روز روز وہی خواب دیکھتی ہے۔ دماغ کی کمزوری ہے ساری۔"

انھوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔
اب عارفہ بیگم سدا نئی ادھیڑ بن میں دکھائی دیتیں۔ اختر دیکھتی کبھی اماں اپنی مٹھیاں بند کر رہی ہیں، کبھی کھول رہی ہیں۔ کبھی اپنے آپ میں ہنستی ہیں، کبھی آنکھیں پونچھنے لگتی ہیں۔ کبھی خود سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔

"نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے؟" پھر خود ہی جواب دیتیں۔

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟"

ان ہی دنوں گاؤں میں جو بڑے زمیندار خلیل میاں تھے، ان کی بیوی کا یکایکی انتقال ہوگیا۔ مرنے والی اپنے پیچھے ایک کنبہ چھوڑ مریں۔ جوان بیٹیاں، جوان بیٹے، پوتے، پوتیاں، بہوئیں۔ خلیل خاں کا اتنا بڑا کاروبار، اتنی بڑی زمینداری تھی۔ گھر بھی خوب بڑا سارا۔ کھانے والے اتنے جی۔ بغیر گھر والی کے کیا پتہ بھی ہل سکتا ہے۔ ظہیر میاں ان کے ہاں نوکری تو کرتے ہی تھے۔ خلیل خاں کو رنڈوا دیکھ اپنی بہن کا خیال آگیا۔

"اگر آپ کہیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہاں بس یہ بات ہے کہ وہ ذرا بوڑھے ہیں۔"

وہ ماں سے بولے۔

"ذرا بوڑھے ہیں؟" عارفہ بیگم چلائیں۔ "تمہارے باپ ان کی جوانی میں گھٹنے برابر کے تھے۔ اچھا جوڑا ڈھونڈا ارے میاں تو نے اپنی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دیتا۔"

ایسی جگہ بیاہنے

سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔"

اک دم ان کے ہونٹ کانپ اٹھے، دل دھڑک اٹھا۔

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ اور میں اس چھجے پر کھڑی ہیں۔ اور اک دم آپ نے مجھے لوٹ دیا۔"

ان کے دماغ پر دھیرے دھیرے اختر کا خواب چھانے لگا جو وہ مسلسل تین دنوں تک دیکھتی رہی تھی۔ "اس سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔"

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے دھکا دے کر....." ان کا دل دھڑ دھڑ کر اٹھا۔ دھک...... دھک۔ تیز تیز دھڑکن۔ دھڑ..... دھڑ..... دھڑ۔ پھر دھیمی دھیمی رفتار سے دھڑکتے دھڑکتے ان کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔

جمعرات کے دن صبح ہی صبح، کہ ابھی تارے چھٹکے ہی ہوئے تھے عارفہ بیگم نے اختر کو جگا دیا۔

"بیٹی ـــ او بٹیا ـــ اکو ماں۔"

"اوں ـــ اوں ـــ جی۔" وہ کسمسا کر پھر سو گئی۔

"بیٹی اٹھو تو سہی۔ ذرا کالی مسجد تک چلیں گے۔"

"جی ـــ کیا؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"پیر صاحب کے مزار تک چلیں گے۔" وہ سکون سے بولیں۔

"کیوں؟" اس نے چھوٹا سا سوال کیا۔

"نہیں بٹیا ـــ رجب علی کی بی بی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ جمعرات کو منہ اندھیرے مانی گئی منت بالکل پوری ہو جاتی ہے۔ چل آج یوں ہی قسمت آزماتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کون سی منت ماننی ہے۔؟" وہ حیرت سے بولی۔

"دل کا سکون بھی بڑی چیز ہے بیٹی۔ بس میں آج یہی منت ماننے والی ہوں کہ خدا تو میرے دل کو اطمینان دے۔ سکون دے۔"

"اچھا چلئے۔" وہ جوتیاں ٹٹولتی ہوئی بولی، ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

ترل ـــ ترل ـــ ترل ـــ نیچے ندی کا پانی بہہ رہا تھا۔ ہرا ہرا سا، نیلا نیلا سا، صاف شفاف پانی مزار کے سب سے اونچے چھجے پہ عارفہ بیگم اور اختر کھڑی تھیں۔

"بہت سوں سے سنا ہے اندھیرے وقت صبح ہی صبح مانی گئی منت پوری ہوجاتی ہے۔ اور پھر آج جمعرات بھی ہے۔" انھوں نے ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔

نیچے پانی بہہ رہا تھا، اوپر وہ دونوں کھڑی تھیں۔

اختر نے ماں کو دیکھا ان کا چہرہ بے جان بے جان سا اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "اماں آپ اس قدر پیلی کیوں نظر آ رہی ہیں؟" اس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں! میرا چہرہ! نہیں تو!" وہ چونک کر زور سے ہنسنے لگیں۔ "تاروں کی روشنی میں پیلا نظر آ رہا ہوگا۔" اور بٹیا سچ تو یہ ہے...... وہ سنجیدہ ہوگئیں کر "ادھر جب سے تمہارے باپ کا انتقال ہوا ہے دن رات روتے روتے اور فکریں اٹھاتے اٹھاتے میرا خون سوکھ گیا ہے۔ اور خون ہی سوکھ جائے تو انسان پیلا نہ نظر آئے تو کیا ہو؟" وہ ذرا مسکرائیں۔ ان کی مسکراہٹ میں عجیب غیر یقینی انداز تھا۔

اختر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "فکروں میں جی جلانے کی کیا بات ہے اماں؟ سوچنے سے فکریں کچھ کم تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ خود کو کڑھاتی رہتی ہیں۔"

"ہاں میں خود کو خواہ مخواہ کڑھاتی رہتی ہوں۔" وہ نیچے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولیں۔ "مگر میں آج خلوص دل سے دعا مانگنے آئی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آج میرے دل کو دائمی سکون مل جائیگا۔"

انھوں نے بے جان ہاتھوں سے، کانپتے ہاتھوں سے پاس کھڑی اختر کو اپنی طرف کھینچا۔ ایک خوفناک سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ چھا گئی اور انھوں نے

اختر کو پوری طاقت سے نیچے کی طرف بوٹ دیا۔

اختر کا پھول پان سا جسم پانی میں قلا بازی کھا گیا۔ کچھ دور پر اس کا سر ابھرا، سیاہ بالوں میں چاند ایسا چہرہ چمکا اور ڈوب گیا۔ تھوڑی دور پر پھر اس کا سر ابھرا، پھر ڈوبا، پھر ابھرا، پھر ڈوبا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عارفہ بیگم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور ہونٹ پھیلے ہوئے۔ یوں کھڑے کھڑے ایک صدی ان کے سر پر سے گزر گئی۔ مُردوں کی طرح وہ اندھیری سیڑھیوں پر سے اترنے لگیں کہ اکدم کسی سے ٹکرا گئیں۔

آنے والا کوئی مرد تھا۔

"ارے آپ؟ خالہ بی! یہاں۔؟" وہ پہچان گیا۔ اک دم وہ خالہ بی کو اجالے میں لے آیا اور بڑی بے بسی سے گھبرا کر بولنے لگا۔

"خالہ بی، جانے کس نے مجھ سے بتایا تھا کہ جمعرات کی صبح مانگی ہی منتیں قبول ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب گاؤں آتا ہوں تب ماتھا رگڑ رگڑ کر دعائیں مانگتا ہوں مزار پر آکر منتیں مانتا ہوں، مگر خالہ بی ۔۔۔ مگر۔ آپ سُن رہی ہیں نا؟ مگر کبھی میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں زمین پر رہنے والا ذرہ آسمان پر چمکنے والے ستارے کی آرزو کرتا ہوں خالہ بی۔ مگر میں کس منہ سے کہوں کہ میں اختر سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟ میں تو آپ کے گھر کا پروردہ ہوں۔ بھلا آپ کیا سوچیں گی۔ ڈر کے مارے کبھی اماں ابا کے سامنے اشارتاً بھی نہ کہا کہ وہ اکدم میرا دل نہ توڑ دیں۔ میں دل ہی دل میں اپنی محبت کا درد چھپائے رہا۔ اپنی حیثیت خوب جانتا ہوں خالہ بی، اس لئے کبھی اختر کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا اس کی تمنا کیوں کروں؟ کیوں اس ناممکن سی بات کی آرزو کروں؟ مگر اب مجھ سے صبر نہیں

ہوتا خالہ بی ، آج آپ کو اکیلا پاکر میری ہمت بندھ گئی۔ میں غریب ضرور ہوں خالہ بی ، آپ لوگوں کی برابری کا دعویٰ نہیں ، مگر آپ یقین مانیے میں اختر کو بہت خوش رکھوں گا۔ بہت اچھی طرح رکھوں گا ۔ آج جمعرات ہے شاید میری دعا قبول ہو جائے ۔ ! " اس نے کندھا پکڑ کر خالہ بی کو ہلا دیا۔

" میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی ، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے ۔ یقین کیجئے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کہہ دیجئے خالہ بی۔ میری خالہ بی ۔ ! "

خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہو گئی اور ان کے خوفناک قہقہے سنسان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بری طرح شور مچانے لگے ۔

ساتواں شہزادہ

خالہ بی یوں تو مرغی کے جوڑوں کو دانہ چگا رہی تھیں، مگر ان کا سارا دھیان دھوبی کی طرف تھا۔ صحن میں ڈھیر سارے کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور سنجلی بہو بلقیس کپڑے لکھتی بیٹھی تھیں۔ سنجلی بہو کا کام بھی کیا کام تھا۔ جدھر لپکتیں سارا معاملہ چوپٹ۔ یوں کرنے دھرنے کا شوق تو بڑا تھا۔ مگر کوئی کام گت سے نہ کر پاتیں۔ پچھلے چکر میں دھوبی کو کپڑے دینے بیٹھیں تو اچکنوں اور قمیصوں کی جیبیں تک نہ دیکھیں۔ ہوتا کیا، اختر میاں کی اچکن کی جیب میں دس دس کے تین نوٹ تھے، وہ دھوبی کے گھر چلے گئے۔ دھوبی تھا تو پہچان کا، برسوں سے کپڑے لاتا لے جاتا تھا، مگر تیس روپے دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ صاف مکر گیا کہ میں نے دیکھے ہی نہیں۔ دیکھتا تو واپس نہ کر دیتا۔؟

خالہ بی کا غصہ بہو پر تھا اور بہو کا غصہ جیٹھ پر۔

"اے واہ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے اتارتے وقت اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیں۔"

"اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دیتے وقت ذرا جیبوں کا جھٹکا ہی لے ڈالیں مرد مرد ہی ٹھیرا۔ آخر عورتوں کا اور کون کام ہوتا ہے بی؟ الٹے غصہ دکھاتی ہو۔"

تب کی بات بہو بیگم کو یاد تھی۔ ہر کپڑے کو بڑی احتیاط سے جھٹکوا رہی تھیں خالہ بی الگ دیکھ رہی تھیں۔ اک دم بلقیس نے ایک اچکن کی جیب سے ایک پوٹلی برآمد کر لی۔ جلدی جلدی گرہ کھول کر دیکھا دو دو پیسے میں ملنے والی دو گلابی پلاسٹک کی پینپیاں اور ننھے بچے کے منہ میں دینے کا ایک ربر کا نپل۔

اماں دیکھتی ہیں یہ کیا ہے؟" انھوں نے منہ میں ڈال کر زور سے سانس کے کان کے پاس سیٹی بجادی۔ "کیا ہے؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کھلونے!"

"تو کیا ہوا؟" خالہ بی جواری کے دانے آنگن میں پھینکتی ہوئی بولیں، "ڈھیر سارے تو بچے ہیں گھر میں، کسی کے بھی ہوں گے۔ رکھ دو وہاں میز پر۔"

"بات تو سمجھتی نہیں آپ۔ یہ چھوٹے بھیا کی جیب سے نکلے ہیں۔ ہاں۔" وہ چھوٹے بھیا پر زور دے کر بولیں۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہوئی؟ نکلے ہوں گے چھوٹے کی ہی جیب سے۔ پھر؟" بلقیس جھلا گئی۔ "تو کیا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔؟"

"جا چھوکری تیری تو عقل ہی پلٹ گئی ہے۔ ارے اتنے سارے بھائی بھتیجے ہیں، کسی کے لئے بھی لایا ہوگا۔"

"بھائی بھتیجوں کے لئے لاتے تو دے نہ دیتے، گرہ لگا کر کیوں رکھتے۔؟"

اب کہ خالہ بی نے ذرا غور سے بہو کی صورت دیکھی۔ "دلہن تمہارا مطلب میں ابھی نہیں سمجھی۔"

"اب آپ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں تو میں کیا کروں۔؟" وہ اکتا کر پھر کپڑوں پر پل پڑیں۔

خالہ بی کا سارا قصہ اس رانی جیسا تھا جس کے ایک نہ دو پورے سات بیٹے تھے۔ اور یہ تو ہوتا ہی تھا کہ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد خوبصورت اور بے حد ذہین ہوتا تھا۔ (بہادر ہونا تو خیر لازمی تھا۔) ملک ملک کی خاک چھانتا اور پھر شہزادی بدر کمال (یا پھر شہزادی گلرخ) کو کھوج نکالتا۔ بڑی دھوم دھام سے راجدھانی کو لوٹتا تو ساتھ میں اپنے باپ کی چھنی ہوئی سلطنت بھی دوبارہ حاصل کرتا آتا۔ بس چھوٹے میاں کا بھی عین دونوں ہی حشر تھا۔ سب میں چھوٹے تھے۔ سب میں خوبصورت

اور کہانی کے شہزادے کی طرح ماں باپ کے لاڈلے بھی۔ اوپر کے چھ بیٹوں کی تو شادی ہوگئی۔ مگر چھوٹے میاں ابھی کنوارے ہی تھے۔ عمر بھی بہت کہاں تھی۔ بس یہی کوئی چوبیس پچیس کے اندازے میں تھے۔

وضعدار گھرانوں میں ہوتا ہے کہ ماں باپ جہاں بات لگا دیں بیٹے بغیر کسی پس و پیش کے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ باپ پیٹ کی اولاد کا برا کیوں چاہیں گے؟ ان کی بات نہ ماننے کو کوئی تو حوالہ ہو۔ خالہ بی کی ساری بہوئیں اپنے ہی خاندان کی تھیں۔ کوئی ماموں کی بیٹی کی نند، کوئی خالہ زاد بہن کی بیٹی، کوئی بھتیجی تو کوئی بھانجی۔ خالہ بی کا گھر بھرا پڑا تھا۔ چھوٹے میاں کی شادی کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی؟ مگر وہ جو ہر ماں کی خواہش ہوتی کہ "بس بیٹے کا سہرا دیکھ لوں" وہی خواہش یہاں بھی ابھری۔ بیٹی تو دیکھی بھالی ہی تھی، بڑی بہو کی چھوٹی بہن، خالہ کی آنکھوں میں اب تب سے نہیں اس وقت سے چڑھی ہوئی تھی۔ جب بڑے بیٹے کے آرسی مصحف کے وقت لال لال اطلس کا جھم جھاتا جوڑا پہنے ایک چھوٹی سی لڑکی صندل کی کٹوری لیے آئی اور آتے ہی ادھ بھنگے پن سے بولی۔

"بھیا! ہم آپ کے صندل لگائیں گے تو نیگ دیں گے نا آپ؟"

اتنی پیاری صورت، ایسی بھولی ادائیں کہ سارے لوگوں کی نگاہیں جیسے اس پر جم گئیں۔ اور تو جانے کتنوں نے کیا کیا سوچا ہو گا۔ مگر ادھر خالہ بی نے تو بس تہیہ ہی کر لیا کہ سیانی ہوتے ہی اسے بھی اپنے گھر کا اجالا بنا لوں گی۔ مگر بات اپنے دل میں ہی رکھی۔

بڑے گھروں کے کھاتے پیتے بچے جلد ہی جوان ہو جاتے ہیں اور پھر لڑکیاں تو یونہی شرط باندھ کر بڑھتی ہیں۔ کوئی سال بھر بھی نہ گزرا ہو گا کہ بڑی دلہن کے میکے

سے بلاوا آیا۔ بھائی لینے کو آئے۔ اب بہن بڑی حیرت زدہ کہ ہائے اللہ کوئی کار نہ کاج، تقریب نہ جلسہ، یہ بیٹھے بٹھائے بلاوا کاہے کو آیا۔؟ بھائی سے پوچھا تو یہ بھی بس اتنا ہی بولے۔

"مجھے تو معلوم نہیں۔ اماں نے کہا جا کر لے آؤ۔ بس میں چلا آیا۔"

بڑی دلہن تو کچھ نہ سمجھیں۔ مگر خالہ بی ہنسنے لگیں۔

"اے دلہن تم بھی بس پوری وہ ہو۔ اتنی بات نہیں سمجھتیں لڑکی ذات کا معاملہ ہے۔ اب کیا سمدھن پورے خاندان میں رقعے بانٹ بانٹ کر دوپٹہ اڑھائیں گی بٹیا کو۔؟ چلی کیوں نہیں جاتیں۔؟"

بات وہی نکلی جو خالہ بی نے سمجھی تھی۔ ماں باپ تو فکرمند ہوئے ہوں گے کہ چھاتی پر بوجھ پڑا، مگر خالہ بی کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے کہ چلو اب بہو اپنی ہوئی۔

ادھر یکے بعد دیگرے سب بھائی دولھے بن گئے تھے، اور نیچے کے دو بھائیوں کے منڈوے بھی ساتھ پڑے۔ نکاح خوانی بھی ساتھ ہی ساتھ ہوئی اور اپنی دلہنوں کو گود میں اٹھا ساتھ ہی ساتھ پالکی میں بٹھایا۔ اب رہے کون؟ وہی چھوٹے میاں! اب چھوٹے میاں تو لاڈ دلار کے تھے ہی۔ پہلے اور آخری کاج پر تو یوں ہی زیادہ دھوم دھڑ کا ہوتا ہے۔ اور چونکہ چھوٹے میاں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ بھی گئے تھے، اس لئے بھی ان کے وقت زیادہ ہنگامہ ٹھیرا۔

خالہ بی کو کیا اپنے بیٹوں سے ایسی امید ہو سکتی تھی کہ ان کے ہاں کرتے وہ ناں کریں۔؟ پوچھتیں گچھتیں بھی کیوں۔؟ رمضان کی عید کے بعد پیغام بھجوا دیا۔ غیر خاندان کے ہوں۔ چال چلن میں کھوٹ چوٹ کا ڈبکا ہو تو جواب میں دیر ہوتی ہے۔ چھان بین کرتے کرتے ہی دن نکل جاتے ہیں۔ یہاں تو اپنے ہی گھر کی سی

بات تھی۔ بقرعید کے بعد جواب بھی مل گیا اور چھوٹے میاں کو پتہ چلا تو کب چلا جب خالہ بی نے منگنی کے پھول پہنانے انھیں مسند پر آ بیٹھنے کو کہا۔

"مگر کس تقریب میں؟" انھوں نے ہنس کر کہا۔

"اے چل باتیں بناتا ہے۔ اب اتنا بھی پتہ نہ چلا ہوگا کہ یوں اتراکر پوچھ رہا ہے۔"

چھیوں بھابھیاں ہنستی کھڑی تھیں۔ منجھلی بھابی بلقیس ہنس کر بولیں۔

"اس لئے کہ اب چھوٹے شہزادے کی باری ہے۔"

سب ہنسنے لگے مگر چھوٹے میاں پھر بھی نہ سمجھ سکے۔

"مگر کاہے کی باری بھئی۔؟"

"اجی جناب اب آپ کے دولہا بننے کی باری ہے۔"

ادھر قہقہے اڑے اور ادھر ان کا جی ڈوب گیا۔

"مگر۔۔۔ مگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو۔؟"

"اے چل بڑا آیا۔ ہم سے بڑھ کر تیری عقل ہوگئی شاید" اماں بڑے پیار سے ہنس کر بولیں۔ بھلا پوچھتے بھی تو کیا جواب دیتا؟ کیا نا کر دیتا۔؟"

چھوٹے میاں نے منگنی کے پھول پہنے تو سہی، مگر نئے نئے دلہنوں پر ایسے موقعوں پر جو خوشی چھاتی ہے وہ ان کے چہرے پر دور دور تک نہ ملتی تھی۔

بیٹی والوں کا منہ ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ بیٹے والے کچھ کہیں تو جواب دیں ورنہ منہ پھوڑ کر تو بول نہیں سکتے۔

"بات تو ہو بھی گئی بھئی، اب بیٹی اٹھا کیوں نہیں لیتے؟"

ادھر بیٹے والے ایسے مٹے تھے کہ سر سر مہینے گزرتے جا رہے ہیں۔ نہ ہوں نہ ہاں۔ اِدھر اُدھر سے پتہ بھی چلایا۔ مگر نہ کھلی۔ پھر بڑی بہن کی زبانی معلوم

ہوا کہ چھوٹے میاں اپنی ٹریننگ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ ختم ہوئی تو ملازمت کریں گے، پھر کہیں جاکر شادی وادی کے بارے میں سوچیں گے۔ صرف سوچیں گے، کرنے کا پھر بھی طے نہ تھا۔

باپ کا بچوں پر وہ رعب تھا کہ ان کے سامنے آتے ہی کانپنے لگتے۔ اور ادھر وہ گھر میں گھسے اور بچے اِدھر اُدھر کھسکے۔ خالو میاں چاہتے تو آج ہاتھ پکڑ منڈوے تلے بٹھا دیتے۔ "بوا بے قبول ہے لڑکی۔" اور میاں جی کی اتنی مجال نہ ہوتی کہ ناپسند ہونے پر بھی انکار کر سکتے۔ مگر خالو میاں نے جو دیکھا کہ چھوٹے میاں ٹریننگ کے بوجھ سے یونہی سوکھے جا رہے ہیں۔ بس ڈھیل دے دی۔

"کام کا بار آپڑا ہے بے چارے پر۔ ایسے میں گرہستی میں الجھا دیں تو صحت بالکل ہی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور کیا ابھی سے بوڑھا ہونے نہیں جا رہا۔"

دیوروں، بھاوجوں کی محفل جمتی تو رنگا رنگی باتیں ہوتیں۔ سنجلی بہو سدا ساس کے دل پر چڑھی رہنا چاہتی تھیں۔ اور موقع ملنے پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ساس سے جا لگاتیں کہ وہ انھیں اور زیادہ چاہنے لگتیں۔ مگر اس دن خالہ بی نے بلقیس دلہن کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ جب انہوں نے جاکر سنایا۔ "اماں، سنا کچھ۔ چھوٹے بھیا تو کہتے ہیں میں تمام عمر شادی ہی نہیں کروں گا۔"

اماں نے چونک کر دیکھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔!"

"اے لو میرے دماغ کو کیا ہونے چلا ہے؟ چھوٹے میاں آپ ہی کہتے کہتے، سو میں نے آپ سے کہہ دیا۔"

"ہو نہ ہو کوئی وجہ بھی ہوتی۔!"

"اے یہ تو ان کا اپنا دل جانے۔"

"بات ہیں کوئی ڈھنگ بھی ہو مگر۔"

"بلقیس بی ہنس کر بولیں۔" اماں کہانی والے شہزادے کی طرح وہ تو بس کوئی شہزادی ہی لائیں گے۔"

خالہ جی بدک کر بولیں۔" کیوں ' بانو ' کیا کسی شہزادی سے کم ہے۔؟"

" اب تو وہی جانیں جو انکار پر تلے بیٹھے ہیں۔"

بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بس خالہ بی کے جی کو لگ گئی۔ چھوٹے میاں گھر میں آتے تو خالہ بی ایسی کوری کوری نظروں سے ان کا جائزہ لیتیں کہ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک ٹھٹھک جاتے۔

ایک دن رات کے کوئی گیارہ بجے چھوٹے میاں گھر لوٹے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ ملازم باہر ہی سوتا تھا، اس نے بڑے دروازے کی کنڈی کھول دی اور یہ گھر میں آگئے۔ خالہ بی کو تو مانوس قدموں کی چاپ سن کر سونا دوبھر ہو گیا سر اٹھا کر بولیں۔

" کہاں گیا تھا چھوٹے میاں۔؟"

چھوٹے میاں پہلے تو ذرا گڑبڑائے پھر سنبھل کر بولے۔" رات کا شو دیکھنے چلا گیا تھا۔"

" اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔؟"

" بھول ہو گئی اماں بی۔ دوستوں نے گھیرا اور بس لے کر چلے ہی گئے۔"

خالہ بی نے بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ جوان جی ہے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگرانی ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ چھوٹے میاں کو روز ہی دوست گھیرنے لگے۔ کریم ان کا یار غار بن گیا کہ وہ دبے پاؤں راتوں کو آتے اور یہ دھیرے سے دروازہ کھول دیتا۔

رمضان کے تیس روزے ختم ہو چکے تھے۔ جمعہ کو عید پڑتی تھی۔ جمعرات کی رات

خالہ بی اپنی تمام بہوؤں کے ساتھ شیر خورمے اور سیویوں کے لئے میوے تیار کرتی بیٹھی تھیں۔ ایسے کام کاج میں تو رات یوں بیت جاتی ہے۔ ادھر صبح ہی صبح ننھے بچے کپڑوں کے لئے غل غپاڑہ مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کی بھی برابری کرنی ہوتی ہے۔ نمازیوں کی گڑ بڑ، بچوں کی گڑ بڑ۔ پھر خود عورتوں کے نہانے دھونے۔ سب مائیں اپنی بچیوں کے ریشمی رنگین اور بچوں کے گلابی نیلے کپڑے اور اچکنیں نکال نکال کر اوپر ہی رکھ رہی تھیں۔ کہ صبح صبح پھر گڑبڑ نہ مچے۔

چھوٹے میاں کو معلوم نہ تھا کہ آج گھر بھر میں رت جگا پڑا ہے۔ یوں ہی اپنے پیچھے دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر داخل ہوئے تو سٹ پٹا گئے۔ چراغوں کی دھما دھم روشنی میں دیکھتے کیا ہیں کہ اماں تو بن گش پہ کھوپرہ چھیلتے بیٹھی ہیں۔ اور بھابیوں نے مارے خوشی اور اودھم کے رات کو دن سمجھ رکھا ہے۔

خالہ بی نے دیکھا ضرور، مگر ٹال گئیں۔ اگر بولنے پر اتر آتیں تو پھر بولتی ہی چلی جاتیں اور پھر صبح عید کا دن تھا کہ برس کے برس یہ دن آتا ہے۔ اگر فضول میاں منہ پھلا کر بیٹھے رہے تو غصہ غصے میں ساری خوشی ملیا میٹ ہو جائے گی۔ سمجھانے بجھانے کے اور بھی تو کئی دن ہوتے ہیں۔! بس اتنا ہی بول کر رہ گئیں۔ "اے میاں یہ کوئی آنے کا وقت بھی ہوا؟ دیکھ لو دو ڈھائی سے کم کیا بج رہے ہوں گے؟ اور پھر اپنے کھانے دانے کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں؟ روزہ کہاں افطار کیا تھا۔؟"

چھوٹے میاں کے دم میں دم آگیا۔ سانس لے کر بولے۔ "ایسے ہی ایک دوست نے روک لیا"

"اتنی رات گئے تک۔؟" خالہ بی حیرت سے بولیں۔

"اور کیا۔ اتنا کہتا رہا جانے دو، جانے دو، مانا ہی نہیں۔ میں تو تب ہی چلا آتا تھا۔"

"اچھا دوست ہے موا۔" خالہ بی اتنا کہہ کر کھو پرہ گھسنے لگیں۔ کھڑے ہوئے بن سمیٹ کر انھوں نے تھال میں رکھ دیئے اور خود جا کر سماوار سے ٹونٹی کھول وضو بنانے لگیں۔ خالہ بی ہر جمعرات کی رات کو سوتے وقت یٰسین شریف پڑھتی تھیں کہ گھر میں رزق کی برکت ہوتی ہے۔ بچپن کی عادت بڑھاپے تک ساتھ دے گئی۔ وضو بنا کے اٹھیں تو دیکھا کہ ان کا اپنا قرآن شریف طاق سے غائب ہے۔ چڑ کر بولیں۔

"توبہ ہے ــــ ان بچوں نے کسی چیز کا ٹھکانہ نہ رکھا۔ میرا کلام مجید کس نے اٹھایا؟"

منجھلی دلہن کے بچے سارے گھر میں اپنی شرارت کی وجہ سے بدنام تھے۔ یہ طعنہ تو صاف ان ہی پر جاتا تھا۔ الجھ کر بولیں۔ "ابا میاں لے گئے تھے بھلا بچے کیوں اٹھاتے؟"

"اور ابا میاں کیوں لے گئے تھے۔"

"یہ وہ خود جانیں، کوئی کیا کہے۔"

بلقیس دلہن بولیں۔ "انھوں نے اپنا والا کلام مجید ایک مانگنے والے کو دیدیا۔ بے چارے کی ماں مر گئی تھی تو وہ کچھ پڑھ کر بخشنا چاہتا تھا۔ اور گھر میں کلام مجید نہ تھا۔ سو ابا میاں نے کلام مجید دے ہی دیا۔؟"

"اچھا کیا، مگر اب میں کا ہے میں تلاوت کروں؟" گردن اونچی کر کے دیکھا تو طاقچے تک ان کا ہاتھ نہ جاتا تھا۔ آواز دیکر بولیں۔

"ارے چھوٹے ذرا یہ یٰسین شریف تو اتار دیو۔"

چھوٹے میاں آواز سنکر آ تو گئے تھے۔ مگر یہ بات سن کر وہیں رہ گئے۔ کھنکار کر بولے۔ "میں باوضو نہیں ہوں۔"

"اے میاں تو سامنے ہی تو سماوار دھرا ہے، وضو کو کون ایسے گھنٹے لگتے ہیں؟"

منٹ بھر تو یوں ہی الوؤں کی طرح کھڑے رہے، پھر بولے۔

"میں باہر سے ابھی منٹ بھر میں آتا ہوں۔"

اللہ جانے وہ منٹ کتنے گھنٹے کا تھا کہ خالہ بی کی ٹنگڑیاں دکھ دکھ گئیں۔ اوب کر اپنی بہوؤں سے بولیں۔

" وہ لی' دیکھاری لڑکیو! میں یہاں کھڑی کی کھڑی ہوں اور وہ موا ایسا غائب ہوا کہ پلٹا ہی نہیں۔"

بلقیس نے دالان والے کمرے میں جاکر کھڑکی سے مردانے میں جھانک کر دیکھا تو چھوٹے میاں خرخر کرتے پڑے سو رہے تھے۔

آج خالہ بی کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا۔ انھیں یاد آیا ابھی کچھ ہی دن پہلے حضرت کے نام کی فاتحہ دلوائی تھی۔ خالہ بی لاکھ بلاتی رہیں مگر چھوٹے میاں یوں ہی مکر گانٹھے پڑے رہے۔ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بستر ے میں لمبے لمبے پڑے ہی رہے لاکھ لاکھ ماں نے خود خوشامد کی۔

"ارے موئے فاتحہ میں تو شامل ہو جا، برکت اترتی ہے۔"

کس کی فاتحہ؟ کہاں کی برکت؟ وہ ہلے بھی نہیں۔ بڑی دیر بعد اٹھے بھی تو پہلے غسل خانے کی خبر لی۔ نہا دھو کر سفید براق کپڑے پہنے اور ماں سے آکر بولے۔

"کھلائیے کیا پکایا ہے۔؟" خالہ بی نے غور کیا تو یاد آیا کہ صاحبزادے رات کو پھر دیر سے لوٹے تھے۔

بھابیوں میں بات جا پہنچی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خالہ بی بھی جا پہنچیں۔

" اماں تو مانتی ہی نہیں، میں کہتی ہوں حضرت بُری باتوں میں پڑ گئے۔"

خالہ بی کو بھڑک کر غصہ آگیا۔ " اے میں کہوں جوان بچہ ہے گھر میں جو دل نہیں

"بچہ نہیں، ایسے میں اگر گانا دانا سننے کہیں چلا گیا تو کیا برائی ہوگی۔؟"

"گانے دانے کا نام نہ لیجئے اماں بی۔" منجھلی دلہن بولیں۔

"صاف سیدھی طرح کہئے نا کہ کوٹھے پر گئے تھے۔ فاتحہ تک میں تو شامل نہیں ہوئے۔ اور پھر یہ سب کیا ہے؟ راتوں کو گیارہ بارہ ایک سے پہلے تو لوٹتے نہیں۔ چپ نام کر رکھا ہے کہ ٹریننگ لے رہے ہے۔ ٹریننگ ہے نہ وریننگ، دوسری ہی ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ اور کیا بہنا ہم نے بھی ڈھیر سارے بچے کچھ یوں ہی نہیں جن لیئے۔ ہزار بار دیکھا ہے کہ جب تک نہا دھو نہ لیں نماز کے کمرے میں پھٹکتے تک نہیں ہیں۔ ایسے تو کوئی اندھا بھی جان جائے کہ پانی کدھر کو بہہ رہا ہے۔ اب یوں کوئی آنکھوں پر پردہ ہی ڈالنا چاہے تو کیا کہہ سکتے ہیں؟" عزیز میاں کی بیوی نے صفا ساس پر چوٹ کی۔

عید کا دن نکلا، گھر بھر میں چہل پہل مچ گئی۔ رنگین ریشمی سرسراتے کپڑے۔ بچوں کی چینخم چانخ! خالہ بی کا نوکروں پر گرجنا برسنا! بیبیوں کے سنگھار پٹار بس سارے گھر میں دھماک دھبا ہونے لگی۔ یہاں وہاں اِدھر اُدھر بس دھائیں دھائیں مچ گئی۔ دستر خوان بچھا۔ پورا گھر آ بیٹھا۔ خالہ بی نے طرح دے دی۔ اتنی اتنی باتوں پر روک کرنے سے بچے اور بگڑ دل ہو جاتے ہیں۔ پیار دلار سے ہر ایک کو کھلا پلا رہی تھیں۔ چھوٹے میاں کھا تو کیا رہے تھے، بس نوالے ٹھونگتے بیٹھے تھے۔ خالہ بی نے بوڑھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور سمجھا مگر ٹال ٹال گئیں۔ چھوٹے میاں یوں کھا رہے تھے جیسے نوالے حلق میں اٹکتے ہوں۔ ماں نے جبر کرنا شروع کیا تو یوں ہی اٹھ کھڑے ہوگئے۔ "بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے اماں۔"

خالہ بی کے دل کو مستقل دھکدھکی لگ گئی۔

ذاکر میاں کی بی بی کو بس آجا کے یہی چھن تھا کہ گھر بھر کی صفائی کرتی پھریں مہینے پندرہ دن میں جھاڑو لے کر اٹھتیں اور پھر پورے گھر کو کھود ڈالتیں صفائی کرتے کرتے چھوٹے میاں کے کمرے کی باری آئی۔ کرسی ہٹائی، میز اٹھایا، پلنگ اٹھایا، الماری جگہ سے کھسکائی اور پھر جھاڑ جھٹکی کر کے، ایک ایک چیز سینت کر رکھنے لگیں۔ اتفاق سے الماری کا قفل رہ گیا تھا۔ پٹ کھولا! جالے گچھے گچھے بھرے ہوئے، نیچے اوپر دھول ہی دھول۔

"توبہ ہے اللہ! اتنی گندگی میں رہا کیسے جاتا ہے ان سے۔؟"

الماری کے خانوں سے سامان اٹھا اٹھا کر نیچے رکھنے لگیں کہ خانوں کی صفائی ہو جائے۔ تو چیزیں پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ دیکھتی ہیں تو سامنے ہی شہد کی شیشی اور ارنڈ کے تیل کی چھوٹی سی بوتل۔ پھر ادھر ادھر ہاتھ مارا تو چھوٹے چھوٹے موزے اور ننھی منی دو مین نیکریں اور کپڑے ہی آ گئیں۔

"ہائے اللہ! سارا سامان ایسا جیسے کسی کی زچگی کی تیاری ہو"

ان کی اپنی زچگی ہوئی تھی تو پہلے ہی دن اماں جان نے شہد منگوایا تھا۔ اور پھر یہ ارنڈ کا تیل؟ چھوٹے چھوٹے کپڑے اور یوں الماری میں چھپائے ہوئے۔!

ایک ہی جھپاکے میں وہ دیورانیوں جٹھانیوں کے جھٹے میں بیٹھی ساری روداد سنا رہی تھیں۔

"اور کیا ہم نے بچے نہیں جنے۔؟"

"وہی تو میں کہوں کہ شادی کے نام سے نئے گھوڑے ایسا بدکتے کیوں ہیں۔"

"ڈال لیا ہے کسی لڑکی بڑی کو اپنے گھر"

بات اتنی بڑھی تھی کہ ہلکے بیٹوں والی بہوؤں کے پیٹوں میں نہ رہ سکتی تھی۔ خالہ بی کو پھر بھی اپنا بیٹا ہی معصوم دکھائی دیا۔

"اے لو حد ہو گئی! گھر میں بچے کچے ہیں ہی، خیال سے لے آیا کہ وقت پر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو جلدی مل جائے۔ ایک تم ہو کہ طومار باندھے لیتی ہو۔"

"وہ تو آنے والا وقت آپ ہی بتا دیگا۔ ہاں۔"

دوسرے دن محض ساس کی چوٹم چوٹ پہ ذاکر میاں کی بی بی نے الماری کا پٹ کھولا تو سب چیزیں غائب تھیں مطلب یہ کہ حق حقدار تک پہنچ گیا تھا۔

اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ آئے دن بہوئیں ساس کو قائل کرنے دیور کی چوری پکڑ لتیں۔ کبھی جیب سے پیپی نکل رہی ہے تو کبھی کوٹ میں سے ربر کی چڑیا، کبھی مٹھائی تو کبھی نیل، خالہ بی جان بوجھ کر انجان بنی رہیں۔

خالہ بی کا ایک خیال تو اپنی جگہ یہ تھا کہ جان جوان جی ہے۔ اگر ادھر اُدھر جھاتک تانک کرے تو برائی نہیں بلکہ قابل معافی ہے۔ مگر چھوٹے میاں تو اتنے دیوانے بن گئے تھے کہ سچ مچ کے دیوانے بھی ان کے سامنے سیانے تھے۔ اللہ جانے دل میں کیا سمائی، بانو کی معصوم جوانی پہ رحم آیا یا خود اپنا ہی راستہ صاف کرنا تھا کہ پھوپھی کے یہاں جا پہنچے اور بولے۔

"بانو بہن کے لئے میں نے ایک بہت اچھی جگہ بات لگائی ہے۔"

"بانو بہن۔؟" پھوپھی بی حیرت سے چیخیں۔ "لے میاں ہونے والی بی بی ہے۔ بہن بھانجی کا رشتہ باندھو گے تو نکاح کہاں قبول ہوگا۔؟"

"نکاح کرتا ہی کون کم بخت ہے؟ میں نے شروع ہی سے اسے اپنی بہن مانا ہے کیونکہ اللہ نے مجھے خود کوئی بہن نہیں دی۔ وہی تو کہتا ہوں کہ بہن کا کچھ حق بھائی پر

لگتا ہے۔ ایسی جگہ بات لگائی ہے کہ بہن بھی ساری عمر بھائی کو دعائیں دیتی رہے "
پھوپھی بی چھالیہ کی جگہ اپنی انگلی کتر گئیں۔ یہ گل بھی کھلنا ہی تھا سو کھل کے رہا۔ بات چیت کا انداز ایسا سنجیدہ تھا کہ پھوپھی بی کو ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہ آیا۔

چھوٹے میاں کے اپنے دوست تھے شمیم میاں، شہر میں تین تین دوکانوں کے مالک۔ عمر بھی بس ان کے لگ بھگ۔ چاہتے تھے کسی شریف خاندان کی کوئی بیٹی اٹھائیں، چاہے غیر ہی کیوں نہ ہو۔ باپ مدت ہوئی مر چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھیں یا یہ خود۔ جو بھی بیٹی بیاہی جاتی لعلوں کی لعل رہتی۔ صورت شکل بھی ایسی کوئی بری نہ تھی۔ انہوں نے پھوپھی بی کو ایسی لچھے دار باتیں سنائیں کہ وہ بھی راضی جیسی ہو گئیں۔ اے اب جسے کو بھرے دل سے، بھرے منہ سے، بہن کہہ کر پکار لیا، لاکھ وہ خون کے رشتے بہن نہ ہوئی مگر پھر بھی بہن کا مان ہی اولی ہوتا ہے۔ یہ تو حرام کرنا ہو گیا اور پھوپھی بی چھوڑ کوئی بھی اس بات پر کیا راضی ہو سکتا تھا کہ لے کر بہن کو بھائی سے بیاہ دیں۔ یہ تو دین دنیا دونوں میں روسیاہ کر دینے والی بات ہوئی۔ صاف صاف لفظوں میں چھوٹے میاں نے اونچ نیچ بھی سمجھا دی کہ برائے خدا آپ بات کو یوں مشہور نہ کریں ورنہ لوگ تو ہوتے ہی ہیں ایسے کہ کسی کا بنتا کام بگاڑ دیں اور اس پر بھی یوں خوش ہوں جیسے کمال کر دیا ہے۔ کسی کا گھر جلے، بجائے بجھانے کے تاپنا شروع کر دیں۔

ایسے گپتا گپتی شادی کی تیاری شروع ہوئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سال چھ مہینے کو بڑی بہو میکے جاتی تھیں، اب کے سے جو آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بھرے گھر میں ہلور مچی ہوئی ہے۔ کپڑے گوٹے پٹھے کا جیسے بازار کھلا ہوا ہے۔ بیٹھک میں سنار بیٹھا ٹھک ٹھک گہنے گھڑ رہا ہے۔

ادھر گودام میں اناج کی اٹھا پٹخ ہو رہی ہے تو دیواروں پر رنگدار قلعی پھر رہی ہے۔ بات کا پتہ چلا تو ہک چک ہی رہ گئیں۔ مگر عقل سے سوچا تو خوش ہو گئیں کہ چلو ٹھیک ہی ہوا۔

چھوٹے میاں کا کیا تھا؟ رات ڈھلے رات آنا۔ باؤلوں کی سی شکلیں بنائے پھرنا۔ نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کا دھیان۔ اور ٹریننگ کے بعد بھی بڑے ملتے تو وہی تین چار سو روپلی۔ یہاں تو بارش ہوتی تھی اور بڑی بات یہ کہ لڑکا اتنی چاہت سے کر رہا تھا۔ ذاکر میاں کے بڑے بیٹے کے ختنے ہوئے تھے، پورے دوست احباب جمع ہوئے تھے۔ پھوپھی بی بھی مدعو تھیں۔ چھوٹے میاں نے غالباً آگے ہی سب طے کر رکھا تھا۔ لپکا جھپکی میں بانو کا دیدار شمیم میاں کو بھی کروا دیا۔ اور وہ تھے کہ صحراؤں کی خاک چھانے بنا ہی مجنوں ہو گئے۔

ادھر چھوٹے میاں کی ٹریننگ ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے اور خالہ بی خوش بہ خوش تھیں کہ چلو خدا نے وہ دن بھی دکھایا کہ اب چھوٹے بیٹے کے پھول کھلتے دیکھیں اب شادی ہو گی تو آپ ہی سنبھل جائیں گے۔ اس دن بچوں کے گھیرے میں بیٹھی ہنس بول رہی تھیں کہ باہر سے ڈاک اندر بھجوائی گئی۔ نیلے نیلے رقعے نظر آئے تو خالہ بی نے بہوؤں کو آواز دی۔

بلقیس بی نے ایک رقعہ اٹھا لیا اور بیچاپ ہو کر بولیں۔

"ہائیں! یہ تو بڑے پھوپھا کی طرف سے ہیں۔"

"کس سلسلے میں مگر۔؟" خالہ بی چونک کر بولیں۔

"سلسلہ؟ سلسلہ یہی شادی کا۔"

"ہائیں؟" خالہ بی اور اچنبھے میں پڑ گئیں۔ "دو دُلہی کس کی شادی؟

کچھ آگے پڑھو گی بھی؟"۔

"صاف تو لکھا ہے۔" سنجلی دلہن نے ایک کنگورے دار گلابی رقعہ سامنے نچا دیا اور زور سے پڑھنے لگیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

بتقریب

عقد سعید نور چشمی ساہیا

شرکت محفلِ عقد و تناولِ طعام کا متمنی۔

حاجی عنایت علی خاں زمیندار

بتاریخ ۲۵ ر ذی الحجہ ۷۶ — مقام:۔ لال حویلی

روز پنجشنبہ، بعد مغرب — حیدرآباد دکن

خالہ بی الجھ کر بولیں۔ "اے بی ڈھنگ سے پڑھو ذرا۔ کیا سنا رہی ہو۔؟"

بلقیس دلہن کو غصہ آگیا۔ "لو بھلا میں ایسی نپٹ جاہل ہوگئی کہ شادی کا رقعہ بھی پڑھنا نہ آئے۔ پھوپھا میاں کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں نا اماں بی، ایک بڑی بھابی اور ایک بانو۔ اب بھلا وہ اور کس کی شادی کا رقعہ چھپوا سکتے تھے؟ اور پھر لال حویلی میں کون رہتا ہے؟"

"مگر لڑکا کون ہے؟ کیا پتہ ہمارے چھوٹے میاں ہی ہوں۔"

"اے واہ!" منجلی دلہن کو ایسے بے موقع ہنسی آئی کہ خالہ بی کی تیوری چڑھ گئی مگر وہ ہنستے ہنستے ہی بولیں۔

"ہمارے دیور جی کی بات ہوتی تو کھلا کھلا نام ہی نہ چھپوا دیتے۔ یہاں تو جان بوجھ کر دونوں کے نام چھپائے گئے ہیں کہ کوئی بیچ میں ہاتھ نہ مار دے۔"

مومانی جان غصے میں بولیں۔ "لو اور سنو، بھلا کہیں شریف لڑکیوں کے نام یوں رقعوں میں چھپا کرتے ہیں؟ ہزاروں غیر مردوں کی نگاہ نام پہ پڑے تو کیا شرافت رہ گئی۔!"

منجھلی دولہن ننکھے پن سے بولیں۔ "بھلا نہ سہی دلہن کا نام، دولہے کا نام تو لکھوا سکتے تھے نا؟"

اوپر سے چھوٹے میاں کوٹ پتلون ڈاٹے، ہاتھوں سے بال برابر کرتے برآمد ہوئے تو دیکھا پوری پنچایت موجود ہے اور معاملہ خاصہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ ڈھٹائی سے بولے۔ "ہاں ہاں بانو بہن کی نسبت ہمی نے لگائی ہے!!"

سسرال میں بانو کی لاج کھلوائی بھی ہوگئی، ساس مرد سے بول چال بھی شروع ہو ہوگئی۔ مگر ادھر اتنے دن گزرنے پر بھی خالہ بی کے رویئے میں کوئی فرق نہ پڑا ان کا جی تو ہر لمحہ یہی چاہا کرتا کہ بس چلے تو اپنے ہاتھوں اس کلموہے کا گلا گھونٹ دیں مگر پھر سوچتیں کہ کیسے دردوں سے پیٹ پھاڑ کر جنا تھا تو ہاتھ مل کر رہ جاتیں۔ بھابیاں تو خالہ بی سے صاف کہتی تھیں۔

"کسی ایسی ویسی کو گلے باندھ لیا ہے۔"

اب خالہ بی کا یہ حال کہ جو، جو بھی کہے سُن لیں اور منہ نہ ہلائیں۔ مگر غصّے کے اظہار کا یہ طریقہ انھیں خود ہی نہ بھایا اور اب یہ چلن اٹھایا کہ آتے جاتے چھوٹے میاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھا کرتیں اور دوسروں کی آڑ لے لے کر طعنے دیا کرتیں بہوؤں کی منڈلی میں بیٹھ کر ایک دن کہا بھی۔

"میرے جیتے جی کون حرامزادی ہے، ذرا اس گھر میں قدم دھر کر تو دیکھے۔!"

کہاں تو چھوٹے میاں شہزادے باجتے تھے کہ شہزادی بدر کمال کو بیاہنا ٹھیرا تھا۔ یا اب یہ حال کہ اللہ جانے کس سڑی ماری کو گلے کا تعویذ بنا رکھا تھا۔ کہ نکالتے نہ بنتا۔

بات اب تک بھی ڈھکی چھپی ہی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل بھید کیا ہے۔ خالہ بی کے دل کو یہی آس تھی کہ بات کچھ بھی نہیں، کوئی رکھی رکھیلی ہے نہ رانڈ رنڈی، بس چپ ہی بچھڑا ابنا گھوم رہا ہے۔ چار دن گھومے گا پھر یگا تو آپ ہی آپ رستوں پر آجائیگا اور ایک آدھ دن کسی بھاوج کا پلو پکڑ کر کہے گا۔

"بھابی ماں اب ہماری بھی کروا دو نا"

بیٹی غریب کی ماں کا تو یہ حشر ہوتا ہی ہے کہ مرا آیا گیا پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیتا ہے۔ "کیوں بیٹھی ہے۔؟ کیوں بیٹھی ہے؟" مگر کھاتا کماتا جان جوان بیٹا بھی اگر یوں ہی ڈھکیلیاں کھاتا دکھائی دے تو ماں کی جان ضیق ہو جاتی ہے۔ خاندان میں لڑکیوں کی مائیں بھی تو تھیں ہی۔ اپنی اپنی بیٹیوں کی سب ہی ماؤں کو فکر ہوتی ہے ٹوہ کیسے نہ لیں؟ کبھی کبھار خالہ بی کا جی چاہتا اکتا کر بول ہی دیں۔" شادی کے قابل ہی نہیں تو موا کیا کرے شادی۔!"

اتنے پر بھی خالہ بی تہیہ کئے بیٹھی تھیں کہ ڈھنگ کی لڑکی دکھائی دے تو بس حضرت کو کس ہی دونگی۔ مگر حضرت تو ایسے تڑ چیڑ تھے کہ پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلتی اور رات جاگ اٹھتی تو سارا آنگن مہندی کی کچی کلیوں اور موگرے، موتیا کی کھلی، ادھ کھلی کلیوں اور پھولوں سے مہک مہک اٹھتا۔ سارے بچے جمع ہوتے اور کھیل کود مچتا۔ چھوٹے میاں تھے تو چوبیس پچیس کے، مگر بھتیجوں سے مل جل کر بس بچہ ہی رہ جاتے۔ اس رات خالہ بی سفید چاندنی بچھے تخت پر چھالیہ کترتے بیٹھی تھیں۔ بہوئیں ادھر اُدھر پلنگوں پر ستیسی دل لگی کی باتیں کرتی پڑی

تھیں۔ بچے سارے میں شور مچا رہے تھے۔ کہ ادھر سے چھوٹے میاں نکل آئے۔

ساروں نے چھوٹے میاں کو جا لیا۔

" چچا میاں کہانی، چچا میاں کہانی۔"

" ارررے۔" وہ کوٹ کا دامن چھڑاتے ہوئے بولے۔" یہ کوئی وقت ہے کہانی سننے اور سنانے کا۔؟ پھر کبھی۔"

" اے لو۔! اور کون وقت ہوتا ہے کہانی کا۔؟" منجھلی بھابی تنک کر بولیں "پھر کیا صبح سویرے کہانی سنایا کرتے ہیں۔؟ چھ ہاتھ کے چچا نے ہو کبھی تو بچوں کی بات مان جایا کرو۔"

" اچھا، اچھا۔" وہ ہنستے ہوئے وہیں جم گئے۔" یوں خفا کیوں ہو رہی ہیں آپ؟ تو بھئی بچو! ایک تھا بڑا خوبصورت شہزادہ اور ایک وزیر زادہ۔ دونوں کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ بس جناب شہزادے نے پالا ایک طوطا اور وزیرزادے نے پالی ایک مینا بڑی خوبصورت سی کہ بس دیکھتے ہی جاؤ۔"

" میرے جیسی چچا میاں۔؟" صالحہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ چھوٹے میاں بھی ہنستے ہنستے سارے چہروں پر نظریں دوڑانے لگے۔ گویا دیکھتے ہوں مینا کس جیسی تھی۔

" بڑی پیاری سی تھی بھئی وہ منی سی۔ گڑیا سی۔ بس جیسے اپنی کا کُل......"

جانے کون سی رَو میں چھوٹے میاں کیا کہہ گئے کہ ایک دم سے ٹھٹک گئے۔ اور ادھر پوری فضا میں بم گر جانے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بھابیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور خالہ بی کے ہاتھ کا سروتہ یوں ہی ٹنگا کا ٹنگا رہ گیا۔ اتنے سارے بچوں میں ایک کا بھی نام کاکل نہ تھا۔ اور کیسا انوکھا سا نام تھا۔؟

بھئی نام ہوا کرتے ہیں رابعہ، کلثوم، صالحہ، مریم، شاکرہ، زہرہ، سلیمہ۔ یہ کون تک ہے کاکل؟

خالہ بی کو اپنا ماں ہونا یاد آیا اور دوسرے ہی لمحہ وہ ایک تنک کے ساتھ اٹھیں اور عین چھوٹے میاں کے سر پر پہنچ کر ان کے بال ہاتھوں میں کھسوٹ ڈالے۔

"بول یہ کاکل کون ہے تیری ہوتی سوتی۔؟"

چھوٹے میاں کے منہ پر رنگ سا چھا گیا، بڑی مضبوط آواز میں بولے۔

"میں نے دو سال ہوئے شادی کرلی ہے اماں۔ اور کاکل آپ کی پوتی ہے اور میری بیٹی۔"

چھوٹے میاں اگر جھوٹ بولتے یا بہانہ تراشتے تو خالہ بی کے غصہ کو راہ مل جاتی، مگر انہوں نے اتنا بڑا بے باک سچ کہہ دیا کہ خالہ بی کے ہاتھ ہی ڈھیلے پڑ گئے۔

"شادی کرلی۔؟" وہ مرے مرے لہجہ میں بولیں، "مگر کس سے۔"

"میرے ماتحت ایک کلرک ہیں، ان کی بیٹی ہے اماں۔ بہت غریب لوگ ہیں۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ بھی......"

خالہ بی کا رکا ہوا غصہ پھر بھڑک اٹھا "ہاں ہاں غریب ہے۔ مگر بہت اچھی ہے۔ سو چھنالوں کی ایک چھنال ہوگی۔ ورنہ یوں بغیر گاجے باجے کے بچہ نہ جن لیتی۔"

چھوٹے میاں کا منہ تپ گیا۔ سامنے ہی بھتیجے بھتیجیاں کھڑی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں میں ڈگڈگانے لگے۔ بڑا دل کر کے بولے۔

"خدا کی قسم اماں آپ نے مجھے جنا ہے اور آپ کا اس سے بھی بڑھ کر حق لگتا ہے کہ جو چاہیں کریں۔ جو چاہیں کہیں۔"

گھر کی بہتی گاتی فضا میں ایک رکا رکا پن آگیا۔ بچے قصور کرتے ہیں تو ماں باپ معاف ہی کر دیتے ہیں۔ مگر قصور بھی قصور جیسا ہو۔ یہ نہیں کہ زندگی

جیسی زندگی کا ساتھ، اور ہاتھ پکڑ لیا ایک کلرک زادی کا! جس کے خاندان کا پتہ نہ برے بھلے کی خبر۔ خالہ بی کا غصہ بجا تھا۔ بھابیاں منہ دیکر بات نہ کرتیں، بھائی کھنچے کھنچے رہتے۔ اتنے بڑے کنبے میں رہتے سہتے بھی چھوٹے میاں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتے۔

برسات کے دن لگے، بدلیاں چھاتیں۔ برس جاتیں کبھی چھاتیں اور ہوا کے زور سے بکھر بھی جاتیں۔ موسم بدلا تو سب کی طبیعتیں بھی بگڑنے لگیں۔ بچوں پر زیادہ زور پڑا ناکیں سڑ سڑانے لگیں، ٹھوں ٹھوں کھانسنے لگے، آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔
خالہ بی کی اپنی ایک چھوٹی سی الماری تھی اس میں ہاتھ کی بنائی ہوئی، گھر کی تیار کردہ دوائیں رہتیں ـــ کھانسی زکام سے لے کر ہیضے بخار اور پھوڑا پھنسی تک سبھی بیماریوں کی دوائیں۔ بڑے تایا طب کرتے تھے اور ان کے نسخے خاندان بھر میں چلتے تھے۔ ہاسپٹل کی دوا سے تو خالہ بی کا پرانا بیر تھا۔

"موا گھڑوں پانی ملا دیتے ہیں، کیا فائدہ کریگی۔؟" کوئی مارے ترقی پسندی کے دواخانے کی لال پیلی دوا لے بھی آتا تو موری میں سے بُو اٹھتی دیکھ کر جان جاتے کہ خالہ بی نے بہادی ہوگی۔

پچھلے چار پانچ دنوں سے چھوٹے میاں اپنے آپ میں نہ تھے۔ کھوئے کھوئے سے، بجھے بجھے سے۔ آنکھیں سرخ اور جاگی جاگی سی، بال الجھے بکھرے، عجیب ہونقوں کی سی صورت بنائے پھرتے تھے۔ کسی سے بول نہ چال، بس اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ صبح ہوئی باہر گئے، دوپہر کا کھانا کھانے آئے، پھر شام کو پانچ بجے کی بجائے رات کے گیارہ بارہ اور کبھی تو دو بجے کی خبر لاتے۔ زندگی کا معمول عجیب بدلا بدلا سا ہو گیا۔
صالحہ کی کھانسی نے زور پکڑا تو دادی کو ہول ہو گئی۔ چیکی پڑیا تو جاری ہی تھی،

بواکرمین نے ڈرادیا۔ "اے بی کالی کھانسی ہے۔ بھلے کو شروع میں علاج کروالو ورنہ جو پڑ جیب گر گئی تو بٹیا عمر بھر کو گنگانی ہو جائیں گی۔"

رات کے گیارہ بارہ کا وقت تھا، خالہ بی نیند بھری آنکھوں سے اٹھ کر الماری والے کمرے کو چلیں۔ ابھی دروازے میں ہی تھیں کہ مل گجے اجالے میں دیکھتی ہیں کہ ان کے اپنے کمرے سے چھوٹے میاں شیشی پکڑے نکل رہے ہیں۔ ماں کو آتا دیکھا تو بوکھلا سے گئے اور شیشی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کا تعلق دل کے درد سے ہوتا ہے۔ چھوٹے میاں کی آنکھ سرخ تھی۔ دل نے درد ضرور کھایا ہوگا۔ اماں نے چھن چھنا کے فرش کو دیکھا۔ سارے میں کالی کھانسی کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کلپ کر کوسا دیا۔

"جیسے گھورے پہ پیدا ہوئی ہے ایسے ہی مر بھی جائے۔ ہونہہ! علاج ہو رہے ہیں لاڈلی کے۔ ہمارے خاندان میں ٹیک لگادی کمبختوں نے۔"

سورج اور چاند کسی کی راہ نہیں دیکھتے، چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔ دن تو گزرتے ہی ہیں اور گزرتے ہی رہے۔ ماں بیٹے کے بیچ خفگی اور غصے کی جو دیوار کھڑی تھی وہ جوں کی توں ہی رہی۔

سرما کے دنوں میں پھلوں کا خوب موسم ہوتا ہے۔ خالہ بی نے ڈھیر سی سُرخ سرخ گاجریں خریدیں، ان کے بن کش کئے۔ ساس بہوؤں نے مل جل کر دیگچہ چڑھایا گھر کی بھینسیں تھیں، کھویا خوب تھا۔ سیر دو سیر کھویا بھی اس میں لنڈھا دیا۔ وہ مزے کا حلوہ بنا کہ چار گھر دور دور تک خوشبو اڑ گئی۔ دسترخوان بچھا، سبھی بیٹھے۔ نوکر چھوٹے میاں کو بھی بلانے گیا۔ مگر وہ اپنے کام میں الجھے ہوئے تھے، بولے۔

"میرا کھانا یہیں پہنچا جانا۔"

جب سے انھوں نے خالہ بی کی چھاتی پر سل رکھ دی تھی۔ یہ ان کے برے بھلے میں نہ بولتی تھیں۔ جیسا کہتے، کر دیتیں۔ "مرو کہ جیو، ہمیں کیا لینا ہے۔؟" اور ادھر چھوٹے میاں تھے کہ چھلیا کا کانٹا ہو کر رہ گئے تھے۔ کہ چھلی کا ہی انگ ہوتا ہے مگر کوئی منہ نہیں لگاتا۔

نوکر نے کھانے کا طشت ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ابھی سر پوش اٹھایا بھی نہ تھا کہ الائچی اور گھی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور ناک سے ہوتی دل میں اتر گئی۔ سر پوش اٹھا کر دیکھا۔ گہرے سرخ رنگ کا حلوہ، چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ ابھی چھوٹے میاں نے ایک چمچہ اٹھا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ کوئی حلق میں آکر اٹک گیا۔ ہاتھ یوں ہی چھوڑ دیا۔ ادھر ادھر دیکھا، باہر سب کھانے میں مگن تھے۔ برتنوں چمچوں اور رکابیوں کی کھڑ دھڑ ہو رہی تھی۔ جلدی سے اٹھے، اخبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور پلیٹ اٹھا کر اس میں لپیٹ لی۔ جیب سے دستی نکال کر پوٹلی سی بنالی اور الماری میں رکھ خود طشت کے پاس کھڑے کھڑے الٹے سیدھے نوالے ٹھونسنے لگے۔

خالہ بی عشا کی نماز پڑھ کر لیٹی تھیں۔ ابھی ابھی گھر بھر کے چراغوں کی لو نیچی کر کے گئی تھیں اور سارے میں مل گجا مل گجا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے میاں نے ادھر دروازے میں سے جھانکا، سامنے دیوار پر ان کے سر کا سایہ ابھرا اور پھر اندر ہو گیا۔ خالہ بی کی بند ہوتی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر دھیرے سے چھوٹے میاں نے پوٹلی اٹھائی اور کمرے سے باہر ہو کر پٹ اندر بھیڑ دیئے۔ چپکے چپکے قدم اٹھا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایسا ڈرا وا دیا کہ پوٹلی دھپ سے نیچے جا گری اور اسی دم تین چار ٹکڑوں میں ٹوٹ

ٹوٹ گئی۔ انہوں نے پیٹھ موڑ کر پیچھے دیکھا۔ خالہ بی کانپتی کھڑی تھیں۔ گرجدار آواز سے بولیں۔

"اے ہے! پیاروں پیٹے حلق میں اٹک جاتے ہیں نا۔ خبردار! جو دانہ بھی باہر نکالا۔ حضرت کے نام سے فاتحہ دلوائی تھی تو ایسے حرام خوروں کے لئے نہیں۔"

چھوٹے میاں کے جی کو جیسے روگ لگ گیا۔ ہونٹوں کی ہنسی جیسے کسی نے چرالی۔ کہاں تو وہ ہونٹ کہ سدا پھولوں کی طرح کھلے رہتے یا اب یہ حال کہ آنکھوں میں شبنم سی گھلی رہنے لگی۔ بڑے بھیا جان تھے، پھر اختر بھائی، اچھے بھیا، عزیز بھائی، ذاکر بھائی، پھر چھوٹے بھیا کہ گھر میں ان کے اور ان کی بیویوں بچوں کے قہقہے اچھلتے رہتے۔ اماں کو ہر بات کا چاؤ چونچلا۔ کوئی دن نہ گزرتا کہ کسی کی سالگرہ نہ ہوتی ہو۔ کسی کا عقیقہ ہے تو کسی کی چھٹی۔ کسی کا بوٹن ہے تو کسی کی دودھ بڑھائی۔ بھابیاں ایک سے ایک رنگا رنگی کپڑا پہنتیں۔ زیور سے سجی بنی، ہنستی بولتی گھومتی ہیں۔ اور بھائی ہیں کہ کھلے خزانے دھڑ سے دروازے بند کرتے ہیں۔ دلہنوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور علی الاعلان حمام تیار کرواتے ہیں۔ ایک چھوٹے میاں تھے کہ چوٹوں کی طرح رہتیں سہجاتے۔

کاکل سال بھر کی ہونے کو آئی تو باپ کو چونچلا سوجھا۔ سال پورا ہونے میں تین دن رہ گئے تھے۔ پاس ہیں کیا رکھا تھا؟ ٹریننگ ورینگ سب گئی چولھے بھاڑ میں۔ دل پر ایسا پتھر آپڑا تھا کہ کسی بات میں نہ رہے، کوئی بات ڈھنگ سے نہ کرپاتے۔ باپ تھے کہ ماں کے کہے میں، اور جب ماں نے ہی ہر طرح سے پابندی لگا دی تو کیا پھوٹا دھیلا بھی ہاتھ پڑتا۔ ہاں بس انگلی میں زمانے سے سونے کی نو ماشے کی انگوٹھی پہنے رہتے ہیں۔ سوچ لیا ہے کہ رانی بٹیا کی سالگرہ ابھی سے

رچائیں گے۔ دل امیروں کا بھی ہوتا ہے اور غریبوں کا بھی۔ ارمان تو سبھی کو لگے ہوئے ہیں۔

دو کانوں دکان گھومتے رہے۔ موتیوں کا ہار، سستی قیمت کا۔ ریشم کا سیلا سلایا فراک، ننھے منے سرخ جوتے اور چاکلیٹ کا ایک ڈبہ، بطور تحفہ کافور کی گڑیا۔ سارا سامان الماری میں دڑپ کر کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے کہ بچوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی کہ چچا میاں کی الماری میں تو رنگ برنگی دوکان سجی ہے۔ تمام گھروالے میں دھوم ہوگئی کہ لو بھئی اب تو ایسے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ دن کی روشنی میں اپنی رکھیلی کے لاڈلوں کو سجانے کے جتن کرتے پھرتے ہیں۔

ایک منہ سے نکلی اور دوسرے منہ تک پہنچی۔ گھر کیا تھا موا اچھا خاصا چھلنی تھا کہ ادھر بات پڑی نہیں کہ ادھر ٹپک پڑی۔ خالہ بی دراتی ہوئی کمرے میں پہنچیں۔ بڑے سلیقے سے خریدا گیا تھا۔ سارا سامان، ننھا منا سا سرخ فراک، چھوٹے چھوٹے لال لال جوتے، مالا، چاکلیٹ کا چم چماتا ڈبہ۔ ایک میٹھے کے ڈبے پر ایک چھٹی لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے رے؟" انھوں نے ڈپٹ کر نسیم میاں سے پوچھا۔

"جی..... جی دادی اماں ابھی پڑھتا ہوں۔" وہ اٹک اٹک کر سنانے لگے۔

"ننھی گڑیا کی سالگرہ پر ـــــ ارمان بھری پہلی سالگرہ پر اس کے باپ کی طرف سے۔"

خالہ بی نے سارے سامان پر نظر کی اور جلتے گھی میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ایسے پڑ گئے۔

"لو اور سنو۔! چھٹی نہ چلے موئے حرامی پلے۔ ہماری نقل میں سالگرہیں پڑتی ہیں۔" اور خالہ بی نے ایک لات جوتوں کو ماری۔ ایک ہاتھ سے فراک کھسوٹا،

مالا اور چاکلیٹ کا ڈبہ زمین پر رلنے لگے۔ اور رہی سہی ہاتھ کی صفائی ڈبے پر ہو گئی۔ ڈبہ دور جا گرا اور اس میں سے بڑی سی کافور کی گڑیا نکل کر دو گڑیاؤں میں بٹ گئی۔

آنسو بزدلی کی نشانی ہیں۔ اور غصہ بغاوت کی۔ مگر اس دن تو چھوٹے میاں کی آنکھ بھی نم ہوئی اور غصہ بھی بے بھاؤ آیا۔ یوں دکھانے کو تو ہاتھ بھر لمبی ناک دکھا دیتے مگر گھر بار الگ مانڈنے کی سوچتے تو اتنا کس بل کہاں تھا؟ ابھی نہ کمائی کا کوئی ٹھور ٹھکان تھا نہ اور کوئی دوسری آمدنی۔ ورنہ جی تو یہی چاہا کہ اکدم سے گھر چھوڑ کر چل ہی دیں۔ سالگرہ کی کیسی مٹی پلید ہوئی؟ خود پر ہی غصہ آیا کہ جلدی میں سب سامان کھلا چھوڑ کر چلتا بنا، ورنہ کسی کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ لگتا۔ گڑیا کے ٹکڑے دیکھ کر رات بھر دل میں رہ رہ کے ٹیس اٹھتی رہیں۔

"اب اس گھر میں نہ رہوں گا۔" انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا۔

جس دن کا کل بٹیا کی سالگرہ پڑتی تھی باپ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے پھکو پھکو روئے جاتے تھے۔

مردوں کا ادھر ادھر نگاہیں جھکانا عام سی بات ہے۔ اور کنواروں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے گھر بھر کے بچے ہیں، بیوی ہے، ایسوں کو بھی کبھی باہر کی چاٹ لگی۔ تو کوٹھا جا بسایا۔ اس میں حیرت کی بات ہے نہ غصہ کی۔ مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ خود خالو میاں کا حال کیا ڈھکا چھپا تھا۔ نوٹنکی کے بہانے سال چھ مہینے میں دو چار دفعہ باہر کی ہوا کھاتے ہی تھے اور دوسری ہی نوٹنکی دیکھ کر لوٹتے تھے۔ مگر ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں کو سر ہی چڑھا لیا جائے؟ دل آجانا بھی بری بات نہیں۔ اللہ نے آنکھ دیکھنے کو

دی ہے اور اگر چلتے پھرتے کوئی چاند سی صورت آنکھ میں بھر گئی تو کیا ہوا؟ مگر یہ تو بری بات ہوئی کہ اس کو گھر کی رانی ہی بنا ڈالیں۔

بھلے سبھاؤ میں ایک دن منجھلی بہو نے ساس کو رائے دی تھی یہی کہ چھوٹے بھیا کو معافی دے دیں۔ مگر خالہ بی کا وہ حال تھا کہ چولہا تو مدت ہوئی بجھ چکا تھا۔ مگر تپش ابھی تک باقی ہی تھی۔ ذاکر میاں کی بی بی کا کہنا تھا کہ ضرور چھوٹے میاں کی بی بی اچھے گھر اور اچھے عادتوں کی ہے، تب ہی تو وہ اب تک اس سے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ مرد لوگ تو جہاں کوئی کھوٹ خرابی دیکھتے ہیں بس جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور لگتا ہے دل کی بھی بری نہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد دلایا کہ سردی کا زور ہوا تو چھوٹے میاں بڑے بھائی جان، اچھے بھیا اور عزیز بھائی کے گود کے بچوں کے لئے ہلکے نیلے رنگ کے اون کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے موزے اور ویسی ہی ٹوپیاں لائے تھے۔ بھابیوں نے پوچھا بھی۔

"کہاں سے لائے میاں۔؟ کیا قیمت ہے۔؟"

تو ذرا مسکرا کر بولے۔ "میرے دوست کی دوکان ہے، وہاں سے لے آیا۔"
بھلا کون دوست ایسا جی والا تھا کہ گھر بیٹھے بھکٹ میں اپنا نقصان کرواتا؟ اور منجھلی بھابی نے جو بنوٹ دیکھی تو صاف پہچان لی کہ گھر کی ہی بنائی ہے۔ اب ظاہر ہے یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ اور کس کا بھیجھڑا اچھلے گا۔؟

مگر وہ تو خالہ بی تھیں اپنے نام کی۔ مرتی مرجاتیں مگر کبھی یہ رسوائی نہ کرتیں کہ غیروں کی بیٹی ان کی بہو کہلائے۔ اور غیر بھی کیسی کہ جس کے خاندان کا اتہ پتہ نہ ذات پات کی خیر خبر۔ کیا غیروں کی بیٹیاں نہیں اٹھایا کرتے۔؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دیکھ بھال کے، ایسے نہیں کہ کسی راہ چلتی کو دیکھا اور آنکھوں کا کاجل

بنا لیا۔

اس دن تو خالہ بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گھر بھر میں بچے اودھم مچا رہے تھے اور تمام مائیں بیٹھی خوش ہو رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر بھی نکل آتے کام سے، پھر اندر چلے جاتے۔ کیسی چہل پہل تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، بڑا سہانا سہانا سماں تھا۔ اور تو سب تھے، بس چھوٹے میاں ہی وہاں نہ تھے۔

خالو میاں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر رک کر بولے

"اجی میں کہتا ہوں بچے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔" خالہ بی سمجھیں چھوٹے بچوں کو کہہ رہے ہوں گے بولیں "اور کیا بچے بچے ہی ٹھیرے" باپ خوش ہو گئے سمجھے بات بن گئی۔ بولے "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ اب ہوا سو ہوا۔ جوان بچہ ہے۔ جان پر کھیل گیا تو کیا کر لینگے۔ آنے دو گھر میں چھوٹی بہو کو بھی؟"

خالہ بی نے تڑلک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اے لو یہ بیٹے کی پشت پناہی ہو رہی ہے۔ ہوتا ہو گا تمہارے بڑوں میں کہ راہ چلتیوں کو گھر ڈال لیں، میرے ہاں ایسا ہوا تھا نہ ہو گا۔ میں تبھی سمجھی کیا کہنے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا جو میرے سامنے کہا اور جو کبھی چھوٹے کے سامنے کہتے تو۔ سامنے قبلہ ہے۔ ہاں سچ کہتی ہوں بادلی میں چھلانگ لگا دیتی۔ غضب خدا کا ذرا دیکھو تو کیا دن آیا ہے کہ دیدوں کے سامنے ایسی واہیات حرکتیں ہوں اور ہم مان بھی جائیں۔ سچ سناتی ہوں کہ کتے کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤں پر اس حرافہ کو اپنے در پر پھٹکنے نہ دوں کہ میری کوکھ کی بددعا سمیٹ رہی ہے۔"

خالو میاں چپ رہ گئے۔ حیل حجت زیادہ کرتے بھی نہ تھے۔ وہ خود بڑے سخت قسم کے آدمی تھے۔ پر روایتی بادشاہوں کی طرح انھیں بھی چھوٹا شاہزادہ بے حد عزیز تھا۔ بچپن میں بڑے بچوں کو مارا ہو تو مارا ہو، چھوٹے میاں کو تو کبھی دھکا بھی نہ دیا۔ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرتے پوری کر دیتے۔ ادھر ماں بگڑتی ہی تھیں کہ چھوکرے کو دو کوڑی کا کر دو گے۔

مگر ان سے سہار کہاں ہوتی کہ جہیز سامنے دھری رہے اور بیٹا بلکتا رہے۔
اب بھی ان سے کہاں سہار ہو رہی تھی۔؟ بیوی تھی کہ چار گھر پرے ہی تھی۔ اور بیٹا تھا کہ خالی پہلو سوتا تھا اور مرد ہوتے بھی عورتوں کی طرح بلکتا تھا۔ مگر زیادہ زور دیا بھی نہیں۔ جانتے تھے خالہ بی سدا کی ہیکڑی ہیں۔ بات غصّے کی ہو یا مذاق کی جو کہتیں پورا ہی کر دکھاتیں۔

رمضان کی عید آئی اور اسی زور شور سے آئی جیسے کہ سدا آتی تھی۔ گھر بھر میں وہی چہل پہل مچ گئی۔ بچے اپنے کپڑے لے لے کر بھاگ رہے ہیں۔ مائیں ڈانٹ رہی ہیں۔ ادھر خالہ بی کی نوکروں پر پڑ تال پڑ رہی ہے کہ نمازی عید گاہ جانے کو تیار بھی ہو گئے تو کسی کام کا ٹھکانا ہی نہیں۔ ادھر لڑکیاں ہاتھوں کی مہندی چھڑا رہی تھیں تو بیٹے نہا نہا کر نکل رہے تھے اور رول مچا رہے تھے۔ کوئی کمر بند نہ ہونے کی شکایت کر رہا تھا تو کسی کو اپنا جوتا ہی نہ ملتا تھا۔ کسی نے اپنی اچکن کے بٹن نیچے اوپر اٹکا لیے تو کسی کا ازار بند ٹخنوں تک لٹک رہا ہے اور اسے کھوسنے تک کی بھی سدھ نہیں۔

اتنے ہنگاموں میں ایک چھوٹے میاں بھی تھے کہ خاموشی سے۔ اٹھے، چپ چاپ سے غسل کیا؟ صاف کپڑے بدلے اور نماز گاہ کو چل دیئے۔ ماں بیٹے کا مدت سے ابولا بندھا تھا۔ نہ یہ ان سے بات کرتی تھیں نہ وہ خود ہی ارخ دیتے تھے۔ عید کے دن تو بڑے دشمن بھی گلے مل لیتے ہیں یہ تو اپنے پیٹ کی اولاد تھا۔ مگر چھوٹے میاں نے آکر سلام کیا تو خالہ بی نے منہ پھیر لیا۔ گلے لگاتیں تو دعا دینی ہی پڑتی۔

"خدا بڑی عمر کرے۔ سہرے کے پھول کھلیں۔"

مگر سہرے کے پھول تو آگے ہی کھل چکے تھے۔ اور کس کے نام سے۔ غصہ کی ایک لہر اٹھی اور پورے جسم میں دوڑ گئی۔ چور نگاہوں سے بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ غصہ میں

دھان پھوں، دھان پھوں کر رہی تھیں۔ چپکے سے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

خالہ بی کھلانے پلانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب ہی لوگ عیدگاہ سے واپس آ چکے تھے۔ سات بیٹوں کی ماں، چھ بہوؤں کی ساس، ڈھیر سارے پوتوں پوتیوں کی دادی کے سلام دعا لیتے دیتے ہی گیارہ بج گئے۔ مردوں کی عیدگاہ سے واپسی پر عورتوں کی عید مچتی ہے۔ زنانے میں دھوم مچ گئی۔ ساس پیڑھی پر بیٹھ نگاہ و دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں۔

بڑی دلہن نکلیں۔ ہری بنارسی ساڑی، جھکا جھول زیور، سنگھار پٹار کئے، مسکراتی ہنستی، کن انکھیوں سے میاں کو دیکھتی ہوئیں۔ ادھر سے منجھلی دلہن آئیں۔ کھڑا کمخواب کا پاجامہ، بنارسی چولی کرتی، تاش کا دوپٹہ، گہنے پاتے سے سجی بنی۔ عزیز میاں، ذاکر میاں۔ اکرم میاں کی دلہنیں ایک دوسرے سے چھیڑ کرتی ہنستی مسکراتی صورتیں پھر بلقیس آئیں چھیوں بہوؤں میں یہ سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ سرخ کامدار تولواں ساڑی پہنے، چھ مہینے کا پیٹ اونچا ابھرا ہوا مسی کی دھڑی اور مانگ میں افشاں۔ ایسے بھاری زیور کپڑے اور پہننے والی ایسی نازک پھول پان! چلنا دوبھر ہو رہا تھا بچے رنگین کپڑوں میں ملبوس، منہ میں پان کھوسے تھرکتے پھر رہے تھے۔ کبھی باہر تو کبھی اندر، ابھی یہاں کہ ابھی وہاں۔ مردانے میں ملنے والے آئے اور بادل نخواستہ مرے مرے قدموں سے چھوٹے میاں بھی عید ملنے مصافحہ کرنے گئے۔

اک دم اندر سے بچوں کا شور اٹھا اور ہاتھوں میں ایک بنڈل سا پکڑے لے کے آئے۔ آٹھ بارہ آنے گز میں ملنے والے سرخ ریشم کی ساڑی اور ایسی ہلکی قسم کی کہ پہننے والی ذرا بھاری کو لہے کی ہوئی تو ایک ہی دھوپ میں مکس مکس جائے۔ اور ایک سرخ رنگ کا بھاری سا غرارہ، جس پر جگہ جگہ ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔

چھوٹے چھوٹے۔ یہ ایک مجبور شوہر اور ارمان بھرے باپ کا آنسو بھرا تحفہ تھا۔
صبح یوں ہی خالہ بی ساروں کے کمروں میں اگربتیاں سلگاتی پھر رہی تھیں کہ انہیں سرخ پلو جھانکتا ہوا دکھائی دے گیا تو انھوں نے کہاں سوچا تھا کہ یہ عید کی سجاوٹ بناوٹ ہے وہ بڑے غور سے ساڑی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظر کے سامنے سے بڑی دلہن گزریں جن کی بنارسی ساڑی چم چم چمک رہی تھی۔ سو دو سو سے کم کی کیا ہوگی۔ پھر منجھلی دلہن کا کمخواب کا پاجامہ ہی سو ڈیڑھ سو کا ہوگا۔ کرتی، چولی، دوپٹہ تو الگ رہا۔ پھر چھوٹی بہوئیں، جن کے کپڑے ایسے بھاری، کامدار تولوان کہ چلنے میں لپک لپک جاتی تھیں۔ اور یہ ساتویں شہزادی کیا پہن رہی ہے آج؟ خالہ بی کا جی اندر سے پگھل اٹھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ چھوٹے میاں کے کمرے میں آئیں اور بنڈل کرسی پر پٹخ، الٹے پیروں واپس نکل گئیں۔

چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوئے، گھڑی پر ایک نظر کی، ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ کرسی پر سے بنڈل اٹھایا۔ ابھی ایک قدم باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ خالہ بی لپکی ہوئی آگئیں۔ ہاتھوں میں بڑا سا طشت سنبھالے، جس پر جھالردار لگا ہوا سرخ کپڑا لٹک رہا تھا۔

طشت میز پر ٹکا کر انہوں نے چھوٹے میاں کا کندھا جا پکڑ لیا۔ ان کی آنکھیں یوں گیلی گیلی تھیں کہ ماں کا جی کٹ گیا۔

"کہاں جا رہا ہے۔؟" انھوں نے تن تنا کر پوچھا۔

چھوٹے میاں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سر جھکا لیا۔

خالہ بی نے بنڈل ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ تلخی سے بولیں۔ "اور یہ کیا ہے۔؟"

"چھوٹے میاں نے کوئی جواب نہ دیا تو ترشی سے بولیں۔"

"عید کا جوڑا ہے نا ؟"

چھوٹے میاں پھر بھی سر جھکائے کھڑے ہی رہے۔

"کلموہے عید پر کوئی ایسا ہلکا جوڑا بنایا کرتا ہے ؟"

چھوٹے میاں نے ماں کی طرف چونک کر دیکھا جو غصے غصے بول رہی تھیں۔

"مقبول میاں کی بہو اور یہ بارہ آنے گز والا ریشم ! شرم تو نہیں آئی تجھے اپنی دلہن کو ایسا کپڑا پہناتے ہوئے۔ ؟"

چھوٹے میاں کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔

"یہ جوڑے لے جا اور اپنی دلہن کو پہنا کر لے آ۔ اکیلے میں اس کا جی گھبراتا ہوگا یہاں چار میں جی بہلے گا۔" انھوں نے سرخ بنڈل کی طرف نفرت سے دیکھا۔

"تجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہلکی پھلکی کرن بانکڑی ہی خرید لیتا کہ ساڑی ساجری تو ہو جاتی۔" اور انھوں نے طشت پر سے طشت پوش ہٹا دیا۔ چھوٹے میاں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ یہ وہ پانچ کامدار جوڑے تھے جو اماں نے بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لئے خود اپنے ہاتھوں تیار کئے تھے۔

شجرِ ممنوعہ

صفدر میاں غسل خانے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ سامنے ہی منیر میاں بیٹھے ہیں۔ سامنے رابعہ بیگم لیٹی ہیں اور یہ ہیں کہ انہاک سے انھیں دیکھے جارہے ہیں تھوڑی دیر تک تو یوں ہی محویت سے دیکھتے رہے پھر ایک دم ان کا فراک گھٹنوں تک سرکا دیا۔ چکنی چکنی اور صندلی پنڈلی عریاں ہوگئی۔ منیر میاں آگے جھکے اور اپنی انگلیاں پنڈلی پر چلانے لگے۔ رابعہ بیگم نے ایک بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر پاس بیٹھے ہوئے منیر میاں کو دیکھا اور پھر آنکھیں موندلیں۔ مگر انگلیوں کے لمس سے جو گدگدی محسوس ہورہی تھی اس کی وجہ سے ان کے پتلے پتلے اور گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

صفدر میاں ایک لمحے کو یہ سب کچھ دیکھتے رہے پھر چلا کر بولے۔ "کیا کر رہا ہے نامعقول؟ اور یہ چونچ بھی لال کر رکھی ہے۔ کیوں میاں صاحبزادے؟"

"جی!" منیر میاں بوکھلا گئے۔

"اسکول نہیں گئے آج؟" وہ پھر گرجے۔

"جی پیٹ میں دلد (درد) ہے۔" منیر میاں تو تلا کر بولے۔

"بھاگو — نکلو یہاں سے ابھی دو کا پہاڑا سنتا ہوں۔!"

منیر میاں نے ایک بار تو اپنے باپ کی طرف دیکھا، پھر تین برس کی اس ننھی منی گڑیا — رابعہ کی طرف — اور باہر سٹک گئے۔ صفدر میاں پھر چلائے۔ "سات برس کا گھوڑا ہوگیا اور اب تک پہلی جماعت میں ٹنگا پڑا ہے نامعقول کہیں کا۔"

رابعہ ان کی گرجدار آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اکدم اس کی نگاہ اپنی پنڈلی پہ پڑی۔ اسی لمحے صفدر میاں کی نگاہیں بھی اسی دھبے سے جا ٹکرائیں۔

یہ منیر میاں کے ننھے منے ہونٹوں کا سرخ سرخ نشان تھا۔ گویا دہکتا ہوا انگارہ!

غالباً تنہائی میں انہوں نے رابعہ کی پنڈلی کا بوسہ لیا تھا۔

منیر میاں

چھوٹی بیگم نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے، مگر منیر میاں کے سہرے کی کلیاں کھلنی تھیں نہ کھلیں۔ بات کچھ بھی ہوتی مگر یہ نوبت ہی نہ آئی کہ منیر میاں کبھی زرتار صافہ باندھتے، یہ جھم جھماتا سہرا سجاتے اور گھوڑے پر بیٹھ چاند سی دلہن بیاہ لاتے۔ چھوٹی بیگم منتیں مانگتے تھک گئیں مگر کچھ بھی تو نہ ہوسکا۔ خاندان بھر میں ایک سے ایک لڑکیاں بھری پڑی تھیں۔ گوری خوبصورت، نک سک سے درست، کام کاج میں بھی تیز، مگر بات پھر بھی نہ بنی۔ اور سید صاحب کی بیٹی تو ایسی تھی کہ ہاتھ لگائے میلی ہوتی۔ اس پر سلیقے سے بھی آراستہ اور خانہ داری میں تو بس یکتا تھی۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، آئے گئے کی ہر بات میں برابری، مگر منیر میاں کے نصیب میں یہ سب کہاں تھا! چھوٹی بیگم اپنے بھائی کے لیے کیسی کیسی جان کڑھاتیں۔ بھائی کے بغیر پوچھے گچھے کئی بار نسبت بھی پکی کر لی گئی اور چھ بار تو الائچیاں تک بٹ گئیں، مگر وہ کلیاں پھر بھی نہ چٹکیں۔ پھر آجا کے چھوٹی بیگم کو یہی سوجھتا کہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور پلو پسار پسار کر اس کو کوسنے دیں جو منیر میاں کو ایسا بہکا گیا کہ شادی اور عورت کے نام سے بدکنے لگے۔

اور اب یہ بات بھی آج کل کی نہ تھی۔ منیر میاں کی عمر کے لڑکے تو کئی بچوں کے باپ

ہو گئے تھے بلکہ حویلی والے اشرف میاں نے تو گئے سال اپنی بیٹی کی شادی بھی کر ڈالی اور اب اللہ رکھے ان کی گود میں نواسا بھی کھیلنے کو تھا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو منیر میاں کا یہ بیالیسواں سال تھا۔ مونچھوں کے دو دو، چار چار بال بھی سفید ہو گئے تھے اور اب ڈھلتی کا زمانہ تھا۔ مگر بہن اسی آس میں مری جاتی تھیں کہ بھائی کے سر سہرا دیکھ لیں۔ چھوٹی بیگم کہتیں۔ "اے آدمی کی عمر تو دراصل چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ابھی تو دن آئے ہیں۔" مگر دن آکر بھی نہ آئے۔ ماں باپ تو کیا کیا منتیں نہ کر مرے، مگر وہ منیر میاں تھے کہ بس ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب بہن بہنوئی کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی بھی نکٹی چپٹی، کالی بلی کو بیاہ لائیں۔ مگر منیر میاں توجہ دیتے تب نا!

خاندان بھر میں ایسا تو کوئی لڑکا نہ تھا جس نے شروع جوانی میں ہی عورت سے منہ پھیر لیا ہو۔ سبھی تو بخشے ہوئے تھے۔ مگر ان حضرت کا تو شروع سے ہی ڈھنگ نرالا تھا۔ عمر یہی کوئی بیس بائیس کی ہوگی۔ دیکھنے میں ایسے اونچے پورے، ایسے خوبصورت کہ لڑکیاں آپ ہی مری جاتی تھیں، مگر انھوں نے خود کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ چھوٹی بیگم تو کہتی تھیں یہ سب اس موئے پادری کا قصور تھا جو انھیں پکا راہب بنا گیا۔ لے دے کے اجڑے گھر کا یہی تو ایک دیا تھا۔ شادی ہوتی گھر بستا تو اولاد کی آس بھی ہوتی۔ اب تو کوئی نام لینے والا، نہ مرے تو منہ میں پانی ڈالنے والا۔ کیسی تباہی تھی خدایا کہ بیٹا ہوتے بھی نسل ختم ہوتی جا رہی تھی۔ منیر میاں کا پیغام سب سے پہلے تو انہی شیخ حسین کی بیٹی کو گیا جو انگریزی بھی پڑھی ہوئی تھی۔ اور جو دیکھنے دکھانے میں بھی ہزاروں میں نہیں تو دس بیس میں ایک ضرور تھی۔

اور سچ جو پوچھو تو منیر میاں کی ماں کا اس پر لٹو ہو جانا یوں بھی تھا کہ جہیز کے علاوہ ایک معقول رقم ملنے کی آس بھی تھی۔ ادھر سے ہاں بھی ہو گئی اور بچی پوڑھی ہو گئی

تو جان پہچان والوں کے یہاں پان سپاری بھی بٹ گئی کہ یکایک بیٹھے بٹھائے منیر میاں نے انکار کر دیا۔ "میں شادی نہیں کروں گا"۔ سننے والے تو بھونچکے ہی رہ گئے۔ کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ماں کو اتنا تو معلوم تھا کہ کسی انگریز سے راہ و رسم ہے مگر یہ نہ معلوم تھا کہ یہ راہ و رسم اس بات کی نوبت لے آئے گی۔

"اے ایسا ہی مولوی بنا ہے تو بن لو مگر شادی کیوں نہیں کرتے۔ شادی تو کسی بھی مذہب میں منع نہیں ہے"۔ وہ چلا کر بولتیں۔

"ارے اماں اس بیچارے کو کیوں بدنام کرو ـــ میں خود ہی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا ـــ یہ تو......"

اماں بات کاٹ دیتیں ـــ "مجھے سب معلوم ہے باتیں نہ بنا منیر میاں۔ کان کھول کر سن لے اور آنکھیں کھول کر دیکھ لے کہ میں تیرا سہرا دیکھے بغیر نہیں مروں گی اور تیرا پوتا بھی جھلاؤں گی۔ اللہ جانے وہ انگریز بڈھا کیا کیا دماغ میں ٹھونس گیا ہے"۔

"پھر وہی مصیبت۔ ارے نہیں کرتا شادی ـــ نہیں کرتا ـــ اور سن لو اب سے میرا پیچھا مت نہ اٹھانا۔"

اے لو ـــ اس نے تو ایسی دو ٹوک سنادی کہ بیچاری اماں تو چپ ہی رہ گئیں۔ کتنے لاڈ چاؤ منتوں مرادوں کا پالا پوسا بیٹا تھا۔ بس چلتا تو اپنی زندگی ہی وار دیتیں۔ مگر کیسے منہ پر صاف انکار کر بیٹھا۔ ذرا تو ماں کی محبت اور ممتا کا پاس کرتا۔ تھیں۔ مگر غیرت دار۔ پھر کبھی منہ سے نہ بولیں کہ تیرا چھوکرا بھی جھلاؤں گی اے منیرے۔ لوگوں کے منہ کو کون بند کرتا۔؟ ہانڈی کے منہ کو ڈھکن ہے مگر ان دنیا والوں کے منہ کو ڈھکن ہے نہ پیندہ ـــ دشمنوں نے کچھ کا کچھ ہی اڑا دیا اور قبل اس کے کہ لڑکے والوں کی طرف سے ہست و نیست ہوتی۔ لڑکی والوں نے پہلے ہی یہ کہہ کر

ناطہ توڑ لیا۔ "کیا لڑکی کی قسمت پھوٹنی ہے ہمیں۔"

اماں کا بس نہ چلا اس وقت شادی کر کے نویں مہینے ہی پوتا جھلا دیتیں تو بات ہی کیا تھی؟ مگر یہاں تو ایسے بھرپور انکار نے لوگوں کے شبہہ کو اور بھی تقویت پہنچائی اور منیر میاں نام سے نانوٹ گئے کہ میں ہی نہیں عورت کے قابل۔۔۔ تب ہی تو منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔

چھوٹی بیگم پہلے پہل تو سمجھی تھیں کہ شاید ہوگی ایسی ہی کوئی بات۔ مگر ادھر جب سے ماں باپ مرے تو منیر میاں بہن بہنوئی کے گھر ہی آپڑے تھے اور اس وقت ان کی عمر ہوگی یہی کوئی تیس بتایس کی۔ اور چھوٹی بیگم کو اکثر یہ منظر دکھائی دیتا کہ ہفتہ دو ہفتے میں ایک آدھ بار منیر میاں صبح ہی صبح بستر سے گڑبڑائے گڑبڑائے سے اٹھتے۔ اٹھتے ہی چادر لنڈ منڈ کر کے دور کونے میں پھینکتے اور بہنوئی کی نظر بچا کر اکدم غسل خانے کی راہ لیتے۔ چھوٹی بیگم گھر بھر کے بستروں کی غلاف چادریں بدلواتیں تو دل ہی دل میں بلکتیں۔ "ہے ہے کیسی بھری پری جوانی یوں ہی برباد ہو رہی ہے مولا۔" منیر میاں اپنے بہنوئی سے ایسے نظریں بچا کر جاتے کہ پاؤں کی آہٹ نہ سنائی دے۔ رفیع الدین تو یوں ہی کچی نیند کے تھے۔ منیر میاں مارے ڈر کے کھڑاؤں بھی نہ پہنتے کہ کھٹ کھٹ کی آواز پر اگر بھائی صاحب اٹھ گئے تو آدھ گھنٹے تو چھیڑ چھاڑ کریں گے ہی۔ اور وہ زن سے غسل خانے میں غائب ہو جاتے۔

"ارے میاں کیوں خواہ نخواہ ہٹ کئے جاتے ہو۔؟ ابھی بھی کچھ نہیں گیا، کہو تو کرا دیں کسی اچھی جگہ تمہاری شادی۔" ایک دن صبح ہی صبح انھیں چادر پھینکتا دیکھ کر بہنوئی نے اپنے رشتہ سے فائدہ اٹھایا۔ مگر منیر میاں نے کچھ جواب ہی نہ دیا۔ اہنیں، بس ان کی طرف دیکھا اور سٹ پٹائے ہوئے باہر دوڑ گئے۔

رفیع الدین کا مطلب کسی "اچھی جگہ" سے ہمیشہ ان کی بہن سے ہوتا۔ رابعہ بیگم تین برس کی بیاہی ہوئی رانڈ ہو کر بھائی بھاوج کے گھر آپڑی تھیں۔ شادی کو تین ہی برس تو ہوئے تھے جب گاؤں میں ہیضہ پھوٹا اور ایسا پھوٹا کہ ساری آبادی لے کر ہی لوٹا۔ نصیبوں جلی رابعہ بیگم بھی انہی بدنصیبوں میں تھیں جو ہیضے کی وبا میں مر گئے۔ یوں کہنے کو رابعہ بیگم نہ مریں ان کے میاں مرے، مگر سچ جو پوچھو تو ہندوستانی گھرانے کی پردہ دار عورت کے لئے اس کے مرد کی زندگی ہی تو اس کی اپنی زندگی ہے۔ رابعہ بیگم سے یوں بھی ایک بار منیر میاں کی بات چلی تھی جب چھوٹی بیگم کی شادی رفیع الدین سے ہونے لگی تو اماں نے سوچا کہ بیٹی دے کر بیٹی لے لیں گے اور آپس میں سانٹا آنٹا کر لیں گے۔ مگر میاں تو بر وگ لئے بیٹھے تھے۔

بیچاری تین برس سہاگن رہیں اور اب سترہ اٹھارہ برس سے رنڈاپے کی زندگی کاٹ رہی تھیں۔ کیسی لہکتی مہکتی جوانی تھی کہ اپنا وزن آپ نہ سنبھلتا۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں کالے کالے لمبے بال، بوٹا سا قد، گورا گورا رنگ اور جسم کی بناوٹ تو ایسی گدرائی گدرائی کہ پھولوں سے لدی ڈالی کا گمان ہوتا۔ اور کام کاج میں بھی ایسی کہ جب سے بھائی کے گھر آپڑی تھیں بھاوج کو کبھی ہاتھ نہ ہلانے دیا۔ سبھی کا کام ان کے ذمہ۔ چوڑی دار پاجامہ، آڑا دوپٹہ، چولی، کرتی، یہی لباس ہوتا، مگر اس میں بھی بدن جیسے پکار پکار اٹھتا۔ دوڑ دوڑ کر کام کرتیں۔ سبھی کی ڈانٹ گھر کی تو نصیب میں تھیں، مگر مسکرا مسکرا کر ہر کام نبیڑ لیتی۔ اور بیوگی کی وہ حسرت جو سہاگ نے چہرے سے چپٹ کر رہ گئی تھی۔ اس بھولی بھالی مسکراہٹ سے ڈھل سی جاتی۔ مسکرا کر ہر کام پر ٹوٹی پڑتیں۔ منیر میاں نے ستر ہزار بار تو انھیں دیکھا ہوگا۔ چھوٹی بیگم نے کیسے کیسے چاہا کہ وہ منیر میاں کی نگاہوں میں بھر جائیں، مگر ان کی آنکھیں تو کھلی ہوتے ہوئے بھی بند ہی تھیں

رفیع الدین منہ سے تو بھلا کیسے کہتے، دبی زبان سے ہزاروں مرتبہ کہا ہوگا "کہو تو کرادیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ" مگر وہ کب مانتے تھے کہ ابھی مان جاتے۔ جانے کس ٹھنڈی مٹی سے خمیر اٹھا تھا ان کا کہ آنکھیں بھر بھر دیکھتے۔ کام بگاڑ دیتیں تو آنکھوں ہی آنکھیں ڈال ڈال کر ڈانٹتے، مگر کیا مجال کوئی بجلی لہرا جائے، کوئی کوندا ہی لپک جائے۔

چھوٹی بیگم تو نند پر لٹو تھیں۔ کیسا پیارا پیارا سا مکھڑا، جھومتا ہوا بدن، اور اس پر دل موہ لینے والی ادائیں۔ رات کو اپنے پلنگ پر جاتیں تو چار چار بار اٹھ اٹھ کر پوچھتیں۔

"بھابی ماں، پاؤں دبا دوں۔؟ بھابی ماں، یہ کر دوں۔؟ بھابی ماں، وہ کر دوں؟" ایسی اداؤں پر کون لوٹ پوٹ نہ ہو جائے بھلا۔؟

اور رات گئے جب بیچاری کا پلنگ چرچراتا تو چھوٹی بیگم کا دل غم اور ہمدردی سے بھر جاتا، اور منیر میاں کے لئے دل میں نفرت پھوٹ پڑتی۔

"اللہ مارا آج ہاں کر دے تو یہ چارپائی کیوں چرچر کرے۔" ایک سے ایک چھوکری نظر سے گزری مگر اس خدا کے بندے نے آنکھ نہ لڑائی۔ چھوٹی بیگم سبھی جتن کر گزریں۔ بس ایک بھینسے کی طرح گھیر گھار کر لانا ہی تو باقی رہ گیا تھا وہ بھی نہ چھوٹا۔

چھوٹی بیگم کے مائکے میں ایک چھوکری ملازم تھی۔ خالہ بی اس سے کیسی پریشان تھیں کہ توبہ۔ رنگ دیکھو تو کالا کٹھ۔ یہ موٹی موٹی سی۔ مگر موٹاپن بھی ایسا گویا پتھر سے کاٹا ہوا بدن۔ بھد بھدا اپنی نام کو نہیں۔ یہ جھونجھڑ کے جھونجھڑ بال سر پر بکھرے ہوئے۔ مگر آنکھیں خوب بڑی بڑی اور کالی کالی۔ چنچل جب کاجل کی دھار مار لیتی تھی تو اچھے اچھوں کے دیدے ہوائی ہو جاتے تھے۔ حرافہ ایسی کہ اندھیرے اجالے اچھے خاصے چلتے ہوؤں کو چھیڑا کرتی۔ گرمیوں کے دنوں میں نہانے کو بیٹھتی

تو غسل خانے میں سے چلاتی۔ "ہے ہے کیسا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے۔ میرے انگ پر سے کیسا پھسل رہا ہے۔" پھر اکدم چلاتی۔

"ہائے ہائے کیسی گرمی ہو رہی ہے میرے۔"

باہر بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو مٹ مٹ دیکھتے۔ اور یہ تو سبھی کو معلوم تھا کہ غسل خانے میں دو ہاتھ لمبی اور دو ہاتھ چوڑی چوکی کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس لئے تھی کہ غسل خانہ اتنا چھوٹا تھا کہ کپڑے پہننے کو جگہ نہ تھی۔ چوکی کا مصرف یہی تھا کہ لوگ اس پر بیٹھ کر اطمینان سے کپڑے پہنیں۔ مگر وہ اپنی ساڑی گیلے گیلے بدن پر لپیٹے، کولہے اور شانے مٹکاتی ویسے ہی نکل آتی۔

"اوئی ـــ ساڑی کیسے باندھوں جی۔ گسل کھانے میں جگہ ہی کتنی ہے۔؟"

خالہ بی اس سے پناہ مانگتیں۔ سال میں دو پیٹ تو گراتی ہی تھی۔ ہزار بار اسے ملازمت سے برخاست کیا گیا مگر آگے سے پچھواڑے سے، جہاں موقع ملا وہ گھسی اور پھر وہی مستیاں۔

چھوٹی بیگم نے اس چڑیل کو بھی بلا کر کچھ دن رکھا کہ شاید اس کی یہ بے تکان ادائیں ہی ان کا دل لوٹ لیں اور یہ کفر ٹوٹ جائے، مگر منیر میاں نے دوسرے ہی کنوئیں کا پانی پی رکھا تھا۔ گرمیوں کی ایک شام کو جب وہ نہانے کے لئے گھسی تو اکدم چیخنے چلانے اور ہائے وائے مچانے لگی۔ "کیا ٹھنڈا پانی ہے موا۔ ہائے ہائے میری مانڈی پر کیسی گدگدی ہو رہی ہے۔" چھوٹی بیگم نے بڑی ارمان بھری نظروں سے دیکھا کہ شاید پانی میں پتھر جا پڑے اور کچھ ہلچل مچے، مگر وہ تو منیر میاں تھے، بڑی سادگی سے، مگر جھلا کر بولے۔ "کمبخت کو ٹھنڈا پانی لگ رہا ہے تو گرم پانی سے کیوں نہیں نہاتی۔؟"

چھوٹی بیگم نے کیسے کلپ کلپ کر دعائیں نہ مانگیں۔؟

"یا مولا! میرے بھائی کے سہرے کے پھول کھلا دے، مسکین شاہ میاں کی

درگاہ پر چڑھاوا لے جاؤنگی، دوہری چادر چڑھاؤں گی۔ پھولوں کی الگ، ریشم کی الگ۔" مگر ان کی یہ آرزو پوری کہاں ہوئی۔ بیچاری کیا کیا نہ کر گزریں۔ اکوئی جیسا بھائی ہوتا تو ساوی تعلیم پر، پارسائی پہ لات مار ایسے تڑپتے دل کی التجا پر گھل ہی اٹھتا، مگر وہ پتھر پگھلنے والا نہ تھا۔ چھوٹی بیگم نے کہیں سن رکھا تھا کہ دلہن دولہا کے اترن ہار گجرے کنوارے لڑکے لڑکیاں پہن لیں تو سہرے کے پھول جلدی کھلتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، جہاں محلے ٹولے میں شادی کی دھومک دھیا مچی بس ننھے میاں ماں کی تحریک پر، باسی پھولوں کے گجرے لیئے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ماں کی شہ پاکر ماموں کی چھاتی پر دوڑتے۔

"ماموں جان! یہ ہار پہن لونا۔ تم جلدی دولہے بنو گے۔ اور ماموں جان پہلے پہل تو چڑچڑا جایا کرتے۔ جوتا اٹھا کر پیچھے بھاگتے۔ مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھرپور جوانی کا زور تھا۔ اب جو ادھر ڈھلتی کے دن آئے تو وہ گرمی بھی گئی۔ اب کبھی منے میاں باسی گجرے لاکر دہائی دیتے تو یہ ٹھڈے چین سے مسکرلیتے۔

"ہاں ہاں، تو مجھے دولہا نہ بنائے گا تو کون بنائے گا۔؟ اب یہ میری شادی کے دن ہیں رے۔؟" وہ اپنی مونچھ کا ایک آدھ سفید بال اٹھا کر اسے دکھاتے۔ "اب تو تیری شادی کے دن ہیں، تو ہی پہن لے یہ گجرا۔" اور وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کا ہار منے میاں کی گردن میں ڈال دیتے۔

باسی گجرے

ننھے میاں پھر دوڑے دوڑے چلے آرہے تھے۔ ہاتھوں میں سفید سفید مگر مرجھائے پھولوں کے گجرے، جو رات بھر سیج پر پڑے پڑے اپنی تازگی کھو بیٹھے تھے۔ جانے محلے میں

کتنی شادیاں ہوتی تھیں کہ منیر میاں کی جان پر یوں آفتیں ٹوٹا کرتیں۔ منیر میاں لوٹے سے وضو بناتے بیٹھے تھے، منے میاں نے چاہا کہ ماموں کو دولہا بنادیں کہ ایکدم یہ جھپٹ پڑے۔ "کیوں بے، سر کھجا رہا ہے کیا۔؟" وہ چڑ کر بولے۔ اب آج یکایک ان کا پارہ چڑھ گیا۔ یوں رکھائی سے تو کبھی نہ بولتے تھے۔ منے میاں کا منہ اتر گیا۔ چھوٹی بیگم پلنگ پر پڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کی طرف پھر کر بولے۔

"قسم اللہ کی آپا بی، اگر تمہارا لاڈلا اب سے یہ باسی گجرے میرے پاس لایا تو میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں گا۔" بات اتنی سنجیدگی سے کہی گئی تھی کہ چھوٹی بیگم کانپ گئیں۔ "اے اللہ نہ کرے تم گھر چھوڑو۔ نہیں کرتے، نہ کرو شادی، مگر ایسے نحس جملے تو منہ سے نہ نکالو۔ اللہ رکھے میرے میکے کا تمہیں تو ایک چراغ ہو، اللہ نہ کرے میں تمہیں جاتا دیکھوں۔"

اب کبھی منے میاں پھول کے گجرے لاتے بھی تو خود ہی پہن لیا کرتے۔

رابعہ بیگم

رفیع الدین کا دور آیا تو بہت ساری باتوں کی پابندی اٹھ گئی۔ یہ گھرانہ تو الیا تھا کہ یہاں کی بیبیاں بارہ بارہ برس کے لڑکوں تک سے پردہ کرتیں۔ مگر رفیع الدین کے دور میں یہ پابندی اٹھتے اٹھتے ختم ہو کر رہ گئی۔ ان کے بچپنے میں جو باتیں معیوب سمجھی جاتیں وہی اب کھلے بندوں ہونے لگیں۔ سبھی لعنتیں دور ہوئیں تو لباس بھی اس دست برد سے نہ بچا۔ وہ چوڑی دار پاجامے، آڑے دوپٹے اور چولیاں کرتیاں بھی غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ محض ساڑی بلاؤزوں نے لے لی۔ اماں کے زمانے میں تو سر پر سے پلو بھی کھسک جاتا تو دنیا سر پر اٹھا لیتیں۔ گرمی کے مارے دم کیوں نہ نکل جاتا ہو،

وہی آستینوں والی چولیاں پہننی پڑتیں۔ کسی فیشن کی ماری نے ایک چولی یوں بھی سلوالی کہ سرسے آستین ہی ندارد، اماں نے بانس پر ٹنگوا کر کھڑے کھڑے جلوا ڈالی "دیدوں کا پانی تو ڈھل گیا ہے۔ بھائی بند گھر بھر میں بھرے پڑے ہیں، ذرا ہاتھ اونچا کیا کہ بس سارا تماشہ دیکھ لو۔" مگر اب ایسی کوئی بندش نہ تھی۔ چھوٹی بیگم تو پہنتی ہی تھیں۔ رفیع الدین نے کئی بار رابعہ بیگم سے بھی کہا۔

"رابعہ تو یہ اٹنگے پاجامے کیوں چلا رہی ہے اب تک۔" مگر وہ خاموش ہی رہ جاتیں۔ رفیع الدین بھی زیادہ کچھ نہ کہتے۔ رابعہ بیگم تو بھائی کی آنکھوں کا تارا تھیں اور ہوتیں بھی کیوں نا۔؟ اکلوتی بہن ہی تو تھی اور اب تو رنڈاپے کے سوگ سے ایسی غم نصیب ہو کر رہ گئی تھی کہ کچھ کہنے سننے کو دل نہ چاہتا۔ کبھی وہ آدھی بات بھی نہ کہتے کہ جلے دل کی تو ہے، کیا سہے گی۔ گھر والے کچھ ہی کہہ لیں، یہ کچھ نہ کہتے۔ ہر بات کی آسانی ان کے لئے مہیا تھی اور اب وہ رہتے سہتے اس گھر کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔ جہیز کے دان جوڑے، کرتیاں چولیاں، پاجامے، کھڑے آڑے دوپٹے ٹھپہ گوٹہ ٹنکی اکلیاں ساری کی ساری صندوقوں میں پڑی لررہی تھیں مگر بھولے بسرے بھی پہننے کے بارے میں نہ سوچا گیا۔ لاکھ لوگوں نے کہا بھی۔

"اے ایسی عمر ہی کیا ہے۔ پہن ڈالو۔ بیوہ ہوئی تو کیا غضب ہو گیا۔" مگر دیکھنے والی آنکھ ہی نہ تھی تو کسے دکھاتی بیچاری پہن کر۔؟ کئی دنوں تک تو صندوق کھول کر بیٹھ جاتی اور ایسی حسرت بھری نظروں سے ٹکر ٹکر تاکتی کہ آنکھیں چھلک اٹھتیں۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ دل پر کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر وہ کپڑے جوں کے توں رکھے تھے۔ بھائی نے چھپن مرتبہ تو کہا ہوگا۔ "رابعہ کپڑے پہن کیوں نہیں لیتی۔؟ رکھے رکھے خراب ہی تو ہو رہے ہیں۔" مگر وہ بڑی

بڑی آنکھیں جھک جاتیں اور پھر تو رفیع الدین کو بھی یارانہ رہتا کہ مزید کچھ کہہ سکیں۔ اور اب تو ایک زمانہ گذر گیا تھا۔ اپنی وہ بھرپور جوانی، جسے وہ لوگوں کی نظروں سے حرام کے پیٹ کی طرح چھپاتی پھرتی تھی۔ آہستہ آہستہ سلام رخصت کہہ رہی تھی۔ سخت سخت مضبوط بدن اب ڈھلک رہا تھا، اعضا میں وہ گٹھا ہوا پن کہاں باقی رہ گیا تھا۔؟

گیہوں کے گوندھے ہوئے آٹے میں گھنٹے دو گھنٹے بعد رکھے رکھے کیسا لوچ پیدا ہو جاتا ہے، وہی لوچ اب رابعہ بیگم کے گوشت میں پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ یہ تو کچھ بری نہیں لگتی مگر جوانی کے رنگ روپ کی بات بھلا کہاں سے آئے؟۔ گول گول بازو اب لٹک سے گئے تھے اور گالوں اور آنکھوں کے کونوں پر لکیریں سی پڑتی جا رہی تھیں، جیسے مکڑی جال تننے لگی ہو۔ کالے بدرنگ پاجامے اور سفید ململ کے آڑے دوپٹے اور کرتیاں پہنتے ہی پہنتے ان کی عمر جیسی عمر گذری اب جب کہ کوئی ارمان باقی تھا نہ آرزو، بھائی نے بڑی محبت سے کہا۔" رابعہ اپنی بھابی کی طرح تو بھی ساڑی کیوں نہیں باندھتی۔ تو رابعہ بیگم کے دل کو بھی یہ بات لگ گئی۔ اب کون دیکھنے اور گھورنے والا بیٹھا تھا کہ جان چرانے کی نوبت آتی۔؟ اور پھر کام کرتے میں وہ دوپٹہ بھی بار بار آ گرتا تھا۔ اور گرمی کے دنوں میں ان تنگ پائنچوں میں تو وہ گرمی ہوتی کہ توبہ۔ اور مہریاں تنگ اتنی ہوتی تھیں کہ اگر کوئی چیونٹی گھس جاتی تو انگلی تک گھسائے نہ گھستی۔ اوپر ہی اوپر سے کھجاتے کھجاتے جان ہوئی آدھ موئی ہو جاتی۔ مگر کیا مجال جو پاجامہ ٹخنوں سے ذرا ہی اوپر ہٹ جائے۔

اور یوں زندگی میں پہلی بار جارجٹ کی سفید سادی ساڑی اور جارجٹ ہی کا بلاؤز پہنا تو ایک بار تو خود چھوٹی بیگم بھی انھیں دیکھتی رہ گئیں۔ پتلے بلاؤز میں سے

بازوؤں کی سفیدی ایسے چھن رہی تھی کہ محسوس ہو رہا تھا اندر بدن میں چراغاں ہو رہا ہے۔ جو یوں اجالا پھٹا پڑ رہا ہے۔ اس عمر میں بھی کیا صورت تھی۔ کیا بھولپن تھا۔ اور وہ معصومیت اور بھولپن قائم بھی کیوں نہ رہتا۔؟ نہ بال ہوا نہ بچہ۔ ڈال پر پھل لگیں تو یوں دیکھنے میں تو وہ لدی پھندی بڑی پر بہار لگتی ہے۔ مگر جہاں پھل اترے ایسی ٹھونٹھ اور کھابڑی ہو جاتی ہے کہ بس۔ تو اس ڈال میں پھل ہی کب لگے جو یہ نوبت آتی۔؟ سفید سفید ساڑی میں پاکیزہ حور سی لگ رہی تھی کہ دیکھنے سے نیت نہ بھرتی تھی۔ منیر میاں نے بھی آنکھیں دیکھا، مگر یوں، جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ قمیض اچھالتے ہوئے بولے۔

"پچھلی بار دھوبی سارے بٹن توڑ لایا تھا، اب کی بار ذرا جتلا دینا۔"

منیر میاں کے اپنے دل کی طرح ان کے کپڑے، ان کا سامان، ان کا کمرہ بھی کچھ عجیب پھیکا پھیکا اور بے رونق سا تھا۔ عورت کے ہاتھ کی جو گھرداری اور اس کی جو خوبصورتی ہوتی ہے وہ تو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ کپڑے دیکھو تو پڑے ہیں ایک دوسرے سے کشتی لڑتے ہوئے، کتابیں اوندھی سیدھی، کوئی یوں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئیں جیسے عید کا معانقہ ہو رہا ہو۔ کاغذ آڑے ترچھے پڑے ہوئے۔ ہر چیز بکھری بکھرائی۔ رفیع الدین کہتے۔ "ارے بھائی ان کاموں کے لئے ہونا ہی چاہیئے کوئی چاند سی، سگھڑ سی دلہن۔ کہو تو کرا دیں تمہاری شادی کہیں اچھی جگہ۔"

اور منیر میاں ہنس کر بولتے۔ "بھائی صاحب! آپ بھی بس خوب ہیں۔ ساری دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے آپ اپنا وظیفہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ چھوٹی بیگم تو تھک ہار کر چپ بیٹھ گئی تھیں۔ بھولے بسرے بھی نہ بولتیں کہ "میاں شادی کر لو تو گھر جنت بن جائے"، مگر بہنوئی تھے کہ اپنی ہی الاپے جاتے۔ اور چھوٹی بیگم کے چپ رہ جانے کی بڑی وجہ تو یہ بھی تھی کہ بھائی

کی عمر وہ دیکھ رہی تھیں۔ رابعہ بیگم بھی سامنے ہی تھیں۔ عورت کے متعلق تو مشہور ہے کہ "وہ بیسی تو گھسی"، یعنی بیس برس کی عمر ڈھلی، سمجھو گھس گئی عورت۔ اور یہاں تو تیس کے بھی اوپر بات جا پہنچی تھی۔ مگر رفیع الدین اپنے رشتے سے آخر دم تک فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ جا بیجا چوٹ کرتے رہتے، تیر چلاتے رہتے، کون جانے کب تیر کہاں چل لگے۔؟

خالی خولی کمرے میں دو چار اجلے سجلے کپڑے دیکھ کر بول اٹھتے۔

"ارے میاں منیر، ان سفید کپڑوں میں جب تک دو ایک رنگ برنگی کپڑے نہ دکھائی دیں زندگی کا مزہ نہیں آتا"۔ مگر منیر میاں زندگی کے اس مزے کے بارے میں سوچتے ہی کب تھے۔؟ انھیں تو وہی راہبوں کی زندگی پسند تھی۔ جہاں وہ کتابوں کا کیڑا بنے رہتے۔ لے دے کے سارا کام غفور اپنی نمٹا دیتا۔ بہت ہی اہم بات ہوتی تو رابعہ بیگم تک بات کی پہنچ ہوتی، ورنہ اس کی بھی حاجت نہ تھی۔

قصہ ایک رات کا

اگر اس رات غفور، منیر میاں کے سرہانے پانی رکھنا نہ بھول جاتا تو اس کہانی کا انجام ہی کچھ اور ہوتا۔

ایک تو گرمی کے دن۔ اس پر سے غضب کی امس۔ پیاس کے مارے دم نکلا پڑتا۔ دن بھر پانی پی پی کر پیٹ پر بھگارا آجاتا مگر پیاس نہ بجھتی۔ اور پان کھا کر تو یوں بھی پیاس زیادہ لگتی ہے۔ اس رات منیر میاں دو چار پان کھا گئے تھے۔ اور نیند سے جو ایک دم چونکے تو حلق تھا کہ ایک دم سوکھا چلا آرہا تھا۔ نیند سے جاگ کر سرہانے کی میز کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ حسب معمول صراحی اور گلاس

رکھا ہوگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ پیاس سے جز بز تو ہو ہی رہے تھے، دو چار ماں بہن کی سنا کر بولے۔

"غفورے۔ او غفورے۔"

نیند کا ماتا غفورا اتنی جلدی کیا جواب دیتا۔؟

"ارے کمبخت سرہانے پانی رکھنا بھول گیا۔ اب پیاس لگی ہے تو کیا پیوں۔؟ تیری ماں کا دودھ؟"
رفیع الدین کچی نیند کے تو تھے ہی، ان کی ہائے وائے پر اٹھ بیٹھے۔ مگر مذاق کا موقع کیسے کھوتے؟ وہیں اپنے پلنگ پر سے پڑے پڑے بولے۔ "ارے میاں اس کی ماں کا دودھ کاہے کو پیو، پانی ہی پیو، مگر اس کا بھی ڈھنگ سیکھو۔ شادی کر کے دیکھو بیوی کس طرح ذمہ داری سے کام انجام دیتی ہے۔"

منیر میاں جھلائے بکتے جھکتے اٹھے۔ "بھائی صاحب آپ کو تو بس مذاق ہی سوجھتا ہے۔"
وہ پیر پٹخنے مردانے سے زنانے کو چلے۔ کمبخت غفورا ایسا سو رہا تھا کہ ہلا تک نہیں رفیع الدین نے کروٹ لی اور خرخر کرنے لگے۔ چلتے چلتے منیر میاں نے غفورے کی پیٹھ پر ایک بھرپور لات جمائی، مگر وہ پھر بھی نہ ہلا۔

گرمیوں کے دن۔ ہلکی ہلکی چاندنی، بہتی ہوئی چپ چاپ سی ہوا۔ صحن میں پلنگ پڑے ہوئے تھے اور چھوٹی بیگم سوئی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ والے پلنگ پر منے میاں، اس سے ذرا ہٹ کر رابعہ بیگم۔ مگر کس انداز سے۔؟

صبح سے دانت میں درد تھا۔ بھاوج نے کہا۔ "اے ذرا سی مسّی بھر لو، سب درد غائب ہو جائے گا۔!" رابعہ بیگم جھجکیں۔

مسّی تو سنگھار ہے ایک طرح سے، مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔ چھوٹی بیگم بھانپ گئیں۔ "ارے بھا گیہ وان یہ کون کہے گا کہ سنگھار کی خاطر لگائی ہے۔ دوا سمجھ کر

نہ لگالو۔" دانتوں پر مسّی کی انگلی پھیری تو وہ دانتوں سے ہوتے ہوتے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی۔ گورا گورا دمکتا چہرہ، اس میں اودے اودے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں اور وہ نرم نرم سے مومیا پپوٹے جیسے موم سے بنائے گئے ہوں۔ بالوں کی ایک لٹ چاند ایسی پیشانی پر آئی ہوئی، جس میں تین چار سفید بال بھی چم چما رہے تھے۔ ایک ہاتھ سر کے پیچھے سے لاکر ماتھے پر ٹکا لیا تھا، جیسے نور کے دائرے میں چاند چمک رہا ہو! یہ سب کچھ تو تھا ہی۔ ساڑی پہننے کا اتفاق کہاں ہوا ہوگا رابعہ بیگم کو۔ ایسے اڑبھنگ پن سے سوئی تھیں کہ ساڑی لہنگے سمیت گھٹنوں کی خبر لے رہی تھی۔

صحن کے ایک طرف کونے میں، تپائی پر صراحی اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ منیر میاں کی نگاہ تو یوں ہی پلنگوں کی طرف اٹھ گئی تھی۔ نیند بھری آدھ کھلی آنکھیں تھیں مگر وہ جیسے جھجک کر رہ گئے۔ اور جھٹ سے ان کی آنکھیں کھل گئیں، جیسے گہری نیند سے اچانک گھبرا کر اٹھ بیٹھے ہوں۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پلنگ کی پٹی پر ایک طرف بڑی آہستگی سے رکھی ہوئی پنڈلی مچھلی کی پیٹھ ایسی چمکتی ہوئی، جس پر ڈھلتی عمر کے سائے لرز رہے تھے۔ بالکل آہستگی سے پیر اٹھاتے وہ پائنتی پہنچ گئے۔ اب کے بہت غور سے دیکھا۔ پنڈلی پر بہت ہی ننھے ننھے نرم نرم سے بال تھے! ہوا کا ایک خفیف سا جھونکا آیا اور یہ روئیں لرز لرز اٹھے۔ منیر میاں کا دل چاہا ان روؤں کو ہاتھ سے سہلانا شروع کردیں ان کی کنپٹیاں سن سن کرنے لگیں۔ ایک دم انھیں شدید پیاس کا احساس ہوا۔ بڑھ کر ایک ہی دم سے ساری صراحی گٹ گٹ کر کے خالی کر ڈالی، مگر ایسا لگ رہا تھا کنواں بھر پانی بھی پی لیں تو پیاسے ہی رہیں گے۔

اب کے جھجکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مردانے سے خر خر آواز آرہی تھی۔

ادھر منے میاں مزے سے سو رہے تھے اور چھوٹی بیگم تو سدا کی مستثنٹر تھیں نیند کی۔ اور پھر رابعہ بیگم تھیں جو اپنی اوندھی سیپی جیسی آنکھیں بند کیے یوں سوئی پڑی تھیں کہ لوگوں کی نیند اڑ اڑ کر بھاگ رہی تھی۔

منیر میاں سہمے سہمے سے آگے بڑھے۔ اب وہ صندلی اور چکنی چکنی پنڈلیاں بالکل ان کی نظروں کے سامنے تھیں۔ پھر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور بہت دھیرے دھیرے اس صندلی پنڈلی پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنا چہرہ جھکایا اور چٹ سے پنڈلی کا بوسہ لے لیا۔

سیمیں سی پنڈلی پر ایک سرخ سرخ سا دھبہ ابھر آیا جیسے دہکتا ہوا انگارہ!

شجرِ ممنوعہ

پڑوس میں جانے کس کی شادی تھی۔ مسلسل باجے بج رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ دھوم دھڑکا تھی کہ خدا کی پناہ! دو روز سے یہی ہنگامے تھے۔ آج چوتھی تھی شادی کا دوسرا دن۔

منے میاں جھومتے جھامتے چلے آ رہے تھے منہ میں پان اور گلے میں باسی پھولوں کا یہ اتنا بڑا سا گجرا جو ان کے گھٹنوں کو چھوئے لیتا تھا۔ منیر میاں سامنے ہی کھڑے تھے منے کو آتا دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور مسکرا کر بولے۔

"کیوں بے، شادی کا بڑا ارمان ہے! ابھی مونچھ تک تو نہیں نکلی اور شادی کی تمنا میں باسی گجرے گلے میں ڈالے پھرتے ہیں۔ یہ عمر ہے تیری شادی کرنے کی۔؟"

اور منے میاں کے گلے سے باسی پھولوں کا گجرا اتار کر منیر میاں نے اپنے گلے میں ڈال لیا۔

تین جنازے

بڑے چچا میاں دیوان خانے سے لگی کوٹھری سے نکلے تو پیچھے پیچھے گیندا خالہ بھی ان کے کرتے کا دامن کھینچتی نکلیں، بدحواس اور گھبرائی ہوئیں۔

"میں کیا کروں گی حضور۔؟ یہ راز چھپا تو نہیں رہیگا!"

چچا میاں نے خشمگیں آنکھوں سے انھیں دیکھا۔ "تو ایسی کونسی عزت والی بی بی ہو تم۔ کون بٹہ لگ جائے گا تمہارے نام کو۔"

گیندا خالہ کے ہاتھ سے ان کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ وہیں چوکھٹ پر بیٹھ گئیں "مجھے کوئی بٹہ نہیں لگے گا۔؟"

چچا میاں مسکرائے۔ "گھر کی لونڈی باندیوں کی عزت ہی کیا ہوتی ہے گیندا بیگم۔ تم خواہ مخواہ اپنے کو اہمیت دے رہی ہو۔"

گیندا خالہ بھڑک اٹھیں۔ چار لوگوں میں یوم ہو گی تو میں کھڑے کھڑے منہ پر تھوک دوں گی۔" کہہ دوں گی نواب حیدر کا ہے۔"

"اچھا، یہ بات ہے۔؟ چچا میاں سلگ اٹھے۔" مگر یوم ہونے ہی کیوں لگی؟ کیا ڈیوڑھی والوں کے لئے یہ نئی بات ہے۔؟ مگر تمہارا یقین بھی کون کرے گا۔ سیکڑوں حرامی حلالی گھر میں بھرے پڑے ہیں۔ انھیں چھوڑ کون میرا نام لے گا۔؟"

"آنے والا ئے گا تمہارا نام تمہاری شکل پر پڑے گا، تب تو نہ جھٹلا سکو گے دنیا کو۔

"تمہارا نہیں بگڑے گا تو تمہاری اولاد کے آگے آئے گا۔ بھری جمعرات کو، جب چاروں شاہیں ملتی ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوسنے دوں گی کہ خدایا جیسا مجھے ستایا ہے ویسا ہی بھرے۔"

چچا میاں ایک منٹ تک کھڑے گھورتے رہے، پھر پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔

دوپہر کے کھانے پر چچا میاں ایسے چپ چاپ تھے جیسے کسی بہت ہی قریبی عزیز کو دفنا کر آئے ہوں۔

بڑی ممانی نے چھیڑا۔ "آج یہ تھوبڑا کیوں پھولا ہوا ہے جناب کا!"

"میرا۔؟ نہیں تو۔" نواب حیدر بوکھلا سے گئے۔ "کہاں۔؟ ہنس تو رہا ہوں۔"

"ہنس رہے ہو یا رو رہے ہو۔؟ آخر بات کیا ہوئی۔؟ پتہ تو چلے کچھ۔"

چچا میاں نے ہاتھ روک لیا۔ "تم لوگ یقین کیوں نہیں کرتے؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسے ہی سر دکھ رہا ہے۔" اور انہوں نے ہاتھ دھو لئے۔ ان کی پسند کے شامی کباب پڑے سوکھتے رہے۔

سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ ڈیوڑھی والوں کے لئے اس سے زیادہ عجیب و غریب بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ چچا میاں بغیر کسی وجہ کے یوں اداس اور چپ ہو جائیں۔

چچا میاں ڈیوڑھی کی جان تھے۔ گھر کے مالک تھے مگر سب سے یوں بے تکلف کہ پتہ نہ چلتا کہ یہی اس ڈیوڑھی کے نواب ہیں۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے سے کام۔ لڑکے لڑکیاں، شادی شدہ، غیر شادی شدہ، نوکر، باندیاں، کوئی بھی تو ان کے مذاق سے نہ بچتا۔ عمر تو پچاس پچپن یا اس سے بھی سوا ہو گی مگر ہنسی دل لگی کی باتیں ایسی، کہ لڑکے بھی شرما جائیں۔

ڈیوڑھی میں بڑے ہال سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو نماز کے لئے وقف تھا۔ مغرب کے وقت جب پورا گھر نماز پڑھنے جمع ہوتا چچا میاں وہاں پہنچ جاتے۔ ایسا موقع تو ہاتھ آتا ہی تھا کہ دو چار لڑکیاں غائب رہیں۔ بس ناک کی ڈنڈی میں دم آجاتا۔

"زہرہ کدھر گئی؟ یہ نور بی بی کو کیا ہوگیا؟ سلیمہ بی بی کا مزاج کیوں بگڑ گیا۔؟ اور تو اور اپنی بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتے۔ نادرہ بیگم نے آج نماز کیوں نہیں پڑھی بھئی؟ صابرہ تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔"

نوجوان لڑکیاں شرم سے منہ چھپا لیتیں۔ دوپٹوں کی اوٹ میں ہو ہو جاتیں اور چچا میاں مسکراتے ہوئے چلے جاتے۔ چلتے چلاتے مزید ثبوت کے لئے ایک آدھ فقرہ اور کس دیتے۔

زہرہ بیگم چڑ جاتیں۔ "توبہ ہے چچا میاں تو بالکل سٹھیا گئے ہیں۔"

صبح کی نماز میں اگر رفیق میاں، سلیم میاں یا چھوٹے بھائی نہ نظر آتے تو بس ان کی بیویوں کی شامت آجاتی۔" یہ لڑکے پتہ نہیں صبح کی نماز میں کیوں شامل نہیں ہوتے؟ زہرہ بیگم تمہارے میاں کی نماز قضا ہونے کا سارا عذاب تمہیں پر پڑیگا۔ شاکرہ بیگم تم اپنے ساتھ سلیم میاں کو بھی گناہگار کرتی ہو۔" اپنی دو پلی ٹوپی سر پر جماتے ہوئے کہتے۔" ارے میاں خدا کے خوف کا بھی کچھ خیال کیا کرو۔"

شاکرہ بیگم سر سے پیر تک چادر تان لیتیں۔ زہرہ بیگم شرم سے لال ہو جاتیں، اور چچا میاں چلے جاتے تو شاکرہ بیگم سر نکال کر کہتیں۔ "توبہ ہے اللہ کتنے خراب ہیں بھائی جان کسی کا تو خیال کرتے۔ میں تو کٹ کر رہ گئی۔ کسی کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔"

لونڈیاں، باندیاں، چھوکریاں دوڑ دوڑ کے کام کرتیں تو یہ بھی سدھ نہ رہتی کہ

ازار بند ٹخنوں کی خبر لے رہا ہے۔ چچا میاں لپکنے کے انداز میں بڑی صاف دلی سے کہتے۔ " رمضانی بوا گڑ چنے کھلاؤ، نہیں تو ابھی ابھی .....۔"۔
کانپ کر وہ کہہ اٹھتیں۔ " میاں تمہارے پیروں پڑتی ہوں، یہ لو ابھی لے کو پیسے۔" اور وہ اپنی میلی کچیلی تھیلی میں سے پیسے نکال کر دور پھینک دیتیں۔
چچا میاں مسکراتے ہوئے پیسے اٹھا لیتے اور انھیں کو لوٹا دیتے۔
باورچی خانے میں چلے جاتے تو گھنٹوں نہ اٹھتے اور نوکر مالک کا فرق مٹ جاتا۔ مذاق وہاں بھی ختم نہ ہوتے۔ کچھ دنوں پہلے یہ خبر بڑے زور شور سے سنی گئی تھی کہ چچا میاں گیندا خالہ کے گورے گورے گھٹنے اور چمکتی ہوئی پنڈلیاں دیکھ کر وہ گڑ چنے مانگنا بھی بھول گئے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں گڑ چنے مانگنے کی فرصت بھی کہاں رہ گئی تھی۔ گیندا خالہ جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا رنگ اتنا سنہری اور چمکتا ہوا ہے کہ جس پانی سے وہ منہ دھوتی ہیں وہ سنہری ہو کر نیچے گرتا ہے۔ ان کا نام گیندا اسی لئے تو رکھا گیا تھا کہ وہ گیندے کی طرح سنہری تھیں۔ نل سے پانی بھرتے وقت جب وہ اپنی شلوار اونچی کر لیتیں کہ بھیگ نہ جائے تو ان کی سڈول پنڈلیاں جن پر ننھے ننھے سنہری بال تھے اتنی خوبصورت نظر آئیں کہ "چاہنے والوں،" کا دل کہہ اٹھتا۔ "گیندا عمر بھر پانی بھرتی رہے۔"
اور پھر دبی دبی زبانوں سے کچھ ایسی باتیں بھی سننے میں آئی تھیں کہ باورچی خانے کے بازو والی کوٹھری میں چچا میاں اکثر گیندا خالہ سے گڑ چنے مانگنے جاتے ہیں۔

" آنے والا لے گا تمہارا نام"۔

" تمہارا نہیں بگڑے گا تو تمہاری اولاد کے سامنے آئیگا۔"

نواب حیدر نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کس کی آواز تھی۔

ہشت، کوئی بھی نہ تھا۔

یہ ان کا اپنا وہم تھا جو گیندا کی باتیں دہرا رہا تھا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ ذرا سی چھوکریاں ناحق اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہیں۔ کل کی چھوکری۔ ابھی ابھی کی تو بات لگتی ہے چاند بی گود میں اُٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔ گھر بھر کے بچوں نے اگر گیندا خالہ کہنا شروع کر دیا تو کیا سچ وہ عزت والی ہو گئی، ہے تو وہی اٹھارہ برس کی چھوکری۔"

انھوں نے اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہا، مگر دل کے خوف کو دبا نہ سکے۔

بڑے حضرت کے زمانے میں ساری ڈیوڑھی ماما، لونڈیوں اور باندیوں سے بھری پڑی تھی۔ بہتی گنگا تھی۔ جو چاہتا نہاتا اور پھر پاک کا پاک رہتا۔ کسی کا حال کسی سے چھپا نہ تھا اور سب اپنی اپنی جگہ پہ یہ سمجھتے تھے کہ کسی کو ہماری خبر نہیں۔

سال دو سال میں دو تین واقعے ضرور ایسے ہو جاتے کہ بی اماں کو "نوکر خانے" میں جانا پڑتا۔ دائی آتی، چیخیں بلند ہوتیں، پھر ننھے منے سے بچے کے رونے کی آواز اور بی اماں مطمئن ہو کر اپنے تخت پر آ بیٹھتیں اپنے مخصوص لہجہ میں لیکچر شروع کر دیتیں "حرامزادے، ماٹی ملے اپنا کام کر کے چلتے بنیں، نہ آگا دیکھیں نہ پیچھا۔ کوئی پوچھے ان سے تمہاری بیویاں مر گئی ہیں جو لونڈیوں کے بستر گرم کرتے ہیں جا جا کے"۔ پھر ان کا لہجہ بدل جاتا۔ "مگر سارا قصور ان چھنالوں کا ہے۔ جان بوجھ کر اپنے پیچھے دھگڑے لگا لیتی ہیں اور وقت آ پڑنے پر چلا چلا کر آفتیں مچاتی ہیں۔"

اور یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ یونہی تھوڑی بہت ہائے وائے ہوتی اور سکون چھا جاتا۔ پانی میں پتھر پڑے بھی تو ایسی کتنی دیر ہلچل مچے گی۔؟ ڈب کر کے آواز نکلے گی، بلبلے اٹھیں گے، اور جب تک کہ پتھر تہہ میں جا بیٹھے اوپر کی سطح ایسی پُرسکون، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مگر یہ تھیں بی اماں اور بڑے حضرت کے زمانے کی باتیں۔ اب تو کمین ماماائیں اور لونڈیاں بھی ایسی شیر ہوگئی تھیں کہ بات بے بات عزت عزت پکارنے لگتیں۔ گیندا نے جس حوصلے اور عزم سے انھیں بدنام کر دینے اور بد دعائیں دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس سے نواب حیدر خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔ اپنی بدنامی کے خیال سے زیادہ انھیں یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ ان کی اپنی بیٹیوں کے کان پر یہ بات گئی تو وہ کیا اثر لیں گی۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ چلتے اڑتے کوئی پیام ہی نہ تھے ان کے نصیبوں کے۔ اور یہ بات تو کبھی نہ کبھی پھوٹنا ہی تھی۔

اتنی بڑی بھری دنیا میں کوئی تو ایسا نہ تھا جس کی نظر انتخاب نادرہ بیگم پر پڑ جاتی۔ اور ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ تین تین سیانی بیٹیاں اور لڑکوں کا یہ کال! چھوٹے ماموں ہاتھ چلا چلا کر لیکچر جھاڑتے۔ "اجی جناب لڑکیوں کو بٹھا کر مت رکھئے شرافت بھلا قائم رہے گی، اور پھر ایسا دھوکا ہوگا آپ لوگوں کو کہ بس ٹاپتے رہ جائیں گے۔ مگر میں تو کہتا ہوں اچھا ہے۔ آپ لوگوں کو ایسا سبق ملنا چاہیے۔ کوئی لڑکی بھاگ جائے کسی کے ساتھ، پھر آنکھیں کھلیں گی آپ کی، اور لڑکیوں کو بٹھائے رکھنے کا پورا مزہ آئیگا۔ ارے میاں ان کی زبان چپ ہے۔ آنکھیں تو بولتی ہیں۔ نادرہ بیگم، صابرہ بیگم کے قدم بہکے بہکے پڑنے لگے ہیں۔ ہاں، آگے آپ جانیں۔ آپ کا ہاتھ ٹوٹے گا۔ آپ کے گلے میں بندھے گا۔ ہمارا کیا ہے۔"

شاہجہاں بیگم چپ چاپ سنتیں اور ٹھنڈی سانس بھرتیں۔

"تم سمجھتے ہو ہم لڑکیوں کا مربہ بنانے والے ہیں۔ دھیڑ، چمار کوئی بھی پلٹے تب نا۔ میں تو آج ان کے منڈ کے ہلا دوں۔"

چھوٹے ماموں غصے سے چیخ پڑتے۔ "بیغاموں کو مت روؤ آپا جان۔ تم تو

شکر ۔ کے کنکر چننے لگتی ہو۔ ہزار تو آئے ہوں گے۔ محلسرا والی بیگم اپنے بیٹے کا پیام دے کر آئیں تو تم نے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ لڑکا ناک میں سے بولتا ہے۔ ارے ناک کٹانے سے اچھا ہے کہ ناک سے بولنے والے کو داماد بنا لیا جائے مگر ہٹاؤ، میں کیوں جان کڑھاؤں؟ بدنامی ہوگی پورے خاندان کی تمہارے نواب حیدر کو ہنسی مذاق سے نارڈوں سے اور گڑ چنے کھانے سے تو فرصت ملے۔"

اور آپا جان بے دقوفوں کی طرح ان کا منہ تاکتیں۔

"میں کہتی ہوں کچھ فکر بھی ہے تمھیں؟ دو بیٹیاں سیانی ہو گئی ہیں۔ ہزاروں پیام آتے ہیں مگر تم کبھی توجہ ہی نہیں دیتے۔ کیا ساری عمر بٹھائے رکھنے کا ارادہ ہے؟ سفید بال چن کر بیٹیاں بیاہنا۔ میری تو جان عذاب میں ہے مولیٰ۔ ہائے اللہ، کیا ہوگا۔ میری بیٹیوں کا۔؟" شاہجہاں بیگم چھالیہ کاٹتے کاٹتے بڑبڑا رہی تھیں۔

"ارے بیگم، تمھیں تو سارا دن شادیوں کی ہی پڑی رہتی ہے۔ ایسی کون سی بڑی ہو گئی ہیں ہماری بیٹیاں۔ صابرہ تو بالکل گڑیا سی لگتی ہے ابھی۔"

"ارے تمھیں کیوں نہ لگیں گی چھوٹی چھوٹی گڑیاں۔ ہمارے ماں باپ نے تو ہمیں تیرہویں سال ہی بیاہ دیا تھا، یہاں تو بیسی بھی ڈھلی جا رہی ہے۔"

"بیگم وہ زمانہ اور تھا، یہ زمانہ اور ہے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی اتنی جلد نہیں کرنی چاہئے، ان کے نازک کندھے اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"تمہاری انہیں باتوں سے تو میرے آگ لگ جاتی ہے۔ ہماری بھی تو شادی ہوئی تھی کبھی۔ ہمارے کندھوں میں ایسا کہاں کا زور آ گیا تھا۔؟ ہمارے بھی کندھے نازک تھے۔ اس گھر میں آئے تیس بتیس سال ہوتے ہیں، بتاؤ کبھی ساس سسر کو یا تم کو شکایت کا موقع دیا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تم نافرمانبردار بہو یا بیوی ثابت ہوئی ہو، میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ ابھی سے کیا جلدی ہے۔"

شاہجہاں بیگم بھڑک اٹھیں۔

"پھر وہی جلدی۔ ارے یہ جلدی ہے؟ عمریں تو دیکھو اور پھر جائداد کا وہ حال ہے کہ آمدنی گھٹتے گھٹتے پاؤ رہ گئی ہے۔ لڑکیاں ہیں کہ تاڑ کے جھاڑ کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ کل ہی تو ممدو کی ماں آئی تو کہہ رہی تھی۔ اے بی، کب تک لڑکیوں کو گھر بٹھا رکھو گی۔؟ یہی دن تو شادی بیاہ کے ہوتے ہیں۔ پکی عمر میں شادی کر کے چہروں پر سنّاٹا آجاتا ہے۔ کیا کہوں میں تو بس کٹ کر رہ گئی۔ بڑے صاحبزادے کے ڈھنگ تو دیکھ ہی رہے ہو۔ آنکھیں بند ہو جائیں گی تو گھر میں جھانکیں گے بھی نہیں۔ آگے تم جانو تمہارا کام۔ میں عورت ذات کیا کر سکتی ہوں تمہاری مرضی کے آگے"۔ اور شاہجہاں بیگم نے زور سے پاندان بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر بڑبڑانا شروع کر دیا۔

"پیغام بھی اجاڑ ایسے کون سے ہزاروں ہزاروں کے ہیں۔ تین ہی تو پیام سامنے ہیں۔ نواب جعفر مرزا کا چھوٹا بیٹا، جو دسویں میں ناپاس ہو گیا ہے۔ اس کی نسبت نادرہ کو آئی ہے۔ اور چھوٹی آپا کے بڑے بیٹے کو صابرہ کو مانگتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں ہاں کر دو بھلا کیا بُرائی ہے۔؟ سامنے کے لڑکے ایسے ہی برے دِکھتے ہیں۔ ہاتھ سے چلے جائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔ اور وہ موا رابعہ کا بیٹا تو یوں ہی سا ہے، مجھے نہیں بھاتا۔ تم تو کبھی پوچھ تاچھ کرنا جانتے ہی نہیں"۔

نواب صاحب نے ناس کی ڈبیہ اچکن کی جیب میں رکھی۔ اٹھتے ہوئے بولے۔ "کہتی تو ٹھیک ہو، میں غور کر لوں گا"۔

نواب حیدر پنڈروں کے رئیس تھے۔ جھوٹ سچ کا حال تو خدا ہی کو بہتر معلوم ہے مگر سنتے ہیں کہ ان کے گو موت اٹھانے والے ٹھیکرے بھی سونے چاندی کے تھے۔ اتنی بڑی بڑی جاگیریں تھیں کہ ان کی آمدنی لاکھوں کروڑوں تک جاتی تھی۔ وہی

دولت تھی کہ آبا و اجداد سے لیکر اب تک چلی آرہی تھی۔ مگر جیسا کہ بُرے دن سدا نہیں رہتے ویسے اچھے دن بھی ہمیشہ نہیں رہتے۔ بہار کا دور ختم ہوا، خزاں آئی اور خزاں بھی آئی تو ایسی کہ سوکھے پتے بھی باقی نہ رہے۔ اب تو نواب حیدر کی صرف دکھاوے کی شان باقی تھی۔ ورنہ یوں تو ان کی حیثیت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ مگر ٹیپ ٹاپ اور نوابی ٹھاٹھ وہی تھے۔ رسّی تو کبھی کی جل چکی تھی مگر بل جوں کا توں باقی تھا۔ اگر تن تنہا ہوتے تو شاید گزر بھی جاتی۔ مگر ماشاءاللہ تین لڑکیوں اور دو لڑکوں کے باپ تھے اور ایک بیوی کے شوہر اور پھر دنیا داری رہی وہ الگ۔

دو بیٹیاں شادی کے قابل ہو چکی تھیں۔ چھوٹی بیٹی ہمیرہ بھی ایسی چھوٹی نہ تھی۔ مگر نادرہ بیگم اور صابرہ بیگم کے سامنے اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا ہی پڑتا۔ بڑا بیٹا بالکل آوارہ تھا۔ لوگ کہتے کہ اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ چھوٹا تو چھ سات سال کا تھا۔

شاہجہاں بیگم اس ڈیوڑھی میں نواب کی بیگم اور نواب کی بہو بن کر آئی تھیں۔ شادی کے بعد پندرہ بیس سال تو بڑے اچھے گزرے مگر ادھر کچھ سالوں سے سسرال کی حالت بالکل تباہ دیکھ رہی تھیں وہی اس ڈیوڑھی کی بیگم تھیں۔ اور برے بھلے سارے انتظامات انھیں کو انجام دینے پڑتے۔ شاہجہاں بیگم اپنی جگہ یہ سمجھتیں کہ نواب حیدر لڑکیوں کی طرف سے بالکل لاپرواہیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ نواب حیدر دن رات اسی فکر میں گھلے جاتے۔ اپنی فکروں اور پریشانیوں پر انہوں نے بناوٹی خوشی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنے غموں اور فکروں سے نجات پانے کے لئے سدا ہنستے رہتے۔ نوکروں، ماماؤں، بھائی بندوں سے بیہودہ مذاق کرتے۔ ورنہ کوئی بات نہ تھی کہ پچپن سال کے بوڑھے نواب، جو جوانی میں بھی ہنسوڑ نہ رہے تھے۔ یکایکی

کیسے کھلنڈرے بن کر رہ گئے ہیں۔ نواب حیدر اپنی پریشانیاں بیگم کے سامنے ظاہر نہ کر سکتے اور انہوں نے مسکراہٹ اور خوشی کی جو دبیز چادر اوڑھ لی تھی وہ اتنی موٹی تھی کہ اس میں سے کبھی پریشانی نہ جھلک سکی۔

مگر آج کی باتوں نے نواب حیدر کی فکر میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ وہ سوچ رہے تھے۔؟ وہ بیگم کہتی ہیں میں پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ مگر جعفر کے چھوٹے بیٹے کو کون نہیں جانتا؟ زمانے بھر کے عیب اس میں موجود ہیں۔ پھر بھی بیگم کا یہ کہنا ہے کہ ہاں کر دو۔ اور وہ بیگم کی چھوٹی آپا کا بڑا بیٹا۔ آخ تھو۔ نواب حیدر نے پٹارخ سے دیوار پر تھوک دیا۔ ایسی منحوس صورت ہے کہ صبح دیکھ لو تو دن بھر کھانا نہ ملے۔ لڑکوں کا کال، جائداد کا وہ حال۔ اور لڑکیوں کا آکاس بیل کی طرح چڑھتے ہی چلے جانا، نواب حیدر سر تھام کر رہ گئے۔ اور انھیں اپنے دادا ابا یاد آ گئے جو اپنی بارہ سالہ بیٹی کلثوم بیگم یعنی نواب حیدر کی پھوپھی کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ جوان بیٹی اور مُردے کو بٹھانا ایک ہی بات ہے" مطلب یہ ہے کہ میرے گھر بھی دو جنازے پڑے ہوئے ہیں اور پھر تیسرا اخبارہ بھی۔ میرے خدا! میں انھیں کیوں کر دفناؤں۔؟ اور نواب حیدر نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ پر سر رکھ دیا۔

"کیوں جی۔ لڑکوں کو بلایا تھا پسند آئے۔؟" شاہجہاں بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

مگر جواب میں نواب حیدر نہیں مسکرائے۔ گاؤ تکیہ سے ٹکے ہوئے مسافر کی طرح ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ "تمہاری ضد پر بلوانا پڑا تھا ورنہ میں تو ان لونڈوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔"

"ہائے تو کیا تمھیں دونوں میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ کم از کم جعفر کے بیٹے کو ہی پسند کر لیتے۔ نادرہ تو اٹھ جاتی۔ اب تو وہ بھی ستائیس کی ہو رہی ہے۔"

"نادرہ تو اٹھ جاتی! نواب حیدر چڑ کر بولے۔" تو کیا نادرہ کوئی بوجھ ہے کہ اٹھا پھینکوں۔ اس نالائق کو دیکھا بھی ہے تم نے کہ بس اٹھائی زبان اور تالو سے لگا دی۔ اور وہ تمہاری چھوٹی آپا کا بیٹا، جس کی تعریف میں تم زمین آسمان کے قلابے ملاتی ہو۔ ہزار بار یہاں آچکا ہے اسے کیا دیکھنا؟ بے ہودہ کہیں کا۔ جگہ جگہ معاشقے لڑاتا پھرتا ہے۔ عنایت بیگ نے کل ہی اسے ننھی جان کے کوٹھے سے اترتے دیکھا پتہ نہیں تمہاری عقل کدھر گم ہو کر رہ گئی ہے۔"

شاہجہاں بیگم اس انکشاف پر سر پکڑ کر رہ گئیں

کہتے ہیں بیٹی پہلے پڑوس میں جوان ہوتی ہے۔ لڑکی ذرا سیانی ہوئی کہ پاس پڑوس والوں نے ٹوکنا شروع کیا۔

"اے بی لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ کب تک بٹھاؤ گی۔؟"

"لڑکی کو کہاں دیا بہن۔؟ اب تو خاصے ہاتھ پیر نکالے ہیں اس نے۔"

"اپنی لڑکیاں چاہے آپ پہاڑ ہو رہی ہوں مگر دوسروں کی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی اپنی لڑکیوں سے بڑی نظر آتی ہیں۔ توبہ ہے۔ کوئی دبی زبان سے کہتے ہوئے بھی ڈرے اور کوئی ڈنکے کی چوٹ کہہ کر یوں اکڑ دکھائے گویا لڑکی کی شادی کر دینے کا فرض یاد دلا کر بڑا احسان کر دیا ہے غریب لڑکی کی ماں پر۔

ڈیوڑھی میں حیدر آباد کی ایک ماما تھی۔ منہ چڑھی اور بات بے بات بیچ میں بول دینے والی

"اتو پاشا! منجھلی صاحبزادی کو اٹھا دیونا اب تو۔ کل ماسٹر صاحب کے سنگات ہنس بول رئیں تھے انوں۔ عورت بچیاں کو سکائے کو تو بھی بٹھا کو رکھے گے ماں۔ اس وخت تک تو ہاتھاں پیلے کر چ دینا۔"

شاہجہاں بیگم کا منہ لٹک گیا۔ سارا خون جمتا ہوا نظر آیا۔ دوسرے دن ہی سے

ستار سکھانے والا ماسٹر برخاست کر دیا گیا اور ستار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اور شاہجہاں بیگم کو اپنے بھائی کی بات یاد آئی۔ "لڑکیاں بٹھا رکھنے کا مزا تب آئیگا جب بھاگ جائے ایک آدھ لڑکی منہ پر کالک تھوپ کر آپ کے۔!"

نادرہ بیگم جو بہکیں تو سب کے ہاتھ پیر ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ کہاں وہ جھکی جھکی شرمیلی آنکھیں اور کہاں بہکے ہوئے بین! بیٹھے بیٹھے اچانک صابرہ بیگم سے بول اٹھیں۔

"تو اپنے دولہا بھائی سے مہندی لگائی گیا لے گی۔؟ مگر دیکھ، تو بھی ستانا چھوڑنا انھیں۔ گھڑی یا فونٹن لینا، ورنہ وہ تو بس اپنے رشتے سے فائدہ اٹھا کر تجھے مرغی پکڑاتے بھی نہ چوکیں۔"

صابرہ بیگم کو چیخیں مار کر اپنے اماں ابا کو جمع کر لینے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔

نواب حیدر اور شاہجہاں بیگم دم سادھ کر رہ گئے۔ نادرہ بیگم کھلے آسمان کو یوں ٹکر ٹکر تاکتی پڑی تھیں جیسے وہاں سے کسی بلاوے کی منتظر ہوں۔ مگر یہ بات تھی چند دن پہلے کی۔ اب جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ دونوں پیام ناپسند کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ڈھیر ہو گئی تھی۔ بجھی بجھی سی رہتی۔ پیاری پیاری صورت پر کیسی ہولناک اداسی چھا کر رہ گئی کہ ماں کا دل کٹا جاتا۔

اور ایک دن تو اس نے بڑے اہتمام سے سر پر پلو اوڑھا، ہاتھوں سے بال برابر کئے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے دیوان خانے میں آ گئی، جہاں حیدر نواب اپنی بیگم سے پیاموں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ نادرہ کو آتا دیکھ کر انھوں نے زبان بند کر لی۔

"ابا حضور!" اس نے تھرتھرائی آواز سے کہا۔

"کیا ہے بیٹی ۔ ؟" نواب صاحب نے اس کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔
"جی میں یہ کہنے کو آئی ہوں" وہ تھوڑی دیر چپ رہی ۔ پھر صاف صاف بولنے لگی ۔ "میں کہتی ہوں کہ آپ لوگ میری شادی کی فکر نہ کرکے اگر صابرہ کی فکر کریں تو بہتر ہے ۔ کیونکہ میری عمر ......" اس نے سر سے پلو ہٹایا، کان کے پیچھے سے ایک لٹ کھینچی اور نواب صاحب کو دکھا کر بولی ۔ "یہ دیکھیئے اس لٹ میں کتنے سفید بال ہیں"

نواب حیدر، جو بڑے چچا میاں کے نام سے ڈیوڑھی بھر میں مشہور تھے ۔ بڑے ہنسوڑ، بڑے دل لگی باز ۔ ادھر کچھ دنوں سے ایسے سنجیدہ رہنے لگے تھے، ایسے بدل کر رہ گئے تھے کہ سوچنا پڑتا تھا کہ یہ وہی نواب ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی دوسری شکل ہے ۔ "نوکر خانے" میں جانا تو چھوٹ ہی گیا تھا ۔ مگر وہ یہ ضرور سنتے تھے کہ گیندا ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستی ہے ۔
"جیسا میرا برا کیا ہے ویسا اللہ تیری جوان بیٹیوں کو بھی نہیں چھوڑیگا ۔"
گیندا دیکھنے میں جتنی چنچل اور شریر نظر آتی ۔ حقیقتاً ویسی تھی نہیں ۔ وہ تو جمیل میاں کی دلہن بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی ۔ جو باجے تاشے لے کر آتے اور اسے اپنے گھر کی رانی بنائے جاتے ۔ جمیل میاں بڑی بیگم کے دور کے رشتوں سے بھتیجے لگتے لگتے تھے ۔ انہوں نے ایک بار گیندا خالہ کو پانی بھرتے دیکھ لیا تھا جب کہ وہ بالٹی اٹھائے لچکتی، ٹھمکتی دوڑ دوڑ کر مٹکوں میں پانی ڈال رہی تھیں ۔ شلوار گھٹنوں تک چڑھی ہوئی تھی ۔ بالٹی سے پانی چھلکتا اور ان کی سنہری پنڈلیوں پر جم جاتا ۔ سنہرے اور چمکدار موتی ! قدم اٹھاتے ہی وہ موتی پیروں میں گر کر ٹوٹ جاتے ۔ پھر بالٹی کا پانی چھلکتا اور پھر سنہرے سنہرے موتی لٹنے لگتے ۔

جمیل میاں کو یہ سب کچھ اتنا اچھا لگا تھا کہ ان کا دل چاہا کہ ہمیشہ کے لئے ان کی پنڈلیاں عریاں ہو جائیں۔ انہوں نے بڑی بے باکی سے گیندا خالہ سے کہا تھا "گیندا میری دلہن بنو گی؟"۔ گیندا خالہ شرما گئی تھیں۔ مگر انھیں کچھ دن بعد پتہ چلا کہ جمیل میاں نوکر خانے کی ہر چھوکری کو یہی جملہ کہتے ہیں تو ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سنہری موتی ان کے گالوں پر بھی چمکنے لگے تھے۔ اور پھر وہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ انھیں بڑے چچا میاں کے ہاتھوں مجبوراً "گرٹ چنے" دینے ہی پڑ گئے۔ مگر ان کے دل سے لال لال کپڑے پہن کر دلہن بن جانے کی خواہش فنا کب ہوئی تھی۔

نوکر خانے میں آج کل بڑی گہما گہمی رہتی۔ کھانا کھانے میں گیندا خالہ بڑا اٹھنہ بناتیں تو کوئی نہ کوئی لے اڑتا۔ ڈیوڑھی میں تو یہ بات بالکل عام تھی۔ بغیر ڈھول بجے کے، بغیر چڑھے بڑھاوے کے راتوں کی تاریکیوں میں دلہنیں سجتیں، شادیاں ہوتیں اور بغیر کسی اہتمام کے بچے جنے جاتے مگر گیندا خالہ اپنے آپ میں کٹی جاتیں۔ مومن علی ہاتھ مٹکا مٹکا کر لچکا لچکا کر گاتے۔

"سیّاں نے دل لے گئے لال بٹوے میں"

ہنسی کے فوارے چھوٹ جاتے اور گیندا خالہ کا بس نہ چلتا کہ مومن علی کا منہ نوچ لیتیں۔ اگر لال بٹوے میں دل چلا جاتا تو کون سی آفت آجاتی۔ مگر دل تو سلامت تھا۔ لال لال بٹوے میں عزت اور وہ دلہن بن جانے والی خواہش ضرور چلی گئی تھی۔ گیندا خالہ گھور کر مومن علی کو دیکھتیں وہ ناک پر انگلی رکھ کر بڑے نخرے سے چلاتے۔

"اوئی ماں میرے کو مت گھورو، میں تو مر جاؤں گی مارے ڈر کے۔"

نوکر خانے کے روح رواں تھے مومن علی۔ کوئی انھیں برا نہ کہتا۔ ان کی ذات سے کسی کو خطرہ نہ تھا۔ گیندا خالہ گالیوں پر اتر آتیں تو وہ بڑی مہین آواز سے گاتے چلے جاتے۔

"اوئی کیسا میرا ایرنگ چمکتا وہ بھی آدھی رات کو۔"

مومن علی کے ایرنگ آدھی رات کو چمکتے نہ چمکتے، مگر گیندا خالہ کے آنسو ضرور راتوں میں ستاروں کی مانند چمکا کرتے۔

بڑے چچا میاں صبح کی نمازوں سے غائب رہنے لگے تو سلیم میاں یا چھوٹے جانی کو یہ کہنے تک کی ہمت نہ پڑی کہ "چچا میاں گرمی کے ہی دن تو ہیں، پانی ایسا ٹھنڈا ابھی نہیں ہے۔ آخر آپ نمازیں قضا کرنے پر کیوں تل گئے ہیں۔؟"

لڑکیوں کی پوری پلٹن بھی اگر مغرب کی نماز کے وقت غائب رہتی تو چچا میاں نہ پوچھتے کہ "زہرہ کدھر چلی گئی؟ نور بی نے آج نماز کیوں نہیں پڑھی؟ میرا قرآن شریف محراب میں ہے۔ نادرہ بی بی اٹھا تو لاؤ ذرا۔"

شاکرہ بیگم بغیر کسی ڈر کے نو بجے تک دروازہ بند کر کے سوتی پڑی رہتیں۔

زہرہ بیگم تو خود ہی زچہ خانہ میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے چالیس دن پورے ہونے میں ابھی بڑا وقفہ تھا۔ زچہ خانے میں نہ ہوتیں تب بھی بڑے چچا میاں اُن سے کچھ نہ پوچھتے۔

نادرہ بیگم نے تو سفید بالوں کی لٹ دکھا کر ماں باپ کو بے فکرا کر دیا تھا۔ مگر صابرہ اور ہمیرہ دن بھر کدکڑے لگاتیں اور شاہجہاں بیگم کا دل دہلا دیا کرتیں۔ نادرہ میں تو اب ایسا سنجیدہ پن آگیا تھا کہ بوڑھوں کی طرح صابرہ اور ہمیرہ کے لتے لیتی۔

ایک دن ہمیرا اسکول سے لوٹی تو نواب صاحب دیوان خانے میں ہی بیٹھے تھے۔ قدموں کی چاپ سن کر سر اٹھا کر ہمیرا کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے وہ گھبرا اٹھے۔ اب تک وہ ہمیرا کو ایک ننھی گڑیا سمجھتے آتے تھے۔ مگر آج انھیں اپنا یہ خیال اک دم بدل دینا پڑا۔ کتابیں سنبھالتی۔ جھومتی گنگناتی وہ اندر چلی گئی۔ تو نواب حیدر اپنی بیگم سے بول اٹھے۔ "بیگم یہ ہمیرہ اتنی بڑی کب سے ہوگئی۔"

شاہجہاں بیگم چڑ گئیں۔ "دیوانے ہو۔ چڑھتی بیل ہے۔ کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔

نظر کیوں لگاتے ہو۔؟"

" بیگم۔" نواب حیدر بے بسی سے بولے۔" دادا ابا کہتے تھے کہ جوان بیٹی کو بٹھا رکھنا اور مردے کو نہ دفن کرنا ایک ہی بات ہے۔"

بیگم نواب حیدر کا منہ تکتی رہیں۔

" میں سمجھتا تھا کہ میرے گھر میں دو جنازے ہیں۔ مگر آج معلوم ہوا کہ مجھے تین مردے گاڑنے ہیں۔ بیگم۔ تین جنازے! اب تک تو دو ہی تھے۔ مگر یہ تیسرا......"

" کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیسے جنازے؟ کس کی میتیں؟ کیا بک رہے ہو؟"

" نہیں سمجھتیں۔؟ ارے بیگم ہمیرہ ہے تیسرا جنازہ۔ بیگم، نادرہ۔ صابرہ ہمیرہ بیلیاں نہیں ہیں اپنی، یہ لاشیں ہیں تین! یہ تین جنازے ہیں!" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگے۔" دیکھو یہ تیسرا جنازہ چلا آ رہا ہے۔" بیگم نے گھبرا کر سر اٹھایا تو ہمیرہ جھومتی جھامتی چلی آ رہی تھی۔

وہ سر پکڑ کر رہ گئیں۔

معلوم نہیں کس وضع کا اسکول تھا صابرہ بیگم کا۔ آئے دن جلسے، پارٹیاں ہوتیں۔ رات بے رات لوٹنا ان کا معمول تھا۔ ڈیوڑھی کی حالت کسی سے چھپی ڈھکی تو تھی نہیں۔ مگر صابرہ بیگم کا یہ معمول تھا کہ ایک سے ایک بڑھیا ساڑی پہن کر اسکول جاتیں۔ چھوٹے ماموں تڑپ تڑپ کر آپا جان کو سمجھاتے۔

" دیکھو آپا جان اتنی ڈھیل نہ چھوڑو۔ کسی نے پیچ ڈال دیا تو تاگا لپیٹنا بھی نہ سوجھے گا جلدی میں۔"

گیند اخالہ کا پیٹ چھ آنے میں ملنے والے مٹکے اتنا بڑا ہو گیا۔ مگر کسی نے یہ تک پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ " اے بی! یہ کس کا تحفہ ہے۔؟"

اتنی بڑی ڈیوڑھی، ہزاروں کا آنا جانا۔ مالی، تنبولی، حلالی حرامی۔ کسی کو تو روک ٹوک نہ تھی۔ پھر کس کا سر پھرا تھا جو پوچھ تاچھ کرتا۔؟"

مگر بڑے چچا کی ساری بذلہ سنجی اور خوش مزاجی رخصت ہوگئی۔ گیندا خالہ نے ہاتھ اٹھا کر جو کوسنے ان کی بیٹیوں کو دیئے تھے وہ بھلانے کی چیز تھے۔؟ نادرہ بیگم بوڑھی ہو رہی تھیں۔ صابرہ بیگم پر پرزے نکال رہی تھیں۔ ہمیرہ کدکڑے لگاتی اور پکے آم کی طرح شاخ سے ٹپکنے کو ہو رہی تھی۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو! انھیں بار بار یہ خیال آتا کہ یہ ساری گیندا کی ہائے پڑی ہے ان پر۔ اس کی آہیں جھلسا کر نہ رکھ دیں سارے گھرانے کو۔!

گیندا خالہ نے کوسنے دینے بند نہیں کئے تھے۔ "نوکر خانے" میں وہی دھما چوکڑی مچتی، وہی ہنگامے برپا رہتے۔ مومن علی اب بھی لہک لہک مٹک مٹک کر گاتے۔

"موٹر کی پوں پوں بری جی"۔ سیّاں بین بس کو ڈری جی

زہرہ زچہ خانے میں تھیں اور ان کے میاں کے کھانے پینے کی بڑی خرابی ہو رہی تھی۔ صابرہ بیگم نے بڑی فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔ اور کہاں تو صابرہ بیگم نے باورچی خانے میں جھانک کر بھی نہ دیکھا ہوگا اور اب تو اسکول سے بچا ہوا سارا وقت باورچی خانے میں گیندا خالہ کی صحبت میں ہی گزرتا۔ اگر بیگم کو پتہ چل جاتا کہ صاحبزادی گیندا خالہ سے کھانا پکانا سیکھ رہی ہیں تو گھر سر پہ اٹھا لیتیں۔ بی مغلانی تو ابھی زندہ تھیں۔ ڈیوڑھی کی اور ساری لڑکیوں کو کھانا پکانا اور کس نے سکھایا تھا؟ مگر جو کچھ بھی ہو، گیندا خالہ تھیں بڑی صاف دل۔ "نہیں" کہنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ چاہے وہ "گڑ چنے" مانگے جانے کی بات ہو یا پھر "چپی کرنے" کی بات ہو۔ عیاری مکاری سے کہو یا بھولپن سے، ان کی عادت ہی نہ تھی کہ کسی کام کو

"نہیں" کہیں۔

زہرہ بیگم زچہ خانہ میں تھیں۔ چھوٹے جانی کو روزانہ سر میں چمپی کروانے کی عادت تھی۔ صابرہ بیگم روزانہ کٹوری بھر تیل لے کر جاتیں اور دروازے بند کرکے گھنٹوں "مالش" ہوتی۔ چھوٹے جانی ان دنوں بڑے خوش تھے۔ زہرہ بیگم کے پاس دو چار منٹ بیٹھتے، اوپری دل سے ننھے بچے کو پیار کرتے پھر اچانک سر پکڑ کر بلبلا اٹھتے۔ "افوہ! تمہاری زچگی کیں وجہ میری مالشی کاں بڑاں خراباں ہوں رہاں ہے" (تمہاری زچگی کی وجہ سے میری مالش کا بڑا خراب ہو رہا ہے) زہرہ بیگم اپنے ناک میں بولنے والے شوہر کے لئے جی کڑھاتیں تو صابرہ بیگم غصہ دکھاتیں۔ "زہرہ آپا! مجھے اتنا غیر کیوں سمجھتی ہو۔؟ کیا میں مالش کرنے سے بھی گئی گزری ہو گئی۔؟"

کہتے ہیں گیندا خالہ بڑی اچھی چمپی کرتی تھیں۔ نواب حیدر کے سر میں۔ ایک بار انھوں نے اتنی اچھی چمپی کی تھی کہ انہوں نے خوش ہو کر سب کے سامنے ہی اک دم ان کا سنہری سنہری منہ چوم لیا تھا۔ جو شرم سے بالکل ہی تپ گیا تھا اور گیندا خالہ پوری شعلہ بن گئی تھیں۔ مگر بڑے چچا میاں سے اس حرکت کا سرزد ہو جانا کوئی قابل گرفت بات نہ تھی۔ وہ تو تھے ہی ہنسوڑ اور ٹھٹھے باز۔ صابرہ بیگم کو چمپی کرنا بھی انھی نے تو سکھایا تھا۔ اور کھانا پکانا بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ گیندا خالہ نے "نہیں" کہنا تو جانا ہی نہ تھا۔

جس دن گیندا خالہ کے بیٹے نے جنم لیا، اس دن چھوٹے ماموں اپنی اچکن کے بٹن کھولتے بند کرتے، بے چین بے چین شاہجہاں بیگم کے پاس آئے۔

"آپا جان! اب بولو! کہاں منہ چھپاؤ گی۔؟ ساری ڈیوڑھی میں بوم ہو گئی ہے اور اب پورے خاندان میں ہو جائے گی۔ ہے ہے، کیا زمانہ آگیا ہے بہو بی۔!

یہ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی مرجاتیں تو کیا اچھا تھا۔"

"اوئی، دیوانے ہوئے ہو! موئی ماما لونڈیوں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ حرام کے بچے وہ جنیں، وہ کم! کسی دھگڑے کے ساتھ نکل بھاگیں، وہ کم! ہم تم کیوں جان کڑھائیں۔؟"

چھوٹے ماموں نے سر پیٹ لیا۔ "ارے آپا جان، ماما لونڈیوں کو میں نہیں کہہ رہا۔ ارے تمہاری صابرہ نے ناک کاٹ دی پورے خاندان کی۔ سات پشتوں کے منہ پر کالک تھوپ دی نابکار نے۔"

شاہجہاں بیگم بیٹھے بیٹھے لڑھک پڑیں۔ "کیا کیا صابرہ نے۔؟"

چھوٹے ماموں نے وحشت میں اچکن کے سارے بٹن کھول دیئے۔ پھر جلدی جلدی بند کرتے ہوئے بولے۔

"آپا جان کیا بولوں۔؟ باؤلی میں ڈوب مرنے کی بات ہے۔"

سارے ہنگاموں سے دور "نوکر خانے" میں پڑی گیندا خالہ یکساں سلسے جا رہی تھی۔ زچگی کے درد ابھی بند نہیں ہوئے تھے، مگر وہ گا رہی تھیں۔

"سیاں نے دل لے گئے لال بٹوے میں۔"

صابرہ بیگم کا دل بھی آج سیاں لال لال بٹوے میں لے کر چلے گئے تھے۔

صابرہ بیگم لاکھ گئی گزری تھیں، تھیں تو شاہجہاں بیگم کی اولاد۔ جب تک کہ پورے خانداں میں بوم ہوتی انہوں نے باؤلی میں گر کر اپنے آپ کو دنیا والوں کے طعنوں تشنوں سے محفوظ کر لیا۔

کہتے ہیں شاہجہاں بیگم نے صابرہ بیگم کی پیدائش پر بھی اتنی خوشی نہ منائی تھی جتنی کہ ان کی موت پر منائی۔ ڈیوڑھی والے تو یونہی پکے پیٹ کے تھے۔ کوئی بات نہ پھوٹی۔

مگر سننے والوں نے یہ بھی سنا کہ شاہجہاں بیگم نے اندرونی طور پر مٹھائی بھی بانٹی کہ ایسی اولاد کا مٹ جانا ہی اصل خوشی ہے۔

چھوٹے جانی نے تکیہ میں سر چھپا کر خوب آنسو بہائے، مگر سب سے چھپ کر ویسے اتنے بڑے بھرے گھر میں لے دے کے حیدر نواب ہی ایسے تھے جن کی آنکھیں اپنی بیٹی کی موت پر نم ہوئی تھیں۔ وہ کیوں روتے تھے۔؟ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ گیندا کا چھوٹا سا بیٹا اس کی چھاتی سے چمٹا رہتا۔ آنے جانیوالے اُسے چھاتیاں چچوڑتے دیکھتے مگر کسی نے بھول کر بھی نہ کہا۔" اوئی گیندا خالہ! تمہارے چھوکرے کی شکل تو بالکل بڑے چچا میاں جیسی ہے۔" مگر چچا میاں کو گیندا کے بیٹے کی آنکھوں میں اپنی ہی صورت نظر آتی۔ انھیں لگتا کہ گیندا نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ فرق ہی کیا پڑا؟۔ باپ بدنام نہ ہوا بیٹی بدنام ہوگئی۔ اور بدنام بھی کیسی کہ جان ہی سے چلی گئی بیچاری۔

صابرہ تو اپنی جان سے گئیں مگر ہمیرہ کے لیئے کانٹے بو کر۔ نادرہ بیگم نواب کسی شمار ہی میں نہ تھیں۔ لے دے کے بس ساری فکر بس ہمیرہ بیگم کے لیئے تھی۔ مگر صابرہ بیگم نے جو کالک تھوپ دی تھی وہ اتنی گہری تھی کہ چھٹائے نہ چھٹتی نواب حیدر باؤلے کتے جیسے ہوگئے۔ شاہجہاں بیگم ہمیشہ اپنے سہاگ کی خیر مناتیں۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر ظہیر کا پیغام آیا تو کسی کو انکار کرتے نہ بنی۔ یوں بھی انکار کرنے کی وجہ کیا ہوسکتی تھی۔؟ کھاتا کماتا آدمی تھا۔ دیکھنے میں بھی اچھا تھا۔ عمر بھی خاصی تھی۔ مگر لڑکی قبولنے کے بعد بھی نواب حیدر پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے رہتے۔ ان کے ہونٹ کچھ اس انداز سے کانپتے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہنے کی ہمت نہیں پاتے لڑکے والوں نے اتنا کچھ مانگا تھا کہ نواب صاحب کی کمر توڑ دینے کے لیے بہت کافی تھا۔ شاہجہاں بیگم نے دبی زبان سے احتجاج بھی کیا۔ مگر زبان تو دی جا چکی تھی۔

ڈھول بجے آتشبازیاں چھوٹیں اور نواب حیدر کی اولاد میں سے ہمیرہ پہلی لڑکی تھی جو دلہن بنی۔ برات آئی بھی۔ گئی بھی۔ مہمانوں میں بیٹھے بھی۔ گپ شپ بھی ہوئی مگر نواب حیدر ایسے بجھے بجھے اور اداس اداس تھے جیسے شادی کا انتظام نہ کر رہے ہوں۔ کسی میت کی تیاری کر رہے ہوں۔!

دوسرے دن ہمیرہ واپس آئی تو تمام لڑکیوں بالیوں نے اسے گھیر لیا۔ بڑی بوڑھیاں بھی پہنچ گئیں۔ گو زبان سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر تاڑنے والی آنکھوں نے تاڑ لیا کہ بڑا بھاری دھوکا ہوا ہے۔ ہمیرہ بیگم کے گالوں پر افشاں ابھی تک جوں کی توں چپکی ہوئی تھی۔ مسی کی دھڑی ذرا بھی تو پھیکی نہ پڑی تھی۔ اور پھول مرجھائے ضرور تھے مگر مسلے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے۔

شاہجہاں نے سر پیٹ لیا۔ نواب حیدر کے سامنے منہ ڈھانپ دہ بین کرنے لگیں۔ ”ہائے میں نے اپنی ایک بھی بیٹی کا سکھ نہ دیکھا۔ جیسی گئی تھی ویسی ہی آ گئی میری بیٹی۔ افشاں جوں کی توں جمی ہوئی ہے۔ مسی کی دھڑی کیسی تازی ہے جیسے ابھی لگائی ہے۔ ہائے تم نے پہلے ہی کیوں نہ پتہ چلا لیا؟ میرے مولی میری بیٹی۔ میں پوچھتی ہوں۔“

نواب حیدر نے بات کاٹ دی ان کی۔ ”مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا“

”تمہیں پہلے ہی معلوم تھا“ شاہجہاں بیگم رونا دھونا بھول گئیں چیخ کر بولیں۔ ”تمہیں پہلے ہی معلوم تھا۔ اور پھر بھی اپنی بیٹی کو کنوئیں میں لوٹ دیا۔؟“

نواب حیدر بے بسی سے بولے۔ ”بیگم لاش سڑ جائے تو اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیرہ لاش تھی وہ سڑنے کو تھی۔ میں نے آج بڑے فرض سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ میں نے آج تیسرا جنازہ بھی اٹھا دیا۔ اب میں بڑا مطمئن

ہوں۔" انھوں نے اپنا سر ہاتھوں سے جکڑ لیا۔

دوسرے کمرے میں ہمیرہ گم سم بیٹھی تھی۔ لڑکیاں بالیاں حقیقت حال سے بے خبر اسے چھیڑے جا رہی تھیں اور ان ہنگاموں سے دور "نوکر خانے" میں مومن علی مٹک مٹک کر، ہاتھ نچا نچا کر گا رہے تھے۔ اور گیندا خالہ ہنسی سے دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔

"سیاں مورا 'بھولا'، نہ جانے موری بتیاں
نیناں موری بند پر، جاگوں ساری رتیاں
آکے مورے گھونگھٹ کو کھولا ہی نہیں
گورے گورے گالوں کو چوما ہی نہیں
سیاں مورا بھولا......"

دلِ داغ داغ

رفیعہ باہر سے بھاگتی ہوئی آئی اور ضمیر میاں کے کندھے کو ہلا ہلا کر بولنے لگی۔

" ابا۔ ابا۔ کو۔ کوک۔" پھولی ہوئی سانس۔ گھبراہٹ اور خوشی' الفاظ منہ سے نکلنے نہ دیتی تھی۔

ضمیر میاں کتاب میں ایسے مشغول تھے کہ بیٹی کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ رفیعہ ایسی بے قراری سے ان کے کندھے جھنجھوڑ رہی تھی۔

" اباجی ___ ابا ___ کوک ___ کوک۔"

ضمیر میاں نے اب کتاب کو دور پٹخا اور تیز تیز بولنے لگے "کیا کوک کوک لگا رکھی ہے ہکلی کدھر کی۔ بولتی کیوں نہیں بات کیا ہے۔؟"

" وہ باہر ___ باہر کوک۔" رفیعہ کی زبان پھر ہکلا گئی۔ ضمیر میاں نے جھلا کر زور سے جوتے گھسیٹے اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتے ہوئے بولے۔

" بتا بھلا، باہر کون سی کوک کوک دھری ہوئی ہے۔"

" باہر بیٹھک میں رسی سے بندھا چھوٹا سا کتے کا پلا تھا۔ سفید رنگ جس پر خاکستری دھبے' جسم بالوں سے بھرا ہوا۔ لمبے کان اور چھوٹی سی دم، جسے وہ مورچھل کی طرح بار بار ہلائے جاتا تھا۔

اب رفیعہ نے بڑی خوشی سے ہکلائے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا اور ہنس کر بولی۔

" کتا۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ کتا ہے۔ پھر۔؟"
رفیعہ نے بجھی بجھی آنکھوں سے باپ کو دیکھا۔ کیسے باپ ہیں۔؟ ذرا بھی خوش نہیں ہو رہے! جھلا کر بولی۔

"تو میں بھی تو دیکھ رہی ہوں۔!"

"پھر اس میں بد حواسی کی کیا ضرورت ہے۔؟ سانس پھولی جا رہی ہے۔ بال بکھر گئے ہیں۔ زبان ہکلا رہی ہے۔ منہ پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے ہیں۔ اتنی ساری گڑبڑ بس اسی لیے۔؟ ہونہہ!" انھوں نے بے مطلب نظروں سے کتے کے پلے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

"میں اسے پالوں گی۔"

"ہائیں!" عین ضمیر میاں کے کانوں میں بم گرا۔ "کتا پالے گی؟ ارے تو یہ پلہ پالے گی۔؟"

"پھر اور کیا کہہ رہی ہوں تو۔" رفیعہ تنک کر بولی۔
ضمیر میاں نے گڑبڑا کر بیٹی کو دیکھا۔ کیسی بیٹی ہے۔

"لاحول ولا۔ کتا۔ ہونہہ کتا۔ توبہ۔ کتا۔"
رفیعہ نے پھر تنک کر ان کی اور دیکھا۔ پھر مسکرانے لگی۔

"واقعی کتا۔ اہا کتا۔ سچ مچ کتا۔ اتنا پیارا کتا۔"
ضمیر میاں نے جھنجھلا کر دیکھا۔ یہ تو عین مین ان کے لہجہ کی نقل کر رہی تھی۔

"دیکھو بی بی۔" وہ انگلی تنبیہہ کے طور پر اٹھا کر بولے۔

"کتا پالنا اچھا نہ ہوگا۔"

"مگر کیوں۔؟" وہ اسی روکھے پن سے بولی۔

" بھئی بات یہ ہے کہ گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔" وہ سمجھاتے ہوئے بولے۔
اس نے جھٹ سے ایک شرط پیش کردی۔" دیکھئے ابا میاں جب رحمت کے فرشتے اترنے بند ہو جائیں گے تو میں کتا پھنکوا دوں گی۔"

" لاحول ولا۔ یوں بات کے پیچھے پڑجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے کتا پالنے کو۔"

" اللہ تعالیٰ نے تو سنیما دیکھنے کو بھی منع کیا ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
واہ بھئی! کیسی بٹیا تھی یہ؟ صفا باپ کی عادتوں پر روک ٹوک کرنے والی۔
جھلا کر بولے۔" وہ تو دوست لے کر چلے جاتے ہیں۔"
بیٹی مسکینی سے بولی۔" تو یہ تو بیٹی پال رہی ہے جس کا گناہ اس کے ہی سر۔"
بیٹیوں کا اتنا لاڈ ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے جھلا کر سوچا۔
اب کے سے انہوں نے بہت پیار سے سمجھایا۔ بٹیا بات یہ ہے کہ کتا بے حد نجس جانور ہے۔ بہت ناپاک۔ جس چیز میں منہ ڈال دے وہ پھنکوانی پڑتی ہے جس جگہ بیٹھ جائے وہ ہمارے تمہارے بیٹھنے کے لائق نہیں رہ جاتی، اور کبھی....."
" مگر ابا میاں ہم تو اسے الگ رکھیں گے بھئی۔" وہ زچ آچکی تھی۔" قسم اللہ کی آپ کے برے بھلے میں ہرگز نہیں پڑے گا ہمارا کتا۔
سارے حربے آزمائے جا چکے تھے۔ ہر چال پٹ پٹ جاتی تھی۔ ایک دم ان کے منہ پر چاند سا چمک گیا۔

" بھئی رفو بیٹی تم اپنی نانی اماں سے پوچھ لو، وہی گھر کی بڑی ہیں۔"
" نانی اماں سے پوچھوں گی تو وہ کہیں گی! بیٹی، گھر کی کرتا دھرتا تو تمہاری ماں ہیں۔ ان سے پوچھو، ان سے پوچھوں گی تو کہیں گی " اپنے ابا سے پوچھو، ابا سے....

یوں تو مجھے گھر کی مرغیوں اور ماسیوں تک سے اجازت لینی پڑے گی۔ جائیے میں نہیں پالتی والتی کتا۔"

بات تو اتنی آسانی سے، بڑے مزے سے ختم ہو گئی۔ ضمیر میاں کا دل مطمئن ہو گیا۔

دو چار دن یونہی گزر گئے تو ایک دن ضمیر میاں کو اچانک احساس ہوا کہ رفیعہ کا منہ سوکھا سوکھا رہا ہے، چہرے پر وہ شادابی نہیں، آنکھیں مسکراتی نہیں۔ ہونٹ ہنستے نہیں اور گھر پر عجیب سا سناٹا ہے۔

انہوں نے بی بی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے جی رفیعہ ایسی چپ چاپ دکھائی پڑ رہی ہے۔"

"جانے نیک بخت کو کیا ہو گیا ہے۔ بس منہ میں مونگ بھرے رہتی ہے۔ نہ کھائے نہ پیئے۔ دستر خوان پر بیٹھ کر بھی یونہی اٹھ جاتی ہے۔ پوچھوں تو بس یہی کہتی ہے۔ بھوک نہیں۔"

"ہوں۔" ضمیر میاں خاموش رہ گئے۔ بچے ضد کرتے ہیں اور بہل بھی جاتے ہیں۔ مگر رفیعہ بی تو ایسی بچہ بھتیں کہ بہلائے نہ بہلیں۔ نامراد کتے کے پلے کے پیچھے کھانا پینا، ہنسنا بولنا۔ سبھی کچھ چھوٹ گیا۔ انسان کھائے تو دم رہے۔ اور دم رہے تو ہنسے بولے۔ چلے پھرے۔ کھانا پینا ہی چھوٹ گیا تو کہاں کی طاقت، اپنے بستر پر پڑی رہتی۔

اس دن کھانا ختم ہو گیا تو دستر خوان پر بیٹھے بیٹھے ضمیر میاں بولے۔

"اجی سنتی ہو بٹیا کی یہ درگت کاہے سے ہے۔"

"کاہے سے۔؟" انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

"کہتی ہیں کتا پالوں گی۔"

اماں سے زیادہ زور سے نانی اماں چیخیں۔ "اوئی کتا۔!" اور انہوں نے لعنت ملامت شروع کر دی۔

"تو یہ کہیں مسلمانوں کے گھروں میں کتے پالے جاتے ہیں۔؟"

"مگر اب پالنا پڑے گا۔" داماد غصہ سے بولے۔

"کیوں بھلا۔؟" ساس چیخیں۔

"پھر وہی کیوں۔؟" داماد چلائے۔ "آپ اس نامراد کی حالت تو دیکھئے۔ کتا نہ پالیں گے بیٹی جان سے جائے گی۔"

تینوں خاموش رہ گئے۔ بیٹی نے ماں کی طرف دیکھا، ساس نے داماد کی طرف، اور داماد نے بیوی اور ساس کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ جیسے۔

"اب کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

"دو چار مہینے میں بٹیا رانی تیرہویں میں قدم دھرنے والی ہیں۔ جوان بیٹی کا یوں لاڈ کریں گے۔ من مانی کرنے دیں گے تو یہ بھی نہ بھولئے کہ چار دن کو سسرال بھجوانا ہے۔ وہاں کون ایسے ناز اٹھائے گا۔؟" اور اماں نے غصے سے منہ پھیر لیا۔

"تو میں نے کب بڑی ہنسی خوشی سے اجازت دی ہے۔ کم بخت کو مرجانے دو۔"

اب باپ کے تند لہجہ میں بیٹی کے لئے پیار پھٹ پڑا تھا۔

"جب دیکھو تب تیرہ برس کے طعنے، جب دیکھو تب جوانی کا ذکر۔ ایسی کون دیواریں پھلانگ رہی ہے وہ۔؟"

ساس نے حیرت سے داماد کی طرف دیکھا۔ کیسے باپ ہیں۔؟ اپنے سامنے کسی کی چلنے ہی نہیں دیتے۔ ہونہہ۔! ———

رفیعہ کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور منہ تمتا رہا تھا۔

"ارے ارے، ایسے نہیں۔ یوں نہیں۔ ادھر۔ ہاں ادھر۔"

ڈبو مالکہ کے اشارے پر دوڑا اور دوڑ کر گیند اٹھا لایا۔

"شاباش۔" اس نے بے خیالی میں اپنے ہاتھ سے اس کی پیٹھ ٹھونک ڈالی اور پھر گھبرا کر بیٹھک کی طرف دیکھا۔ "ابا تو نہیں دیکھ رہے کہیں۔"

دبے دبے قدموں سے چلتی اندر گئی تو دیکھتے ہی نانی اماں نے پھٹکار بتائی۔

"ہاتھ دھوئے ری تونے۔"

"ہاتھ۔؟" وہ بیزاری سے بولی۔ "ہاتھوں کو کیا ہوا۔؟"

"دن بھر تو موئے اس کتے کے پلے کے ساتھ کدکڑے لگتے ہیں۔ گلے چھاتی لگایا جاتا ہے اور پھر کیا ننھی بن کر پوچھتی ہے ہاتھوں کو کیا ہوا۔؟"

رفیعہ نے شرارت سے نانی اماں کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی۔

"نانی اماں آپ نے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں ورنہ سچ مچ آپ بھی اسے ایک لمحہ کو نہ چھوڑتیں۔"

"اے نوج۔ جھاڑو پھرے ماٹی ملے کی صورت پر۔ میں تو ادھر پھٹکوں بھی ناں۔ تو ہی اس پر سے واری صدقے جا۔"

"مجھے تو سچ نانی اماں بڑا لاڈ آتا ہے۔"

"ہاں ہاں تیری اولاد ہی تو ہے وہ۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"اولاد۔؟" رفیعہ تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچتی ہی رہ گئی، پھر ہنس کر بولی۔

"ایک بات بولوں؟ مگر پھر آپ کہنے لگیں گی کہ زبان دراز چھوکری ہے۔"

"ہاں ہاں بول دے نا۔ دل کی دل میں کیوں رہے۔؟"

رفیعہ ہنسنے لگی۔ "جانے دیجئے، امی کی ڈانٹ پڑے گی۔"

"اے ہے ایسا ہی تجھے بڑا امی کی ڈانٹ کا خیال ہے نا۔ باوا اماں کو تو انگلیوں پہ نچاتی ہے، ہونہہ!" اور انھوں نے پیار کے ساتھ پاس بیٹھی بلی کو اٹھا کر گود میں بھر لیا۔

"کیوں جی نانی اماں، میرے کتے پر اتنی لعنت ملامت اور جو یہ مہارانی سدا آپ لوگوں کی گود میں چڑھی رہتی ہیں۔ پھر۔؟"

"اری کافر زبان کو ذرا سنبھالا بھی کر معلوم ہے آنحضرتؐ کے پاس بھی بلیاں تھیں اور حضور بلیوں کو اتنا پیار کرتے تھے۔ یہ تو سنت ہے۔"

"بس جس طرح آپ کو اپنی بلی سے پیار ہے ایسے ہی ہمیں۔۔۔۔۔"

ابھی رفیعہ کی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ نانی اماں 'ارے رے رے' کر کے زور سے چیخیں۔ ابھی رفیعہ ان کے بے تحاشا چلانے کا مطلب بھی نہ سمجھ پائی تھی کہ انہوں نے دروازے کے ٹکاؤ کا پتھر اٹھایا اور تڑ سے آنگن میں اچھال دیا۔ "کم بخت گھر میں گھس آیا۔ رفیعہ نے ہڑبڑا کر پیچھے دیکھا۔ ڈبو آنگن میں گھوم رہا تھا کہ پتھر اس کی پچھلی ٹانگ میں جا لگا اور وہ زور زور سے پیاؤں پیاؤں کرتا باہر کو بھاگ گیا۔

تیر کی سی تیزی سے رفیعہ بھی اٹھ کر بھاگی۔ آنگن میں اس کے پیچھے اس کے جوان قدموں کی دھپ دھپ اور ہلکا سنہرا آنچل لہراتا رہ گیا۔ نانی اماں نے بڑی تشویش سے باورچی خانے میں بیٹھی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"جوانی گھر ڈھونڈھ رہی ہے اور بیٹی کے لچھن دیکھو! اس عمر میں کوئی یوں دھپا دھپ بھاگتا ہے۔؟"

بیٹی نے سر جھکا لیا۔ "میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔؟ وہ تو بھلی خاصی دیوانی بنکر رہ گئی ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں رفیعہ باہر سے لپکی ہوئی آئی۔ اس کے چہرے پر ناگواری اور غم کی چھاپ تھی۔ اب قدم ہلکے پڑ رہے تھے۔ اور وہ انگلی پر دوپٹہ مروڑتی باورچی خانے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

"امی! زخم لگ جائے تو کیا لگاتے ہیں۔؟" اس نے کن انکھیوں سے نانی اماں کو گھورا۔

"کیوں کیا ہوا۔؟" اماں نے تشویش سے پوچھا۔

"ڈبو کی ٹنگڑی پر زخم لگ گیا ہے۔"

"ہے ہے کاہے سے۔؟" ان کے لہجہ سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ آخر بیٹی کا درد اپنا ہی تو ہوتا ہے۔

"نانی اماں نے پتھر پھینکا جو اسے لنگڑا کرتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا خون بہہ رہا ہے۔" رفیعہ ہلدی تھوپ کر آئی تو اس کی آنکھیں نم نم سی تھیں۔

ادھر کتا، ادھر رفیعہ۔ وہ تو زخم کی تکلیف سے پیں پیں کرتا اور یہ ان زخموں کے درد سے چور تھی۔ اتنا ذرا سا تو تھا ڈبو، اس پر ایسا کاری زخم! رفو بی کا سارا کھلایا پلایا انگ سے جھڑ گیا۔ ایسا سوکھا مارا گلی کا کتا بن گیا۔ یہ تو امی بھی دیکھتی تھیں اور نانی بھی کہ رات بے رات جب باہر سے پیں پیں کی آواز آتی تو اندھیرے میں پلنگ چرچراتا اور دروازہ کو دھیرے سے اپنے پیچھے بند کرتا۔ ایک سایہ باہر نکل جاتا۔ باہر سائیں سائیں کرتی رات سرد ہوتی اور کبھی کبھار چھینٹے گرائے جاتی، مگر رفیعہ کا پلنگ خالی ہی ہوتا۔ اور جب کتے کی پیں پیں بند ہو جاتی تو وہ سر پر دوپٹہ لپیٹے دھیرے سے آتی اور بستر پر پڑ جاتی۔

کئی دنوں بعد طاہرہ بیگم، ضمیر میاں سے مخاطب ہوئیں۔

"بٹیا کے رنگ دیکھتے ہیں نا آپ۔!" مگر اب کے سے ان کے لہجہ میں غصہ نہیں پیار تھا۔

"کیا ہوا۔؟"

"دیکھتے نہیں آپ، زرد موئی ترائی کا پھول ہوئی جا رہی ہے۔"

"امی ہنس پڑیں۔" اماں نے کہیں پتھر مار دیا۔ پتھر تو اس کے لگا اور زخم اللہ کے لگ گیا جبھی دن سے وہ بلبلا بیمار پڑا ہے اس کا کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔"

"جہیز میں ڈھیر سارے کتے ہی دے دینا میاں تم۔" نانی اماں نے اپنا غبار نکالا۔

"اچھا ہے جی بہلا رہے گا۔"

امی ہنسیں۔ "اے سچ یہ نامراد اس کو اتنا پیار کرتی ہے تو کیا سسرال بھی ساتھ ہی لے جائے گی؟" "اے تو ہوا کیا۔؟ بلا سے نوکرانی نہ سہی کتا ہی سہی۔ وہ کام بھی تو خوب کرتا ہے نا۔ صابن دانی اٹھا کر وہ لائے۔ گیندیں وہ لپک لائے۔ قندیل اٹھا کر وہ چلے۔ بھلی خاصی نائکہ ہے تو پھر نوکرانی کا کیا کام۔؟"

ضمیر میاں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ "اچھا یہ ڈبو اتنا سدھایا گیا ہے!!" ان کی حیرت میں ناگواری کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

یہاں تو سارے کا سارا آوا ہی اوندھا تھا۔ ساس نے چڑ کر داماد کی طرف دیکھا۔

"میاں اس میں حیرت کی کون بات ہے۔؟ جیسا سکھایا ویسا ہی سیکھ گیا۔"

رفیعہ نے دور بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں ابا دونوں بھی اب رضامند ہو گئے تھے۔ اس کا دل کھل اٹھا۔ "اب تو ڈبو جو دل چاہے سو کرے۔ ہائے!" اس کا چہرہ چمک گیا۔

جس دن ڈبو کا زخم بھرا ضمیر میاں نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ گھیرے تھے۔ چہرے پر زردی اور گال دبے دبے سے تھے، مگر اب اس کے چہرے پر خوشی کی ہنسی بکھری جا رہی تھی۔

"یہ کتے کے پلے کے لئے اتنی جان جلاتی رہی ہے۔"

اس دن وہ حیرت سے اپنی بی بی سے بولے۔

"عورت خواہ کسی کی محبت ہو۔ بس باؤلی بن کر رہ جاتی ہے۔"

بی بی نے ذرا اچنبھے سے ان کی صورت دیکھی۔

"دیکھو تو رفیعہ کا رنگ، کتے کے پلے کے لئے کیسی باؤلی سی ہو کر رہ گئی۔"

کتے کے بنا اس کا دل ہی نہیں لگتا جیسے۔"

"انسان تو انسان ہے، مگر جانور بھی کم نہیں ہوتا۔ اس کتے کا حشر بھی آپ نے دیکھا؟ رفیعہ کا دیوانہ ہے۔ کتا تو یوں ہی وفادار اور محبت والا ہوتا ہے۔ پھر یہ ڈبو تو زیادہ ہی دیوانہ ہے۔ اتنا تو وہ بھی دیکھے ہے کہ گھر میں اور کوئی اس کے گن نہیں گاتا۔ بس جو ہے سو رفیعہ۔ ایک آدھ بار رفیعہ کام میں الجھی رہے اور باہر نہ جائے تو بار بار دروازے میں آکر جھانکتا ہے۔

" اور کوئی سنے تو کہے باتیں بنا رہے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے طاہرہ بی بی اس دن رفیعہ کی طبیعت خراب تھی۔ اس نے کھانا نہ کھایا تو ڈبو بھی بھوکا ہی رہا۔"

"بھلا اس نے کیسے سمجھا ہو گا کہ رفیعہ بھوکی ہے۔ کچھ اس کے سامنے تو بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتی۔" وہ حیرت سے بولیں۔

"اب بی بی یہ تو دل کی بات ہے۔ لاکھ جانور ہے اور بے زبان بھی، مگر محبت تو سمجھتا ہے۔ سوچا ہو گا روز تو رفیعہ بار بار اٹھ اٹھ کر جاتی ہے دیکھتی ہے، پانی کے پیالے کی خبر لیتی ہے تو کبھی روٹی لا کر ڈالتی ہے۔ آج نہ گئی تو سمجھ لیا کہ ضرور ایسی ویسی کوئی بات ہے۔ خود بھی بھوکا رہا۔"

تھوڑی دیر ضمیر میاں چپ رہے، پھر بولے۔" اور ایک بات تو بالکل انسانوں کی سی کرتا ہے۔ اسی دن سب کی آنکھ بچا کر رفیعہ کے کمرے میں گھس گیا۔ رفیعہ نے کہیں مذاق سے اسے کہہ دیا۔" تو کھانا نہ کھائے گا تو میں مر جاؤں گی، اور یونہی جھوٹ موٹ بن کر پڑ گئی۔ بی بی اس کی بے قراری تم سے کیا بیان کروں! حیرت اس بات پر ہے کہ اس نے مرنے کا کیا مطلب سمجھا ہو گا؟"

طاہرہ بیگم ذرا آزردگی سے بولیں۔" جانور کی بات ہے نہ انسان کی، سب محبت

کے بھوکے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہی خیال بار بار ستاتا ہے کہ اس کی شادی ہوگی تو ڈبو کا کیا بنے گا۔ ؟"

"ہیں کیا بنے گا سے مطلب۔ ؟ ارے وہ ساتھ جائے گا اور کیا ؟"

"ساتھ جائے گا۔؟" وہ حیرت سے بولیں۔" اور سسرال والے یہ نہ کہیں گے کہ نجس اور منحوس جانور ساتھ کر دیا۔ جانے کیسے لوگ ملیں۔؟ کیا سوچیں۔؟ فرض کرو تنگ خیالات کے ہوئے اور جو کہہ دیا کہ ہم نہ رکھیں تو۔؟"

" تو ادھر وہ ادھر یہ۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

" ہے ہے خدا نہ کرے، کیسی بات منہ سے نکالتے ہیں۔"

" میرے منہ سے نکالنے کا کیا ہے، دیکھ لینا کبھی ایسی جدائی کی نوبت آئی تو الیا ہی ہوگا۔ اس دن ڈبو میاں گھوم گھام کر ذرا دیر سے تشریف لائے تو رفیعہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے غصے سے دیکھ کر بولی۔

" اچھا۔! یہ وقت ہے آنے کا۔؟ اب میں کبھی تو بات نہ کروں۔ وہ بھی سمجھ گیا کہ مالکہ کا مزاج ٹھکانے نہیں ہے۔ لگا خوشامد کرنے۔ پاؤں چاٹے، دم ہلائی۔ آنو بازو گھیرے ڈالے اور قدموں ہی پڑ گیا۔ میں بیٹھک میں بیٹھا سارا تماشہ دیکھتا تھا۔ رفیعہ یونہی غصے میں اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اندر سے بسکٹ کا ٹکڑا پھینکا تو اٹھ کر سونگھا تک نہیں۔ پھر میں نے دوسرا بسکٹ اس کی ناک کے سامنے جا کر رکھ دیا مگر منہ موڑ کر بیٹھ رہا۔ بڑی دیر بعد رفیعہ اندر سے روٹی لئے آئی تو لپکا۔ اور جونہی اس نے روٹی اس کے سامنے ڈالی مزے مزے میں کھانے لگا۔ کھاتا جاتا اور رفیعہ کی صورت کو دیکھتا جاتا۔ ایسی باتوں کی سمجھ اسے کہاں سے آئی۔؟ ادھر رفیعہ بی بی کا یہی حال ہے۔ ادھر ڈبو میاں بھی کچھ کم نہیں۔ رفیعہ سے کبھی زیادتی ہو جائے تو

ہماری تمہاری طرح روٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جنہیں دو گھنٹے کی سہار نہیں، ہوتی وہ عمر بھر کی جدائی کا سہن کیسے کر پائیں گے بھلا۔؟"

"آج کل تو میں بس یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ خدا دونوں میں کبھی جدائی نہ ڈالے۔"

"جدائی پڑے گی ہی کیسے۔؟ ہم لاکھ ماریں باندھیں وہ خود رفیعہ کے پیچھے پیچھے چلا جائے گا۔"

"اس کے جانے کی تو چھوڑو۔ سسرال والوں کا ڈر مجھے کھائے جاتا ہے۔"

اب تک تو یہ تھا کہ رفیعہ کے پیار میں ایک جھجک تھی۔ رکاؤ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اماں ابا اس کے کتے کو اور اس کے پیار کو کچھ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے، اس لئے ڈری سہمی رہتی۔ مگر اب اتنی نا سمجھ تو تھی نہیں۔ بھانپ گئی کہ دونوں نے نہ صرف حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے بلکہ خود بھی کتے کو پیار کرنے لگے ہیں۔ رہیں نانی اماں سو ان کا کیا تھا۔ ہماری کی ڈگڈگی تھیں۔ کوئی سنے نہ سنے ہم بجائے جاتے ہیں اور یوں بھی اولاد اور خصوصیت سے بیٹی اکلوتی ہو تو ماں باپ ہر برائی کو سہار جاتے ہیں۔ بیٹی ٹھیری پرائے گھر کی۔ آج ہے کل چلی۔ اس کا دل دکھائیں تو چین کہاں پائیں؟ اس کا برا کام بھی بھلا اور بھلا تو بھلا ہی بھلا۔

رفیعہ نے ڈبو کو اولاد کا سا پیار دیا۔ وہی کچھ کیا جو مائیں اپنے بچوں کے لئے کرتی ہیں۔ کبھی ڈبو نے یونہی سر نکھرٹیوں سے دبا کر لمبی تان دی تو رفیعہ کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ کبھی وقت پر گھر نہ لوٹا تو جی کلپ کلپ گیا۔ کبھی مقررہ خوراک سے کم کھایا تو دل بیٹھ گیا۔ دن کا کوئی گھنٹہ خالی نہ جاتا ہو گا کہ وہ اس کی خبر لینے باہر والے آنگن میں نہ جاتی ہو۔ کبھی سردی پڑنے لگی تو اندر سے پرانی روئی کا گھڑ لائی اور گدیلا سا بنا کر بچھا دیا۔ کبھی بادل برسے تو چائے پلانا نہ بھولی۔ گرمی ہوئی

تو اس کے نہانے کا خیال کبھی دل سے نہ ہٹتا۔

اور ڈبو نے بھی اس پیار کا جواب پیار سے دینے کی کون کمی کی۔؟

رفیعہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد، لے دے کے گھر میں نانی اور ماں، باپ باہر کے آدمی۔ اتنے بڑے سارے گھر بھر میں دھائیں دھائیں پھرا کرتی۔ اب اس کو ایک ساتھی جیسا مل گیا تھا۔ رفیعہ کا کمرہ باپ کے کمرے سے ملا ہوا تھا ڈبو کو کبھی ادبدا کر مالکن کی یاد ستاتی تو بیٹھک میں کھلنے والے دروازے کی راہ چپکے سے اس کمرے میں آجاتا۔ بیچ کا دروازہ بند ہو جانے سے ماں اور نانی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ادھر کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھار یوں ہوتا کہ رفیعہ اپنے کام میں الجھی ہے اور ڈبو کی خبر لینا بھول گئی۔ ایسے میں ڈبو چپکے سے کھڑکی سے جھانک جاتا اور پھر دروازہ کھلا پاکر اندر گھس آتا۔ کبھی پاؤں چاٹتا، کبھی قدموں میں لوٹیں لگاتا۔ کبھی یوں ہی آنکھوں میں پیار بھرے اسے تکے جاتا یا پھر دم ہلاتا کھڑا رہتا۔

رفیعہ کی طبیعت کبھی خراب ہو جاتی، منہ لپیٹے پڑ جاتی۔ تو ڈبو کا دل اپنے پہلو سے کہیں اڑ جاتا، کھانا پینا اس پر حرام ہو جاتا رفیعہ کھائے تو وہ بھی کھائے، ورنہ کھانا ایسا کون ضروری ہے۔

ایسی باتوں سے رفیعہ کے دل میں ڈبو کی محبت دونی ہو جاتی۔ کبھی کبھار آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ اپنے بے زبان دوست سے کہتی۔

"ڈبو کبھی مجھے تجھے چھوڑ کر جانا پڑا تو میں کیسے زندہ رہوں گی۔؟"

ڈبو زبان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ مگر آنسوؤں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔ ایسے موقعے پر وہ بے کل ہو جاتا۔ بار بار گول گول گھومتا۔ زور زور سے دم ہلاتا اور جب

رفیعہ اس کی بے تابی دیکھ کر ہنس دیتی تو وہ مطمئن ہو جاتا، اس کے قدموں میں لپٹ کر اس کے تلوے چاٹنا شروع کر دیتا۔ اس سے بھی زیادہ بے کل وہ اس وقت ہو جاتا جب کسی بات پر تنک کر رفیعہ بولتی۔

" دیکھو ڈبو تو ایسے ستائے گا تو میں مر جاؤں گی۔ ہاں " اور وہ اپنی گردن جھکا کر، آنکھیں موند کر مرنے کا یوں ڈراوا دیتی کہ ڈبو تڑپ جاتا۔ جانے ڈبو نے مرنے کا کیا مطلب سمجھ رکھا تھا۔ یہ تو ہوتا ہی تھا۔ کہ جہاں ڈبو نے کسی چیز کے کھانے سے انکار کیا یا کوئی اوندھی سیدھی حرکت کردی کہ رفیعہ بول اٹھی۔

" دیکھو ڈبو میں مر جاؤں گی ہاں۔" تو وہ یوں چک پھیریاں کھانے لگتا جیسے دم سے بھڑوں کا چھتہ لپٹ گیا ہو۔ کتنی ہی دیر وہ بے کل بے کل سا تلملاتا رہتا اور جب رفیعہ اس کے منہ میں روٹی یا بسکٹ کا ٹکڑا رکھ دیتی تو کھاتا جاتا اور چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا جاتا مانو کہتا ہو۔" اب سے ایسا کلمہ بدمنہ سے نہ نکالنا۔ ہاں سمجھیں۔"

ابا میاں بیٹھک میں سے سارا تماشا دیکھا کرتے۔ ایسی ناقابل یقین باتیں وہ اپنی بی بی کو سنانا نہ بھولتے۔

" اجی سنا، رفیعہ نے جب یہ کہا تو ڈبو نے کیا کیا۔ ؟ "

" اجی دیکھا، وہ کیسے روٹھ جاتا ہے۔ جیسے ہم تم ہوئے، جانور نہ ہوا۔"

طاہرہ بیگم اداسی سے بولتیں " ہاں کتا بڑا سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ جانے اللہ میاں نے اس کا پالنا گناہ کیوں ٹھیرا دیا ہے۔ ؟ ان کی اداسی کا مطلب ضمیر میاں سمجھ جاتے کہ " سسرال میں رفیعہ کا جی کیسے لگے گا۔ ؟ "

بیٹیاں ماں باپ کے گھر زندگی گزارنے کے لئے تھوڑے ہی پیدا ہوتی ہیں۔

ایک دن تو انھیں سسرال جانا ہی پڑتا ہے۔ اور رفیعہ بی بی کو بھی جانا ہی پڑا۔ اماں باوا کو معلوم تھا کہ ادھر رفیعہ اور ادھر ڈبو کیا کیا فیل مچائیں گے۔ جس دن برات کو اترنا تھا۔ اماں نے ڈبو کو گودام کے ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا۔

" اللہ جانے سسرال والے کن گنوں کے ہیں۔ پیٹ میں جھانک کر کس نے دیکھا ہے؟ محض اتنی بات پر ابھی سے دل برا کر لیں کہ ساتھ میں منحوس کتا چلا آیا تو آگے بٹیا کی زندگی کا کیا بنے گا۔؟"

روٹی اور ہڈیاں سامنے پڑی رہیں۔ صبح سے شام ہوگئی مگر ڈبو نے کسی چیز کو منہ نہ لگایا۔ ادھر باجوں کی دھیمی دھیمی آواز کانوں میں پڑی اور ادھر رفیعہ بی نے ہلکی ہلکی آوازوں سے رونا شروع کر دیا۔ مالکہ کے رونے کی آواز کانوں میں پڑتے ہی ڈبو کا دل اڑ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر اچکنا اور بے معنی طور سے گودام میں گھومنا شروع کر دیا۔

ادھر رفیعہ نے بے جگری سے رونا دھونا مچا رکھا تھا۔ آنسو تھے کہ بہے چلے جاتے تھے۔ ساتھ کی سکھی سہیلیاں سمجھاتے سمجھاتے تھک گئیں۔

" اے بی روؤ نہیں۔ کیا آج پہلی بار تمھیں پیا کے گھر جا رہی ہو۔؟"

" سچ بھئی ایسا رونا تو ہم نے کبھی نہ دیکھا۔ ارے یہ تو اتنی پرانی ریت ہے کون یوں آنکھیں کھونے کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔؟"

رفیعہ بے تکے پن سے بولی۔

" میں تو اپنے ڈبو کے واسطے رو رہی ہوں۔ ہائے! میں چلی جاؤں گی۔ تو وہ تو مر ہی جائے گا۔ وہ تو میرے بنا روٹی کو سونگھتا بھی نہیں۔"

ساری سکھیوں کے منہ بت ہو گئے۔

"اری پاگل! سہاگ رات کو دلہنیں دلہوں کے سپنے دیکھتی ہیں یا کتوں کے لئے روتی ہیں۔؟ تھو! کیا بیہودی لڑکی ہے۔!"

"ہم کو اچھا لگتا ہے جی ہمارا کتا۔ ہم تو مر جائیں گے، ہاں" اور رفیعہ نے دگنی شدت سے تلملا تلملا کر رونا شروع کر دیا۔

سسرال کی عورتوں نے دلہن کو سجایا سنوارا، زیورات پہنائے۔ مسی افشاں لگائی، ماں باپ، عزیزوں سے گلے ملوایا اور لے چلیں۔ پھولوں سے لدی پھندی موٹر میں ایک طرف رفیعہ کے دولہا بیٹھے اور ایک طرف رفیعہ ساتھ میں ساس، نندیں اور دوسری طرف رشتہ دار عورتیں۔ باجوں کی گت میں موٹر چیونٹی کی چال چل رہی تھی۔

ادھر گھر بھر میں ایک دم سناٹا سا پڑ گیا۔ رفیعہ کی مہین مہین آوازیں ختم ہو گئیں۔ ڈبو نے گول گول گھومنا بند کر کے صورتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینا شروع کیا۔ کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ کھڑی ہوئی بیکار چارپائیاں، لڑھکی ہوئی تپائیاں، میز، فالتو صندوق۔ الابلا۔ گھر کا جتنا بیکار سامان تھا سب اسی کمرے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ڈبو نے بلیوں کی طرح جست لگائی اور کھڑی چارپائی پر کود گیا۔ چارپائی سے اچھلا تو دیوار میں اونچی کیل سے اٹکی چوکی پر لٹک گیا۔ وہاں سے اچھلا تو روشن دان میں جا بیٹھا۔ روشن دان میں بیٹھ کر گھر کا جائزہ لیا۔ دھیرے سے قدم اٹھا کر کھپریل پر پاؤں جمائے۔ کھپریل پر آہستہ آہستہ چل کر کھمبے تک آیا۔ آنگن میں مہمان بیبیوں کے لئے تخت بچھے تھے۔ اندر کھانے دانے ہو رہے تھے۔ آنگن میں کوئی نہ تھا۔ ڈبو تیزی سے اچھلا اور تخت پر کود پڑا۔

موٹر چیونٹی کی چال چلتی ابھی گھر سے چند ہی قدم پہنچی تھی کہ ڈبو بھی خاموشی سے

برات میں جا شامل ہوا۔ اجنبیوں کو دیکھ کر اس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھایا۔ نہ کسی کو کاٹنے دوڑا، نہ کسی کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا، نہ پیچھے لپکا۔ یوں خاموشی سے پیچھے چلتا رہا جیسے میت کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ باجوں کی تیز تیز دھپڑ دھپڑ کے باوجود اس کے کانوں میں رفیعہ کی سسکیوں کی ہلکی ہلکی دبی سی، سنائی دے جاتی۔

برات سسرال میں جا کر رک گئی۔ براتی بھی اتر پڑے اور دولہا۔ دلہن بھی جب دولہا دلہن سجے سجائے کمرے میں لے جائے گئے تو ڈبو بھی چپکے سے سیڑھیوں کے پاس دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ دولہا دلہن کے لئے کھانا آیا، دلہن شرمائی سہمی سی بیٹھی تھی۔ بھلا اپنے ہاتھ سے کیسے کھانے لگ جاتی۔ دولہا میاں نے اپنے ہاتھ سے بڑے پیار سے کھلانا شروع کیا۔ اور دھیرے سے بولے۔

"کھاؤ نا۔ کب تک روؤ گی۔ ؟ اب تو۔۔۔" وہ شرارت سے ہنس کر چپ ہو گئے۔

پہلے تو رفیعہ یونہی بیٹھی رہی۔ مگر جب ان کا اصرار بڑھتا ہی رہا تو اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے ہاتھ نکالا اور ایک نوالہ توڑا ہی تھا کہ ایک دم ڈبو آنکھوں میں پھر گیا۔ رفیعہ کا تو معمول تھا کہ جب تک ڈبو نہ کھا لیتا وہ نوالہ توڑتی بھی نہ تھی۔

ہائے وہاں اسے کس نے کھانا دیا ہوگا؟ براتیوں کی گڑبڑ میں کس کو اس کی یاد آئی ہوگی۔ ؟ ہائے نامراد دن بھر سے اس تنگ کمرے میں بند رہا نا۔

"پھس پھس" وہ سہمے سہمے رونے لگی۔ دروازے پر بیٹھے ڈبو نے اپنی موجودگی کا دھیرے سے احساس دلایا۔

"غیوں، غاؤں، غیاؤں غیوں"

رفیعہ نے بے تابی سے گھونگھٹ الٹا تو دیکھا کہ ڈبو تو وہیں دروازے سے ٹکا بیٹھا تھا۔

وہ لپکی اور اک دم دروازے میں پہنچ گئی۔ ہاتھ کی روٹی اس کے آگے ڈال دی۔ اور بے تابی سے ڈبو، ڈبو کہہ کر پچکارنے لگی۔ اسی دم کمرے میں اسے کسی غیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ دولہا میاں مسکرا رہے تھے، شرم کے مارے اس کا جی کٹ کٹ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں اور اس کا نمکین سلونا چہرہ پھر سے ایک ہاتھ لمبے گھونگھٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔

صبح اماں ڈبو کی خبر لینے گودام کے ساتھ والے کمرے میں پہنچیں تو دیکھا روٹی، ہڈیاں اور پانی کا پیالہ جوں کے توں رکھے ہیں، مگر خود ڈبو میاں غائب ہیں۔ سارے میں ڈھونڈیا پڑ گئی۔

"کہاں گیا۔؟ کدھر گیا۔؟ کہاں گیا۔؟ کدھر گیا۔؟"

"بھاگ گیا ہوگا،" کسی نے سنایا۔

"اے لو، بات سنو۔ بھلا کتے بھی کہیں گھر چھوڑ کر جاوے ہیں۔؟" کسی بڑی بی نے کہا۔

"تو پھر دلہن کا پالا تھا۔ دلہن کے ساتھ چلا گیا ہوگا۔"

"دوئی کتا ہی تھا۔ بلی تو نہ تھا کہ اچک کر روشن دان میں سے باہر کو ہولیا۔"

"نامراد نے کہیں جان تو نہیں دیدی،" طاہرہ بیگم نے ہول ہو کر سوچا" اگر وہ گیا تو سمجھو رفیعہ بھی گئی۔" انھیں کسی پل قرار نہ آرہا تھا۔

دس بجتے بجتے جب سسرال سے دلہن کی واپسی ہوئی تو ڈبو میاں آگے آگے جھومتے جھامتے چلے آرہے تھے۔

"ہائے یہ تیرے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔ ساتھ کی سکھی سہیلیوں نے جب کرید کرید کر سہاگ رات کی باتیں پوچھیں تو رفیعہ نے کتے کی باتیں زیادہ کیں اور دولہا کی کم۔

"تھو۔ ایسا بھی کوئی کیا کرتا ہے۔؟ یہ لڑکی تو نری پاگل ہے۔ ہونہہ"
طاہرہ بیگم اور ضمیر میاں نے سوچا تھا جانے سسرال والے کیسے ملیں اور کسے کوکس نگاہ سے دیکھیں۔ مگر سسرالیوں نے تو اس بات کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ کتا رہتا نہ رہتا ان کو کوئی اعتراض ہی نہ تھا۔ دولہا میاں اپنی نمکین، سلونی دلہن کے عاشق انھیں لیلیٰ پیاری تھی۔ اس کا کتا بھی پیارا۔ ڈبو نے اتنی خاموشی سے گھر بھر میں اپنی جگہ جمالی کہ کسی قسم کی ناامیدی کا سامنا ہی نہ کرنا پڑا۔

رفیعہ ایسے گھر میں پیدا ہوئی تھی جہاں آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ لے دے کر اسی کی ذات سبھوں کے پیار کا مرکز تھی۔ نانی ہیں تو نثار، باپ ہیں تو ہر جا بے جا ضد پوری کرنے کو تیار، اور ماں تو ماں ٹھیریں بھولے بھٹکے کبھی جھڑک بھی دیتیں تو پھر ایک گھنٹہ آنسو بہاتیں کہ "ہائے میں نے اپنی لاڈو کو کیوں جھڑکی دی۔؟"

اب تک اس نے صرف پیار کئے جانے، چاہے جانے کی لذت ہی چکھی تھی۔ پیار کرنے میں۔ چاہنے میں جو مزہ تھا اس کا اسے علم نہ تھا۔ دولہا میاں اسے یوں دل و جان سے چاہتے تو وہ بھی اپنا پیار لٹاتی۔

"پیار کرنا بھی اتنا بھلا ہوتا ہے؟" وہ اپنے آپ میں سوچے جاتی۔ ماں باپ سے ضد کر کے ہر بات پوری کروا لینا اور تھا، اور اب میاں کی ضد پوری کر دینا اور۔ اس کے کر لینے اور کر دینے میں کتنا بڑا فرق تھا! اب تک وہ ماں باپ سے خدمت کرواتی آئی تھی، اب وہ خود کسی کی خدمت کرتی تھی اور اس میں لطف بھی لیتی تھی۔ بچپن میں گڑیاں کھیلی تھیں۔ ہنڈ کلھیا پکائی تھی۔ جھوٹے موٹے کے گھر کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ اب سارے میں جان پڑ گئی تھی۔ اب یہ سب کچھ جیتا جاگتا ماحول بن گیا تھا۔ یہاں بے زبانی نہ تھی، خاموشی اور ویرانی نہ تھی۔ ساس سسرے، نند دیور اور پھر سب سے

بڑھ کر اپنا پیارا دولہا۔ ان سب کو اور سب سے بڑھ چڑھ کر میاں کو پیار کرنے میں، ان کی خدمت کرنے میں اس کو عجیب لطف آتا اور پہلے کے پہلے ہر ہر کام لپک لپک کر کر دینے میں اسے بڑی خوشی ملتی۔ اس خوشی میں وہ ہر لمحہ ڈوبی رہنا چاہتی۔

اس دن معین میاں آفس جانے لگے تو ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ پونے دس بجے آفس پہنچ جانا پڑتا تھا۔ رفیعہ نے ناشتہ میز پر لا کر رکھا تو ہنس کر بولے۔

"تمہاری وجہ سے آج آفس کو دیر ہو گئی۔"

"کیوں، میں نے کیا کیا بھلا۔؟" وہ حیرت سے بولی

وہ منہ پھٹ پن سے بولے۔ "بھئی نو بجے تک تو ہم ایک ہیم تن کے ساتھ ہی۔"

"ہائے ہائے۔" رفیعہ شرما کر بولی۔ "ایسی بے حیائی کی باتیں بھی نہ کیجئے۔ کوئی سنے تو کیا بولے۔؟"

"اچھا۔" معین میاں ہنس کر بولے۔ "ہوا سو ہوا۔ اب تو جلدی سے ناشتہ کر لیں۔"

معین میاں نے آج تک کبھی دلہن کے بغیر نوالہ نہیں اٹھایا تھا۔ اب اس وقت گڑبڑ دیکھ کر رفیعہ بولی۔

"صرف ایک پراٹھا تو میز پر ہے۔ اتنی جلدی میں ساتھ کھانا ایسا کیا ضروری ہے؟ ابھی ماما پکا کر بھیجتی ہے۔ آپ کھائیے، اتنے میں اور آجاتے ہیں۔"

"نا بھئی ہم اکیلے نہ کھائیں گے، چاہے وہ ایک نوالہ ہی کیوں نہ ہو!"

"اور جو آفس جانے میں دیر ہو رہی ہے تو؟" رفیعہ نے لاڈ سے پوچھا۔

معین میاں نے اپنے مضبوط پنجے میں اس کی نازک کلائی دبوچ لی۔

"بیٹھو گی یا پھر رات کی طرح۔"

"ہائے ہائے آپ اس قدر بے تکے ہیں۔؟ اب یہ رات دن کی باتیں یاد دلانے کا

کون موقع ہے۔؟" اور رفیعہ نے پیار بھری شرمیلی نظروں سے میاں کو دیکھتے دیکھتے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

رفیعہ نے آج تک کبھی ڈبو کے بغیر نوالہ نہ اٹھایا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے بیٹھے ہوئے ڈبو نے پہلے تو ذرا حیرت، اور پھر ناگواری سے رفیعہ کو دیکھا۔ ہاں وہ اکیلی ہی تو کھا رہی تھی۔ آج اسے ڈبو کی یاد نہ آئی۔ ڈبو نے بے چینی سے دم ہلائی اور وہاں سے اٹھ کر مہندی کے پودے تلے جا بیٹھا۔

ناشتے کے بعد نوکر نے جھوٹے برتن اٹھائے اور مہندی کے پودے تلے جھوٹے ٹکڑے اور ہڈیاں ڈال دیں۔ ڈبو نے تھوتھنی اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھا اور پھر گردن دبا کر سوتا بن گیا۔

دو بجے کے کھانے کے بعد اچانک رفیعہ کو ڈبو کی یاد نے آ گھیرا۔ رکابی میں روٹی اور گوشت کی بوٹیاں لیکر وہ مہندی تلے پہنچی۔ ڈبو نے اس کی آمد پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ ٹانگوں میں گردن دبائے یونہی پڑا دیکھتا رہا۔ رفیعہ اس کی ناراضگی کی وجہ بھانپ گئی تھی۔ ہنس کر بولی۔

"ڈبو راجہ کو غصہ آ گیا" اور ٹکڑے سامنے ڈال کر بولی۔ "اونہہ اب کھا بھی لو اور ختم کرو غصہ۔"

ڈبو نے اٹھ کر دو تین پینترے بدلے اور پھر پڑ گیا۔

"نہیں کھائے گا؟" رفیعہ نے ذرا تیزی سے پوچھا۔

ڈبو نے مالکہ کو دیکھا تک نہیں۔

"اچھا یاد رکھ۔ تو نہیں کھائے گا تو میں سچ مچ مر جاؤں گی

اکدم ڈبو اٹھ بیٹھا۔ دم گھما گھما کر دو تین جک پھیریاں کھائیں اور روٹی پر پل پڑا۔

اس دن تو یہ ہوا تھا کہ ناشتے کے وقت ڈبو بھلا یا گیا تو کہیں دوپہری کو یاد آیا۔

اب تو یوں ہونے لگا کہ ڈبو بھوکا ہی ہے۔ دو دو وقت گذر گئے ہیں مگر مالکن کو یاد ہی نہیں آ چکتی۔ کبھی دن بھرے میں ایک آدھ بار یاد آ گئی تو وہ دوڑی دوڑی آتی اور اپنے مرنے کا ڈراوا دے کر اسے کھلا پلا جاتی۔ لاکھ کتا تھا، مگر محبت اور نفرت کا رویّہ خوب سمجھتا تھا جان گیا کہ اب اس کا ایک اور دعویدار پیدا ہو گیا ہے۔ لیلیٰ نے ہی کتے کو نظر انداز کر دیا تو مجنوں کی جوتی کو غرض پڑی تھی کہ واری صدقے جاتا! پہلے جہاں معین میاں آفس سے آتے ڈبو لپکا پڑتا اور پیروں اور جوتوں کو رال سے بھگو بھگو دیتا۔ اور وہ بھی پیار سے چمکار دیتے۔ اب جب کبھی موٹر سائیکل گھڑ گھڑاتی اور دروازہ کھڑ کھڑاتا تو ڈبو یونہی مہندی تلے سویا بنا پڑا رہتا۔ معین میاں نے اس کی اس تبدیلی کو مائنڈ بھی نہ کیا۔

ڈبو کی خاک بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی رفیعہ کو کیا ہو گیا ہے کہ بستر سے لگ گئی ہے۔ کھایا پیا سب ابکائیاں لے لیکر اگل دیتی ہے۔ کھانے سے دھیان نہ پینے سے جب دیکھو تب کچرے کے ڈھیر میں بس نارنگیوں کے چھلکے دکھائی پڑتے، ورنہ پہلے تو ہڈیاں بھی ہوتی تھیں اور روٹی کے ٹکڑے بھی۔ پچھواڑے کے ڈھیر میں جو باورچی خانے کے پیچھے لگا رہتا تھا، اس میں خیر اب بھی وہی نعمتیں چھپی رہتیں مگر یہ رفیعہ کے کمرے کے ساتھ والے ڈرام میں اب لے دے کے دہی نارنگی کے چھلکے، انار کے چھلکے، معین میاں دلہن بی بی کے آگے پیچھے ہوتے بس بچھے بچھے جاتے۔ بس نہ چلتا کہ سب کے سامنے گود میں بھر لیتے۔ رات بے رات دلہن بی بی کو 'او، او' کر کے ابکائیاں آتیں، قے ہونے لگتیں۔ ادھر سے ساس دوڑی آتیں ادھر سے نند۔ اور پھر خود دولہا میاں! ڈبو کی نیند ان دنوں اور بھی اچٹی اچٹی سی ہو گئی۔ رات بھر چوکسی سے جاگتا رہتا۔

پھر ایک رات اندھیرے کو چیرتی دلہن بی بی کی چیخیں سارے میں پھیل گئیں سارے گھر میں بھگدڑ پڑ گئی۔ نوکر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ڈبو مہندی تلے لیٹا سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر ذرا

طوفان تھما اور اندر سے مہین مہین چیخوں کی آوازیں آنے لگیں جیسے دلہن بی بی کئی برس چھوٹی ہو گئی ہوں اور باریک آواز سے روتی ہوں۔

ڈاکٹرنی باہر نکلی اور معین میاں سے مسکرا کر بولی۔

"گرل۔ بالکل چھوٹی سی، مدر کی کاپی۔"

معین میاں کھڑے کھڑے زور سے اچھلے۔ پھر ماں کی موجودگی کا خیال کرکے شرمندہ ہو گئے رفیعہ نے اب تک گڑیوں سے کھیلا تھا۔ کتے سے کھیلا تھا، میاں سے کھیلا تھا۔ مگر یہ زندگی کی سب سے عجیب اور سہانی مسرت تھی ۔۔ جس کی آتی جاتی سانس اس کی اپنی زندگی کا پیغام تھی۔ بچی کے دم سے دونوں میاں بیوی اور قریب آ گئے معین میاں آفس سے بد دل ہو گئے۔ اتوار کے انتظار میں مرے جاتے۔ اور جب اتوار آتا تو تینوں، ماں، باپ اور بچی، کمرے میں قہقہے لگاتے، مسکراتے، ہنستے۔ پھر شام کو بٹیا رانی اور آزو بازو ماں باپ، سیر کو نکل جاتے۔

بچی کبھی ماں کی گود میں، کبھی باپ کی گود میں۔ معین میاں پہلے ہی کیا کم رفیعہ کے دیوانے تھے، اب تو بالکل ہی مٹ کر رہ گئے۔ اس نے انھیں ایک عام آدمی سے اکدم باپ کا درجہ دیدیا تھا۔ ادھر رفیعہ بی بی کو ماں کا رتبہ معین میاں کے دم قدم سے ہی تو ملا۔ دونوں کی محبت پہلے سے دگنی تگنی ہو گئی۔ اور بچی ان کی محبت کا زندہ ثبوت تھی۔ ایک ستارہ ٹوٹ جائے تو آسمان سونا نظر نہیں آتا۔ دوسرے ستارے اس کمی کو پوری کر دیتے ہیں۔ ڈبو ایسا ہی ٹوٹا ستارہ تھا جس کی کمی رفیعہ نے محسوس نہ کی۔ وہ رفیعہ کے دل کے آسمان سے ٹوٹ کر گر بھی گیا تو کیا تھا۔ وہاں دو دو ستارے چمکتے تھے۔ آسمان کی روشنی میں کیا فرق پڑا۔؟ وہ اس کی زندگی سے دور۔ دور۔ اور دور ہوتا گیا۔ ہو گیا۔ مگر معین میاں اور پھر منی کی زندگی نے سارے اندھیرے اجالوں سے

بدل کر رکھ دیئے ۔ ایسے ستارے کا غم کون کرتا ہے ۔؟

انسان اور جانور کا سوال نہیں ہے ۔ سوال ہے محبت کا ۔ جو کسی کی ٹیڑھی نگاہ برداشت نہیں کر سکتی ۔ اس لاپروائی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ڈبو دونوں باپ بیٹی کا دشمن بن گیا ۔ اس کی حیوانی عقل نے اسے یہی سمجھایا کہ جس طرح بن پڑے انھیں ستائے ۔

ڈبو کو چیزیں منہ میں اٹھا کر ادھر ادھر لانے کی عادت تو تھی ہی ۔ معین میاں جوتے اور موزے اتار کر رکھتے تو وہ موزے منہ میں اٹھا کر باہر لاتا اور ادھر ادھر پھینک دیتا ۔ وہ آفس جانے کو اٹھتے تو سارے میں ڈھونڈھیا پڑ جاتی ، موزے کبھی نہ ملتے ۔ ڈبو سب کو پریشان دیکھ کر مارے خوشی کے چک پھیریاں کھانے لگتا ۔ کبھی معین میاں کے جوتے اٹھا کر کیچڑ میں پھینک آتا ۔ کبھی ٹائی نظر آجاتی تو چبا کر رکھ دیتا ۔

بچی دونوں میاں بی بی کی جان ایمان تھی ۔ اس نے بچی کو بھی اپنا دشمن تصور کر لیا ۔ وہی تو تھی جو کانٹا بن کر آگئی تھی ۔ ورنہ رفیعہ جس نے اسے پھولوں کی طرح رکھا تھا ۔ اب کانٹوں کی طرح ٹھکرا رہی تھی ۔ ڈبو اس کی ساری چیزیں خرد برد کر دیتا ۔ رفیعہ کی آنکھ بچا کر بچی کا سارا دودھ پی جاتا ۔ بوتل میں لگا نپل چبا ڈالتا ۔ رفیعہ پریشان ہوتی غصہ ہوتی تو دور بیٹھا چمکیلی آنکھوں سے ساری کارروائی دیکھے جاتا ۔

اب دن کے تین ٹائم میں سے شاید ہی کوئی وقت ایسا آتا ہو جب رفیعہ ڈبو کو روٹی ڈالتی ہو ۔ نوکر ہی کھانا اور پانی لاکر سامنے ڈال دیتے ، کھائے نہ کھائے ۔ کبھی کبھار بچی کو لئے وہ ادھر والے دالان میں جاتی تو سیڑھیوں سے اترتے اترتے اسے چمکار کر پوچھ لیتی ۔

" کیوں ڈبو کھانا کھا لیا ۔ ؟ "

شاید اس کے دل میں ابھی تھوڑی بہت محبت باقی رہ گئی تھی ۔ ڈبو کی شرارتیں حد سے بڑھنے لگیں ۔ مگر رفیعہ پر بھید نہ کھلا ۔

گھر میں نند کے ایک نہ دو پورے سات بچے تھے۔ جو دن بھر رولی مچاتے اور مستیاں کرتے۔

ایک دن ان میں سے کسی نے اس زور سے ڈھیلا کھینچ مارا کہ ڈبو کی ٹانگ میں اتنا بڑا زخم لگ گیا۔

آج سے کئی دنوں پہلے نانی اماں نے پتھر کھینچ مارا تھا تو رفیعہ پر راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

آج پھر اس کے زخم لگ گیا تھا۔ رفیعہ باہر آئی اور بچوں کو ڈپٹ کر بولی۔

"توبہ! اتنے سمجھدار ہو، بے زبان کو مارتے شرم تو نہیں آتی ذرا سی۔؟" اور وہ نوکر سے کہہ گئی۔

"رحیم، ذرا اس کی خبر لیتے رہنا۔ زخم بڑھ جائے تو جلد ٹھیک نہیں ہوتا۔"

رحیم روزانہ ایک سڑا بسا مرہم تھوپ جاتا اور ڈبو اس کے ادھر ادھر ہوتے ہی زخم کو نوچ نوچ کر پھر سے ہرا کر لیتا۔ زخم بڑھتا رہا۔ مگر رفیعہ کا دھیان ادھر گیا ہی نہیں، کیونکہ ادھر منی کی طبیعت خود خراب تھی۔ دونوں میاں بی بی کا سارا سارا وقت بٹیا رانی کی تیمارداری میں صرف ہو جاتا۔ ڈبو نے زخم کھرچنا چھوڑ دیا۔

زخم اچھا ہوا تو ڈبو اور زیادہ شیر ہو گیا۔

سارے فساد کی جڑ تو منی ہی تھی۔ اب تو منی کے ریشمی قیمتی فراک گم ہو جاتے، جوتے غائب، دودھ کا بگونا خالی، نپل پھٹے چبے۔ رفیعہ نے ایک دن الجھ کر میاں سے شکایت کی۔

"بھئی یہ آپ کی آپا کے بچے اس قدر شیطان ہیں؟ دیکھئے نا منی کے سامان کی گتیاں بن گئیں نپل ہیں تو پھٹے ہوئے۔ چبے ہوئے، فراک غائب، جوتے گم، کھلونے کیچڑ میں۔ کوئی ایک بات ہے۔"

معین میاں نے بھانجے بھانجیوں کو بلا کر ان کی پریڈ لی تو وہ دیدے ٹپ ٹپا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماموں جان ہم نے تو ایک چیز کو بھی ہاتھ تک نہ لگایا۔"

"شرارت کرتے کرتے اب جھوٹ بھی بولنے لگے۔" رفیعہ نے جل کر میاں سے شکایت کی۔

ایک دن ڈبو میاں اکیلے منی کا نیا نپل پھاڑنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ رفیعہ کسی کام سے ادھر نکل آئی۔ اس کام سے فراغت ہوئی تو دودھ پر پل پڑے وہاں سے ہٹے تو رفیعہ

"اب تو یوں شوشہ چھوڑ جائے گی تو ظاہر ہے میں خوشامد کرتے کرتے تیرے گدگدی شروع کر دوں گا اور — اور — ہاں۔"

"بس بس، اسی دھوکے میں نہ رہنا۔"

"اچھا یہ بات۔؟"

"ہاں اور کیا۔ اب تمہاری پروا کسے ہے۔؟"

ہنس کر شیرا اُسے پکڑ لیتا اور دنیا بھر کے عام باپوں کے لہجہ میں پوچھتا۔

"بیٹا کہ بیٹی۔؟"

"جو بھی ہو جائے۔"

"ہاں جو بھی ہو جائے۔ ہمیں تو بس اولاد چاہیئے۔"

مگر ساس کو صرف اولاد ہی نہیں بلکہ بیٹا چاہیئے تھا۔ مارے خوشی کے اس نے آئے گئے سے کہہ کہہ کر منہ سکھا لیا۔ "بہو کو بیٹا ہونیوالا ہے۔ اری سنتی ہو سکو بوا، میری بہو پوت جنے گی۔"

جمو خالہ نے لاکھ بار منع کیا کہ یوں سارے میں بات پھیلایا نہیں کرتے۔ لوگ جادو منتر کر دیتے ہیں۔ مگر ساس کی خوشی تو وہ سورج تھی کہ بادل دیکھے نہ بدلی۔ چھلکے جاتا ہے۔ اتنی خوشی کی بات چھپاتی بھی کیسے۔

بازو کے گھر والی حسینہ خالہ جب سے حج کر آئی تھیں حاجن اماں کہلاتی تھیں۔ اور چھو چھپا بھی کرتیں۔ کالی دھاریوں والی کاسنی چادر جو گاؤں کے منگل ہاٹ میں ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کو ملتی تھی اوڑھ کر وہ ہر گھر میں جاتیں اور اپنی دعائیں مفت بانٹا کرتیں۔ شاداں پر ان کی خاص نظر عنایت تھی۔ جھنا ماں کو مخاطب کر کے بولتیں۔

"جھنا بہو سے کہہ وہ دن گئے جب منوں وزن اٹھا لیا کرتی تھی۔ اب بوجھے اٹھانا چھوڑ دے۔" شاداں کو پاس بٹھا کر ہر وہ بات پوچھ ڈالتیں کہ کبھی شیرے نے بھی ایسی باتیں نہ پوچھی

ہوں گی۔ شاداں ہنسی روکتے روکتے لال لال ہو جاتی اور پھر رات کو شیرے سے بولی۔

"حاجن اماں پوچھتی تھیں تیرا بچہ گول گول گھومتا ہے کہ نہیں۔"

شیرے کی حیرت دوچند ہو جاتی۔

"ہائیں! اتنے سے پیٹ میں بھلا بچہ کیسے گھوم سکتا ہے۔؟ کیا سچ ایسا ہی ہوتا ہے۔؟"

اور دونوں حیرت سے سوچتے سوچتے سو جاتے۔

کہاں تو شاداں بڑے بڑے بوجھ، من من بھر کے جواری کے تھیلے اٹھا کر پھینک دیتی اور ہانپتی تک نہ تھی، اور اب اتنے ذرا سے پیٹ کے بوجھ کو سنبھالتے سنبھالتے اس کی جان پر آ بنی تھی۔ شاداں کا وہ ہلکا پھلکا دھان پان سا جسم اب نئی نئی مونگ پھلی کی طرح بھر گیا تھا۔ اور کولہوں کے پاس جو گڑھے جیسے تھے وہ آپی آپ بھر گئے تھے۔ بازو دبیز اور گالوں میں سنہرے پھول چمکنے لگے تھے۔ اور پھر اس کے علاوہ پیٹ خوب اونچا اونچا ہو گیا تھا اور پھر اس سے بڑھ کر شیرے کو شاداں کے چھیڑنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اندھیرے اجالے وہ اسے کہیں نہ کہیں ماں کی آنکھ بچا کر پکڑ لیتا اور ہنسی ہنسی بولتا۔

"یوں بے بات پھولی کیوں جا رہی ہے۔؟ مٹاپا تو دیکھ ذرا! ابھی ابھی تک تو دھان پان تھی۔"

شاداں شرما کر دونوں ہاتھوں سے اپنا دوپٹہ پورے جسم کے گرد لپیٹ لیتی۔

"تم کھانا نہیں کھاتے کیا۔؟"

"کھاتا تو ہوں، پھر۔؟"

"تو بس آنے والے کا رزق بھی اللہ نے اتار دیا ہے۔"

اتنے دنوں کے بعد آج شیرے کی سمجھ میں آیا کہ شاداں کیوں اتنے دنوں سے پھٹے کپڑے جمع کر رہی تھی۔ ماں نے کھلے کھلے لفظوں میں بغیر کسی شرم کے ساری بات

کھول کے رکھ دی اور آنگن میں کھڑا را مو دادا کہاں تو الجھ رہا تھا یا اب خوش ہو کر بولا ۔

" واہ ری جھنا بوا ۔ ! بہو کا بیٹ ہاتھ بھر اونچا نکل آیا اور مجھے کھبر ہی نہیں ۔ اچھا اب پرانے کو دے کر کیا جاؤں ۔ ؟ جنائی پر اب تو نیا کرتا ہی لوں گا ۔"

ساس ہنسنے لگی ۔ " ارے دیں گے ، دیں گے ۔ ضرور دیں گے ۔"

شاداں کی چھاتی اب ہمیشہ جلتی رہتی ۔ شبرا آتے آتے ٹھنڈے پھل لے آتا ۔ اپنے ہاتھوں لسی پلاتا ۔ جس چیز کی شاداں چاہت کرتی وہی کھلانے پر تل جاتا ۔ چاہے شہر سے کیوں نہ لانی پڑتی ۔ مگر چھاتی کی جلن جوں کی توں برقرار تھی ۔

حاجن اماں نے سنا تو بولیں ۔ " وہ ئی ایسی جلن بیٹھا ٹھنڈا کھانے سے کہاں جائے بیٹی پیدا ہو گی ، دیکھ لینا ، اسی کی جلن ہے ساری ۔"

تو بیٹی سے چھاتی کی جلن کا کیا تعلق بھلا ۔ ؟ "

" ارے بیٹی کے سر پر جھنڈولہ ایسے بال رہتے ہیں کہ بہنیں ۔ وہی ماں کی چھاتی پر چلتے رہتے ہیں ۔"

شاداں نے ہنس کر منہ پھیر لیا ۔ شبرے کے تصور میں چھوٹی سی شاداں ابھر آئی گوری گوری چھوٹے چھوٹے ہاتھوں پیروں والی ، سر پر لہر مارتے ہوئے گنجان ۔ گھنے بال اور ہونٹ عین بین شاداں کے ہونٹ دیکھ لو ۔ اس نے بچی کے خیال ہی سامنے بیٹھی شاداں کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں ۔ شاداں جھلا کر بولی ۔

" اے کچھ شرم ہے کہ نہیں ۔ ؟ "

شبرے تو یونہی کھویا ہوا تھا ۔ اسی بے خیالی سے بولا ۔

" ارے واہ ! شرم کیسی ؟ اپنی بچی کو پیار بھی نہ کروں ۔ ؟ "

شاداں دوہری ہو گئی ۔ " ہائے رے مورکھ ۔"

نیند میں شاداں ایسے زور سے چلائی کہ شیرے کی آنکھ چٹ سے کھل گئی۔ "مری، مری" کے علاوہ کچھ کہتی ہی نہ تھی۔ شیرے لاکھ سر پٹک پٹک کر پوچھ رہا تھا۔ "اری کیا ہوا؟ کاہے سے مری۔؟" مگر وہ تو یونہی رٹ لگائے تھی۔

"ہائے مری۔ مولا تیری دہائی۔ ہائے، ہائے۔"

شیرے کو اور تو کچھ سوجھا نہیں، جھٹ سے کنڈی کھول کر آنگن میں لپکا اور ماں کو جھنجھوڑ کر بولا۔

"ماں ماں، شاداں مر رہی ہے۔"

ماں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور دوسرے ہی لمحے کمرے کو لپکی۔ تھوڑی دیر میں باہر نکل آئی اور غصے سے بولی۔

"پاگل کہیں کا۔ کہیں سوتے سے اٹھ کر یوں کہا کرتے ہیں کہ شاداں مر رہی ہے۔؟"

پھر ہنس کر بولی۔ "ارے گدھے شاداں مر نہیں رہی جی رہی ہے۔"

شیرا اچھل کر بولا۔ "ماں تیرا مطلب ہے اسے بچہ ہو رہا ہے۔؟"

"چل ہٹ، بے شرم۔ شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں پوچھتے؟"

گاؤں میں کوئی تنہا نہیں ہوتا۔ ایک کے دکھ پر ساری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اور ایک کی خوشی ساروں کے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دیتی ہے۔

شاداں کی چیخیں ادھر گھر میں گونجیں نہیں کہ ادھر ادھر سے عورتیں جھانکنے لگیں۔ کسی نے دائی کو بھی بلا لیا۔ یوں ماں خود کیا کسی دائی سے کم تھی۔؟

شیرے کو اس لمحے تو بڑا غصہ آیا کہ جب دروازے بند کر کے اسے کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ اب بند کمرے سے دبی دبی چیخیں باہر آ رہی تھیں۔ جو اندر یقیناً بے حد تیز ہوں گی۔ شاداں درد کی شدت میں کراہ کراہ کر چلا رہی تھی۔

"ہائے مری ۔ او شیرے مری ۔"

شیرا پہلے تو چپکا کھڑا سنتا رہا ۔ پھر دروازے پر ٹھوکا دیکر بولا ۔

"ماں ! شاداں مجھے کیوں پکار رہی ہے ۔؟"

کوئی جواب نہ ملا ۔ شیرا بے قراری سے بولا ۔

"ماں ! شاداں مجھے کیوں پکار رہی ہے ۔؟"

"ہاں ہاں، وہ تیرے ہاتھوں جنائی کرانا چاہتی ہے ۔ اس لئے پکار رہی ہے ۔"

ماں کی غصہ بھری آواز آئی ۔

شیرے وہیں بت بنا کھڑا رہا ۔ یقیناً شاداں بہت بڑی مصیبت میں مبتلا تھی تبھی تو اتنا چلا رہی تھی ۔ ورنہ ایسے ویسے درد کو تو وہ یوں ہنس ہنس کر ٹال جاتی تھی ۔ ایک بار بھینس نے سینگ مار دیا، اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا ۔ جواری کے تھیلے سمیت ایک بار اوندھے منہ گر پڑی مگر اف نہ کی ۔ یونہی ایک بار بڑے پتھر کے وزن سے بری طرح جھونک کھا گئی مگر ہنستی ہی رہی ۔ پھر اب ۔؟"

"او شیرے ۔ ہا ۔ مر گئی ۔"

چلاتے چلاتے اس نے "او ، او" کر کے ابکائیاں لینی شروع کر دیں ۔

"اری پریم دِوانی ۔" ساس جھلا کر بولی ۔ "یوں الٹے سانس تو نہ کھینچ ۔ بچہ اوپر چڑھ جائیگا تو جلدی نہ اتریگا ۔ نیچے زور ڈال ۔"

شاداں نے ہونٹوں پر دانت گاڑ کر پوری طاقت نیچے کی طرف پھینکنی شروع کر دی ۔

صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا ۔ دور سے مؤذن کی آواز آئی اور مطلبی شیرا جھٹ پانی کے چھپکے منہ پر مار مار کر کھڑا ہو گیا ۔ ادھر صبح کا سورج چمکا اور ادھر شاداں کی

چیخوں میں کمی ہوگئی۔

پھر تھوڑی دیر یونہی خاموشی رہی اور اس ایک لمحے کی خاموشی میں شیرا کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ پھر اکدم سے "چیاؤں۔چیوں" کی میٹھی میٹھی آواز باپ کے کانوں سے جا ٹکرائی۔

"اری واہ ری شادو، واہ!" وہ کھڑے کھڑے ہی چلایا۔

"اللہ تجھے اچھا رکھے، ماں کو آج دادی بنا دیا۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، شیرا شریف بن کر دور جا کھڑا ہوا تھا۔ بھلا ماں کے سامنے کیسے بیوی کے پاس جائے۔؟

"تو آنول روندن میں گاڑ دے، تب تک میں بھینس دوہ کر بہو کے لئے تازہ دودھ لے آوں۔" ماں دائی سے مخاطب تھی۔ اس کے ٹھنڈے سبھاؤ سے شیرا سمجھ گیا کہ شیرے نے ہنیں ننھی شاداں نے جنم لیا ہے۔ مگر اس کے دل میں تو خوشی کے چاند چمک رہے تھے۔ ماں تھان پر گئی کوئی دو چھتی پر پڑی کالی دھاریوں والی کاسنی چادر اوڑھ شاداں کے پاس جا بیٹھا۔

شاداں ہنس کر بولی۔

"یہ عورتوں کی طرح چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے۔؟"

"ماں پیچھے سے آ کر دیکھے گی تو سمجھے گی کہ حاجن اماں ہے۔ ورنہ مجھے تو مار ہی ڈالے۔"

کھن کھناتی ہنسی ہنس کر شاداں پڑھی لکھی عورتوں کی طرح سے بولی۔

"مولوی جی کہتے ہیں نا ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ شیرے آج میرے قدموں تلے بھی آسمان سے چاند اتر کر آ بیٹھا ہے۔" اس نے ناز اور غرور سے اپنی پائنتی دیکھا جہاں ننھی سی کلی ہمکتی پڑی تھی۔

شیرے نے آگے بڑھ کر اسے ذرا ڈر ڈر کر دور سے چھوا۔

"ہائے رے۔ ! کیسی گل گلی سی ہے۔ نرم نرم ۔ یو۔ یو" پھر ہنس کر بولا۔ "تیرے جیسی ہی ہے ری شاداں۔"

شاداں کے منہ پر خوشی ہی خوشی تھی۔

"مجھے تو مولیٰ کی قسم بیٹا بھی ہوتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔" شیرے کی باتیں ختم ہونے میں نہ آرہی تھیں۔ "تجھے خوشی نہیں ہوئی کیا؟" وہ احمقوں کی طرح بولا۔

شاداں کو ساس کا رویہ یاد آگیا، الجھ کر بولی۔

"کیوں۔؟ اسے نو مہینے پیٹ میں نہیں رکھا کیا۔؟ اس کے پیدا ہوتے درد نہیں لگے کیا۔؟ سر سے پاؤں تک پسینے کے ریلے بہہ گئے، تب باہر آئی۔ ایسی کیا اوپر کی آئی ہے کہ خوشی نہ ہوگی۔؟"

"ماں بنتے ہی تجھے اتنی ساری باتیں کہاں سے کرنی آگئیں۔ جیسے بڑی تجربہ کار ہوگئی۔ ابھی اتنی ذرا سی تو ہے۔!"

شاداں ہنس دی۔ اب کے سے اس کی ہنسی میں تھوڑا سا غم بھی تھا۔

"خوشی کیسے نہ ہوتی شیرے؟ مگر میں نے آج پھر اپنے مولیٰ سے ایک بار وہی دعا مانگی ہے کہ میرے پیار کی آگ کو جلتا رکھیو۔"

شیرے نے حیرت سے اس کو دیکھا تو بولی۔

"ہاں شیرے عورت کو سب کی خوشی کا خیال ستاتا ہے۔ ہم تم خوش ہولیں تو کیا ہے؟ ماں کا بھی دل ہے، اس دل کی بھی آرزو ہے۔" ماں دودھ کا کٹورا لئے آئی تو حاجن اماں کو بیٹھا دیکھ کر خوشی خوشی بولی۔

"دیکھو بوا! اللہ نے فضل کیا ہے۔ راتوں رات درد اٹھے اور فجر ہوتے....."

شاداں کی ہنستی صورت دیکھ کر ماں نے کالی دھاریوں والی کاسنی چادر کو غور سے دیکھا

بھلا حاجن اماں اتنی آڑی چوڑی کب ہے۔ اس نے آگے جھک کر چادر زور سے کھینچ پھینکی۔ "ارے کم بخت! موئے جورو کے غلام، شرم تو نہیں آتی ذرا سی....."

ساس کی نگاہوں میں بچی لاکھ ناقابل اہمیت تھی مگر شاداں کے لئے اس کا کیا رتبہ تھا؟ یہ کوئی شاداں کے دل سے ہی پوچھتا۔ اس کے ننھے منے وجود نے اسے ایک ماں کا درجہ دے دیا تھا۔ وہ اور شیرا مل کر دونوں غور کرتے سوچتے رہے کہ اس مینا کو کیا نام دیں؟ جس نے ان کی زندگیوں میں چہچہے بھر دیئے تھے۔ اجالے بھر دیئے تھے، رنگ بھر دیئے تھے، خوشبوئیں بھر دی تھیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد دونوں نے مل کر بچی کا نام چاندنی رکھا۔ کوئی چاند کہتا۔ کوئی چندا۔ کوئی چندو اور بگڑتے بگڑتے وہ چناں ماں پڑ گیا۔

چنا ابھی گھٹنوں گھٹنوں رینگتی بھی نہ تھی کہ ایک دن پھر شاداں شیرے کو پھٹے کپڑے سمیٹتی نظر آگئی۔

شیرا کمرتا پہنتے پہنتے رک گیا "ارے اتنی جلد! پھر وہی بات ہے" وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا "اری واہ ری شاداں بی بی، مولی تجھے اچھا رکھے! تو تو میرا گھر بھرنے پہ تل گئی ہے"۔
ماں تا کے تسکین وہ احساس اور خوشی نے اس کے سینے میں لہریں ابھار دیں۔ اور چھل چھل دودھ اس کے کرتے کے اوپر سے بہنے لگا۔

اس رات بالکل پچھلے سال کی سی واردات ہوئی۔ شاداں سوتے سے چونک کر اٹھی، مگر اب اس کی تڑپ میں وہ الھڑپن اور ناتجربہ کاری نہ تھی۔ کراہتے ہوئے بولی۔

"مجھے جنائی کے درد لگ رہے ہیں" پاس پڑی بچی کو باپ کی گود میں دیکر بولی۔

"اسے باہر لے جاؤ، مجھے چیختا چلاتا دیکھ کر سہم جائے گی"

شیرے نے بڑی عزت، محبت، عقیدت اور کچھ کچھ عبادت کرنے کے سے انداز سے

شاداں کی طرف دیکھا، جو ایک بار ماں بننے میں اتنی تکلیفیں اٹھا چکی تھی اور اب دوبارہ اس زندگی کی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی کس قدر پر سکون تھی۔

سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو رہا تھا، مگر ہر بات میں ایک اطمینان اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ عورت چاہے تو اپنی جان دے دے، اپنا ہر احساس قربان کر دے، مگر اس ایک نام کو جو جیون مرن کا سنگی ساتھی ہوتا ہے، کڑے سے کڑے دکھ میں بھی نہیں بھولتی۔ اب شاداں کا وہ الھڑپن اور بچپنا پھر لوٹ آیا تھا۔ اور وہ تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی۔

"شیرے۔ شیرے۔ مرگئی — ہائے۔ آہ۔"

شیرا باہر کھڑے کانپ رہا تھا۔ کانپے جا رہا تھا۔ اس کے اصرار پر شاداں نے جھینپتے، شرماتے سب کچھ بتا دیا تھا کہ اس رات اس پر کیا کیا بیت گئی تھی" آج وہ پھر اسی راستے سے گزری ہے۔"

چیخیں رکیں۔ رات کے سناٹے میں اور اضافہ ہو گیا۔ کوئی شیرے کے کان کے پاس سے سرگوشی کرتا گزر گیا۔

"میرے مولی اب کی بار مجھے چاند کی صورت دکھانا تاکہ اس کی وجہ سے سارے میں اجالا ہی اجالا پھیل جائے۔" یہ یقیناً شاداں کی آواز تھی جو کراہتے کراہتے بھی دعا مانگے جا رہی تھی۔

"اے خدا! اے مولی۔! میرے پیار کی آگ کو جلتا رکھیو۔"

سناٹا ٹوٹا اور تیز تیز چیخیں در و دیوار سے ٹکرانے لگیں۔ اسی دم ساس کی خوشیوں سے بوجھل آواز، جس میں آنسو بھی بھرے ہوئے تھے۔ تیرتی آئی۔

"ارے شیرے۔! ارے سنتا ہے! تجھے بیٹا ہوا ہے۔ تیرے باپ نے دوبارہ جنم لیا ہے! ہاں دیکھ تو۔!"

شیرا شیر کی سی تیزی سے لپکا اور دروازہ بھڑ بھڑا کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں ایک مدھم سا دیا جل رہا تھا، مگر جب اندر داخل ہوا تو دیکھا زمین پر اس جگہ جہاں شاداں کا چہرہ تھا۔ کئی چراغ، کئی چاند، کئی سورج ایک ساتھ جھلملا رہے تھے۔ یہ ممتا کی روشنی۔ وہ ضیا، وہ تابناکی وہ مقدس آگ تھی جو اور کسی کے نہیں ایک ماں کے چہرے پر ہی جل سکتی ہے۔ شیرا اس بے پناہ روشنی سے خائف سا ہو گیا اور دبے پاؤں یوں جیسے عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہیں دھیرے سے جھک کر بولا۔

"شاداں۔ میرے بیٹے کی ماں۔!"

شاداں کے آس پاس نور کا وہ ہالہ روشن.... اور روشن ــــ اور روشن ــــ اور روشن ہو گیا اور وہ دھیرے سے گنگناتی ہوئی بولی۔

"شیرے پھر سے کہو۔ میرے بیٹے کی ماں۔ میرے بیٹے کی ماں۔ میرے بیٹے کی ماں۔ ہاں میں تمہارے بیٹے کی ماں ہوں"

بیٹا ماں باپ کی اسی خوشی سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا اس لئے تیز تیز رونے لگا۔ شاداں تڑپ کر بولی۔ "ہائے اُسے سردی لگ رہی ہو گی۔!"

"سردی! یہاں کہاں کی سردی؟" شیرا حیرت سے بولا۔

"تم تو سمجھتے ہی نہیں۔ ماں کے پیٹ کی گرمی کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ روئی کا گدیلہ کہاں رکھ دیا ماں نے۔؟ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی۔

شیرا ہنس کر بولا۔ "ماں تو گاؤں بھر میں نیوتہ دینے گئی ہے۔ ٹھیر میں دیکھتا ہوں"۔

دوسرے کمروں۔ کونوں میں گدیلہ نہ پا کر شیرا پھر شاداں کے پاس آیا تب چیخ پڑا۔

"یہ کیا؟ اری یہ کیا کرتی ہے شادو۔؟"

شاداں، جس نے ابھی ابھی، چند لمحوں پہلے بچے کو جنم دیا تھا۔ دھیرے دھیرے

قدموں سے چلتی ہوئی کونے میں، طاق ہیں روئی تلاش کر رہی تھی۔

" اتنی جلدی نہیں چلا کرتے شادو۔ ماں دیکھے گی تو غصہ ہو گی۔ تو اتنی کچی زچہ ہے، بگاڑ ہو جائے گا۔"

شاداں نے گھوم کر اپنے بیٹے کے باپ کو دیکھا۔ ہاتھ اونچا کر کے طاق سے روئی کی تہیں نکالتی نکالتی بولی۔

" شیرے، عورت جب ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے تو آسمان اور زمین کی ساری طاقتیں اس کے سامنے جھک جاتی ہیں۔ اب میں کمزور نہیں۔ اب۔ اب۔" وہ لال لال سے کپڑے کی طرف غرور سے دیکھتی ہوئی بولی۔ " اب میں تیرے بیٹے کی ماں ہوں!"

شاداں ہنس کر بولی۔ " ہاں شیرے بیٹے کا نام سوچا۔؟ "

" بیٹے کا نام۔؟ بیٹے کا نام۔؟ " شیرا منہ ہی منہ میں سوچنے کی خاطر گنگنا گنگنا کر بولنے لگا۔ " بیٹے کا نام؟ بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے تیس مار خاں رکھ دے۔"

شاداں ہنسنے لگی۔ " واہ، کیا نام بھی سوچا بھئی دل لگی مت کرو۔ سچ مچ اچھا سا نام سوچو، ہاں۔"

" پر کچھ سمجھ تو پڑے۔"

" واہ اپنی بیٹی کے وقت سمجھ پڑا اور اب میرے بیٹے کی بار عقل سو گئی۔"

" اچھا" شیرے اس کے پاس گھس کر بولا۔ " یہ تقسیم کب سے کر لی۔ بیٹی میری اور بیٹا اپنا۔!"

شاداں محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ " یہ تمہارا ہی چھوٹا سا روپ ہے۔ میرا دل ہے۔ یہ تو میرا ہی ہے۔"

شیرے نے، باندی کو گلے سے لگا لیا۔ " اس میں مجھے تیری ہی من موہنی شکل دکھائی پڑتی ہے۔ سچ مچ یہ میری ہے۔"

شاداں خوشی سے پاگل ہو کر بولی۔ " تم نے بیٹا مجھے دے دیا نا ؟ "

" بالکل۔! "

شاداں سنجیدہ ہو کر بولی۔ " تو یہ حق بھی میرا کہ جو نام چاہوں رکھوں "

اس کی سنجیدگی پر شیرا ہنس کر بولا۔ " اری پگلی تو اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہوئی؟ "

وہ گیلی گیلی آواز سے بولنے لگی۔ " تو میں اس کا نام بادل رکھ رہی ہوں "

" ارے واہ رے بادل خاں " شیرا ہنستا جاتا اور بولتا جاتا۔ " واہ ری میا،

خوب نام دیا پتر کو۔ بادل خاں "

شاداں جھلا کر بولی۔ " نہ رکھو، خود ہی سوچ لو۔ "

اب شیرا سنجیدہ ہو گیا۔ " مگر ذرا تو سوچ ری یہ کیا نام ہوا؟ بھلا کہیں بادل

بھی رکھنے جیسا نام ہوا۔؟ ایسا ہی ہے تو چاند رکھ لے۔ "

شاداں پڑھی لکھی عورتوں کے انداز سے بولی۔ " چاند تو اجالا پھیلاتا ہے اس لئے

چاند کہلاتا ہے۔ سو چاندنی نے یہ نام حاصل کر لیا۔ بانجھ پن کی وہ گھور تاریکی تو اسی نے

دور کر دی نا۔ تم نہیں جانتے بادل پیاسی دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے۔ یہ ننھا بچّہ بادل بن کر

مجھ پیاسی زمین پر برسا اور جیون بھر کے لئے میری پیاس بجھا گیا۔ بھلا بولو تو یہ بادل نہ ہوا تو پھر کون

ہوا۔؟ "

شیرے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اتنی ذرا سی تو تھی شاداں مگر کبھی کبھار ماں سے

بھی زیادہ بوڑھی اور عقل مند نظر آنے لگتی تھی۔

" واہ رے میرے بادل خاں " شیرے نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور گھوم

گھوم کر بولنے لگا۔ " واہ رے بادل خاں ارے واہ رے میرے....... "

چاندنی اور بادل، بادل اور چاندنی گھر بھر کی زندگی کا سامان بن گئے۔

چنا ماں بدلو سے سال بھر بڑی تھی۔ مگر سال بھی نہ گزرا تھا کہ بدلو اسے پیچھے چھوڑ گیا۔ ساتھ ساتھ ہونے تو بدلو بڑا نظر آتا۔ اور چنا چھوٹی۔ ماں کو تو سبھی اولاد ایک جیسی پیاری ہوتی ہے، پھر بھی بدلو شاداں کا دل تھا۔ جو سدا اس کے پہلو میں دھڑکتا رہتا تھا کبھی چوٹ بدلو کے لگتی تو خون اس کے نکل آتا۔ بیمار وہ پڑتا، گوشت اس کے گھسنے لگتا۔ ہنستا وہ زندگی اس کی لمبی ہو جاتی۔ ماں کی توجہ اور بے پناہ پیار نے اسے سوجی جواری بھر اتھیلا بنا دیا۔ پھد پھد سارے میں بھاگتا پھرتا۔ چنا کے سال بھر بعد ہی بدلو چلا آیا تھا۔ اس لئے چنا نے ایک سال بھر ہی دودھ پیا۔ بدلو کوئی چار سال مسلسل ماں کا دودھ پیتا رہا۔ ساری دنیا کی کھلائی پلائی۔ پھل میوے ایک طرف اور ماں کے دودھ کی طاقت ایک طرف۔ بدلو بہن سے ہاتھ بھر اونچا نکل آیا۔ ماں باپ اور دادی۔ تینوں کے دلارے دو ننھے منے وجود۔ ان میں بدلو زیادہ پیارا تھا کہ بیٹے کی جون میں پیدا ہوا تھا اور ماں کا ایسا دلارا کہ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی مسرت اسی کے وجود کی مرہون منت ہو کر رہ گئی بھینس دوہ کر اٹھتی تو شاداں اسے یونہی کچا کچا تازہ دودھ پلا دیتی۔ ابال کر اٹھتی تو ساری اوپر کی بالائی کھلا دیتی۔ اتنے دنوں سے وہ ساری دنیا سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ سب اسے ناک سے ہناتے تھے۔ اب وہ ایک بیٹے کی ماں تھی اس سے کیسے پیار نہ کرتی۔؟ اپنی زندگی بھی وار دیتی تو کم تھا۔ بھولے بسرے کبھی شیرا آ سے گھر کی دے دیتا تو منہ دیکر بات نہ کرتی۔ ایک بار ایسے ہی کسی بات پر الجھ کر باپ نے ایک ٹھونگ مار دی' شاداں نے تین دن کھانا نہ کھایا۔ وہ تو اس کی آنکھ کو پھوڑ ہی ڈالتی جو اس کے بدلو کو ٹیڑھے پن سے دیکھتی چاہے وہ کوئی بھی ہوتا۔

(۲)

لڑکیاں خود رو جنگلی بیلوں کی طرح بس لپکی پڑتی ہیں بڑھی چلی جاتی ہیں۔ چنا بھی لڑکی ہی تھی اور یونہی بڑھ رہی تھی۔ مگر بدلو لڑکا ہو کر بھی دھیرج سے کام نہ لے رہا تھا۔

بڑھا جا رہا تھا۔ دونوں آگے ہی آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ بڑھتے بڑھتے جیسے چنا کے پاؤں تو کسی نے یوں ہی روک لئے۔

"بس بیٹی بس، لڑکی ذات کو یوں کد کڑے نہیں لگانے چاہئیں"۔ مگر بدلو کو کون روکتا۔؟ بہت دور جا کر انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

"ارے! اس دوڑ نے بھاگنے میں ہم نے کچھ سوچا ہی نہیں، اتنی جلدی ماں بوڑھی کیسے ہوگئی۔؟"

ادھر عمر کے اس پار شاداں کھڑی تھی۔ ملگجے سفید کالے بال! کاٹھی جو کسی زمانے میں تنی ہوئی رہی ہوگی اب ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں جیسے انگڑائی لینے کے بعد کوئی ڈھیلے چھوڑ دے سخت، مضبوط اور گول گول چھاتیاں، جس کا رس پیتے پیتے اب بدلو اور چنا یوں جوانی کے موڑ پر کھڑے مڑ مڑ کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ نیچے کو ڈھلک پڑی تھیں۔ اور آنکھیں، ہاں آنکھیں تو اب بھی یونہی تاروں کی طرح چمکتی تھیں ان میں بدلو جو چھپا ہوا تھا۔ بدلو۔ بدلو۔ میرا اپنا ہی بدلو۔! جیون کے کسی ایسے ہی کڑے موڑ پر شیرا چپکے سے ہاتھ چھڑا کر چلتا بنا۔ عورت کا سہاگ لٹ جائے تو دنیا میں کیا رہ جاتا ہے۔؟ آنسو اور صرف آنسو جو رات کے اندھیروں میں تکیوں کو بھگوتے ہیں اور دل کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ مگر ایسے میں بھی بدلو کا وجود اس کے لئے مانجھی بن گیا۔ تجربہ کار مانجھی، جو طوفان کے ہوتے بھی صاف اپنی نیا کھے لے جائے۔

اس دن شاداں صبح ہی بھینس دوہ کر اٹھی تو اچھ کر بیٹی سے بولی۔ "باندو برابر کی بیٹی دیکھو اور کام کی نہ دھام کی۔ محلے والی کلثوم کو بھی دیکھا ہے؟ ماں کا کتنا ہاتھ بٹاتی ہے"۔

"تو تو کبھی بھولے میں میرا نام نہیں لیتی۔ بھلا بھیا ایسا کون پہاڑ لڑھکاتا ہے۔؟" وہ گنا چوستے چوستے جھٹ سے بولی۔

بھیا کا نام سنکر شاداں کی آنکھوں میں محبت لہرا گئی۔

"وہی پیٹ پال رہا ہے۔ تیرا کیا ہے، آج رہی کل چلی۔ تو کہاں اسکی برابری کر لیگی۔"

"اونہہ! تو تو یونہی اپنے بیٹے کی تعریف کرتی رہتی ہے۔ کھیتوں پر آدھا وقت کام کرتا اور آدھے وقت تو گھڑیاں گنتا رہتا ہے۔"

(پچھواڑے کے پودے پر سنہری پھول اسی بہار سے جھوم رہے ہیں)

شاداں چونک کر مڑی۔ "کیا کہا۔؟ کس کے لئے گھڑیاں گنتا ہے۔؟"

"تجھے کیا معلوم؟ مگر کبھی جا کر دیکھ تو سہی، ہو گی کوئی نہ کوئی۔"

شاداں کے منہ پر ہلکی سی غم بھری ہنسی بکھر کر رہ گئی۔

بہاریں آتی ہیں، ان کے پیچھے پیچھے خزاں۔ ہرے ہرے، پیلے پیلے پتوں کی یہ آنکھ مچولی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ہرے پتے پیلے ہو کر نیچے گرتے ہیں، پھر پیلی پوشاک سرخ اور ہرے ملبوس سے بدل جاتی ہے۔ پھر وہی بہار، وہی خزاں، وہی خزاں اور بہار کا آنا جانا دنیا کتنے رنگ بدلتی ہے۔ مگر پیار بھرے دل کبھی رنگ نہیں بدلتے۔ وہ یونہی دھڑکے جاتے ہیں۔ چاہے وہ شاداں ہو یا شیرا، جھناماں ہو یا رسول خاں، کلثوم ہو یا چنا۔ بیبن ہو یا سکو بوا۔ بدلو ہو یا منیرا۔ کبھی محبت بھی اپنا مقام بھولی ہے۔

گگری پٹخ کر شاداں دھیرے سے بولی۔ "جیون کی ایک بڑی ضرورت یہ بھی ہے تو کیا جانے؟"

گیہوں کی بوائی کا زمانہ تھا، بدلو جو صبح سے جاتا تو شام کو ہی لوٹتا۔ پسینے سے تربتر، منہ سرخ سرخ بال پیشانی پر جھکے ہوئے۔ شاداں کا دل اس کو دیکھ دیکھ خوش بھی ہوتا ڈوب بھی جاتا۔

"ہائے میرا لال! ساری گھرداری سنبھالے ہے۔ ہائے کھیتوں کی یہ کھڑی دھوپ اسے بیمار نہ ڈال دے۔!"

اس دن دھوپ میں زیادہ ہی تیزی تھی۔ شاداں نے جلدی جلدی ٹھلیا بھری۔ میٹھی کھٹی لسی کناروں سے چھلکنے لگی۔ چنا آنگن میں پڑے چھپر والے چولھے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی، شاداں پکار کر بولی۔

"روٹی پکنے کو ابھی دیر ہے، دھوپ تو دیکھ کیا غضب کی ہے۔ ذرا بدلو کو لسی پلا آؤں، پھر تو روٹی لے کر چلی جانا۔"

جھپاکے سے شاداں اٹھی اور ٹھلیا سنبھال چلی۔ کھیت میں پہنچ کر اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا، یہاں، وہاں۔؟ کہیں بدلو ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ للو کی جھونپڑیا کے پیچھے سے ہنسی کی آواز آئی تو جھانک کر دیکھا۔

"ہائیں ری کلثوم تو ان گنوں کی ہے۔!" وہ من ہی من میں جھلا کر بولی۔

"یہ کام کا وقت ہے یا ٹھٹھول بازی کا؟" انجان بن کر وہ دور تک گئی اور ہونٹوں کے آزو بازو ہتھیلیوں کی دیوار کھڑی کر کے زور سے چلائی۔

"بدلو—— ہوئے بدلو۔"

کھیت میں آواز گونجی اور بدلو، بدلو کہتی واپس آ گئی۔ اکدم جھپاکے سے کاسنی دوپٹہ اڑا، چوڑیاں چھنکیں اور جھکے جھکے کوئی سایہ لپک گیا۔ بدلو انجان بنا نکل آیا۔

"ماں! ارے اتنی دھوپ میں تو۔؟ میں تو یونہی جھونپڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔" وہ آنکھیں چرا کر بولا۔

شاداں درشتی سے بولی۔ "یوں کام کے وقت اندر جا کر بیٹھ جاتا ہے، بھلا کسان کی اولاد کو دھوپ سے کیا ڈر۔؟"

بدلو نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ "ماں! تجھے کیا معلوم جھونپڑی کے اندر کیسی ٹھنڈک ہے!"
"لے یہ لسی پی لے۔" ایک دم اس کی نگاہ اس کی جیب سے جا ٹکرائی۔ "یہ پھول کیوں بھر رکھے ہیں؟" وہ الجھ کر بولی۔

"ماں۔ ماں۔ یونہی۔ بس اچھے لگتے ہیں نا۔" وہ سٹ پٹا گیا۔

"شاداں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ لسی کی خالی ٹھلیا لئے جب وہ گھر جا رہی تھی تو اس کا وزن پھولوں سے بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کا دل خوشی سے اڑا جا رہا تھا۔

"کلثوم ایسی بری بھی نہیں۔ اچھی خاصی ہے۔ ہاں بس بال بے حد بڑے ہیں، اور لوگ کہتے ہیں کہ لمبے بال منحوس ہوتے ہیں۔ ہونہہ! تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟"
وہ دل ہی دل میں بدلو کو دولہا بنا دیکھ رہی تھی۔ اس کے آس پاس باجے بج رہے تھے اور تنہائی کے باوجود وہ اپنے ساتھ ساتھ برات لئے چل رہی تھی۔

اس دن چنا کانپ رہی تھی۔ اس کا رنگ جو پہلے ہی میدہ شہاب تھا اب سفید پڑ رہا تھا۔ بلکہ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ سہمے سہمے آئی اور کونے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ گھر میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ شاداں رشید چچا کے ہاں محلے کی چار چھ عورتوں کو لیکر کلثوم کو مانگنے گئی تھی۔ ڈھور ڈنگر کھیت پر تھے۔ دادی حسب معمول کھانستی پڑی تھی۔ اور گھر بھر پر ہیبت ناک سناٹا چھا رہا تھا۔

شاداں کوئی گھنٹے بھر بعد لوٹی تو خوشی کے مارے مری جا رہی تھی۔ اپنے آپ میں باتیں بھی کئے جا رہی تھی۔ "اتنا تو دیکھتے ہی ہیں کہ سارے محلے، بلکہ سارے گاؤں بھر میں بدلو اپنے نام کا ایک ہی ہے۔ کون کام وہ نہیں کرتا؟ گھر وہ سنبھالے، خط وہ پڑھے، کشتیاں وہ لڑے۔ اس دن دنگل میں منیر ے کو کیسی اینٹ دی کہ سارے میں واہ واہ ہو گئی۔

اور منیرا کیسے کھسیا گیا تھا۔ اور گلی ڈنڈے میں پالی والوں کو کیسی کھٹائی پلا دی۔ اتنے پر بھی اکڑ نام کو نہیں۔ اپنے بڑوں سے کیسے جھک کر ملتا ہے۔"

جوانی اور سہاگ کے سارے ارمان پورے ہو جاتے ہیں تو یہ ارمان بھی اپنی جگہ برا نہیں لگتا کہ پوتوں، نواسوں کے ہاتھوں اپنے سفید بال نچوائیں۔

پنکھ پکھیرو گھر کو لوٹے اور پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

شام کا اندھیرا اتر گیا۔ مگر بدلو نہ آیا۔

بہت دیر ہو گئی، اندھیرا گہرا ہونے لگا پھر بھی بدلو نہ آیا۔ شاداں نے دروازے کے باہر جا کر دو ایک بار جھانکا۔ اور پھر دل کو تسلی دے لی۔

"کھیت میں صرف یو اکی ہی تو نہیں کرتا نا۔ وہاں" اور وہ دل ہی دل میں ہنس پڑی۔

پھر شام گہری ہوئی اور رات آئی۔ رات ہلکی سیاہ تھی پھر گہری ہونے لگی۔ بدلو پھر بھی نہ آیا۔

نیلے آسمان پر تارے چٹک اٹھے مگر بدلو نہ آیا۔

چاند دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے سرکنے لگا۔ مگر بدلو پھر بھی گھر سے باہر ہی تھا۔

شاداں نے باؤلیوں کی طرح اِدھر اُدھر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ پھر وہ چلا کر چنا سے بولی۔ "تیرا بھیا کہاں رہ گیا؟ یہ تو سوچتا ماں پریشان ہوگی۔"

چنا کے دیدے پھٹے ہوئے تھے۔ ماں اس کے قریب آئی اور خوف سے بولی۔

"چنا تو بولتی کیوں نہیں۔؟"

چنا نے سارا زور لگا دیا مگر اس کی زبان نہ کھلی۔

شاداں نے اس کے بال کھینچ گال پر ایک تھپڑ لگایا۔ "منہ سے بولتی کیوں نہیں سو کیوں رہی ہے؟"

چنا پھر بھی سوئی رہی۔ ماں نے اسے کھسوٹ ڈالا۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں سمٹیں اور زبان کھلی۔

"ماں! بھیا اب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ توندی میں بہہ گیا ماں۔"

"چنا!" ماں اتنی زور سے چیخی کہ آنگن کے پیڑ پر بیٹھا کوئی پنچھی پر پھڑپھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

"ہاں ماں۔" اب چنا بغیر رکے، مشین کی طرح، جذبات سے خالی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ منیرے اور بھیا میں کسی بات پر نوک جھونک ہوئی اور پھر دونوں میں چل گئی۔ کبھی بھیا اٹھا کر منیرے کو پٹخے کبھی منیر ابھیا کو دے مارے۔ جانے کتنی دیر اور یہی ہوتا رہا۔ میں نے تو گھبرا کر آنکھیں ہی بند کر لیں ماں۔ مگر جب۔ جب آنکھیں کھولیں تو۔ تو وہ بہا جا رہا تھا ماں۔!

"جب سے کشتی میں بھیا نے منیرے کو اپٹ دی تھی تب سے وہ اس کی جان کا لاگو ہو رہا تھا ماں۔ آتے جاتے اس سے لڑائی کے بہانے نکالتا تھا۔ اور بھیا طرح دے جاتا تھا۔ مگر آج تو دور سے دیکھ کر کلثوم کا نام لے کر چھیڑنے لگا۔ ایسی ہی کوئی گندی بات کہی بھیا کو غصہ آگیا سہن نہ کر سکا۔ دونوں میں وہ لڑائی ہوئی کہ میرے جسم کا بال بال کھڑا ہو گیا۔ بھیا کیا اس سے ہارنے والا تھا۔؟ مگر اس کمین نے، مولی اسے جوان ہی دنیا سے اٹھائے۔ ایسا پتھر سر پر مارا کہ وہ چکرا ہی گیا۔ میں جھاڑ پر چڑیوں کے انڈے اتارتے بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر تو مر ہی گئی۔ آنکھیں بند نہ کر لیتی تو گھبرا کر زمین پر ہی آپڑتی۔ بڑی دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو......"

پہلی بار اس کی آواز کانپی۔ سر سر گھسرتے الفاظ رک گئے اور وہ چیخ کر رو پڑی۔

"تو وہ زخموں سے چور چور تھا۔ منیرے نے اسے پھینک دیا ماں۔ اس کی جان لے لی۔

ہائے وہ مرجائے۔ کتے بھی اس کی لاش کو نہ اٹھائیں، دنیا کا کوئی سکھ نہ دیکھے۔!"
تارے اِدھر سے اُدھر ہونے لگے۔ پھر ویسی ہی جگمگاتی صبح نمودار ہوئی جیسی بدلو
کی پیدائش کے دن ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے شاداں کے بال لہرائے تو چنانے دیکھا
کہ اس کے سارے بال روئی ایسے سفید ہو رہے ہیں! تیزی سے گھر گھر چلتی وہ خیالات
کی چکی رکی اور شاداں کی آنکھ جھپکی تو دیوار پر ٹنگے چھرے سے جا ٹکرائی، جس سے
شیرا ہر بقر عید پر بکرے ذبح کرتا تھا۔

"مجھ پر دانہ پانی حرام ہے۔" وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔
صبح گزری، سہ پہر، شام، رات اور پھر صبح۔ دنوں اور راتوں کا چکر چلتا رہا
کوئی تین چار دنوں بعد شاداں واپس آئی، چھرا اس کے ہاتھوں میں لٹک رہا تھا
سفید بالوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ کپڑے ڈھیلے ہو کر نیچے کو آپڑے تھے۔ اس نے چنا
سے ڈپٹ کر پوچھا۔

"وہ سوّر کا جنا کدھر گیا تھا، تجھے معلوم ہے۔؟"
"مجھے نہیں معلوم ماں۔ میں تو ڈر کے مارے پتوں میں یوں چھپی بیٹھی تھی کہ کسی کو نظر
بھی نہ آسکوں۔ پتوں کے بیچ سے میں نے دیکھا تو ضرور تھا پھر دور تک نہ دیکھ سکی کہ کہاں چلا گیا۔"
شاداں بالکل ہی دیوانی بن کر رہ گئی۔
راتوں کو گھر سے نکل جاتی اور دن کو کھیتوں کھیتوں خاک چھانتی پھرتی۔ جانے
میرا اس کی کوکھ میں آگ لگا کر کدھر مر کھپ گیا تھا۔ شاداں کی کمر سے یونہی چھرا لٹکتا
رہتا۔ گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ بدلو کہاں چلا گیا۔ سب یہ سمجھے کہ شہر بھاگ گیا۔ شاداں
کی حالت دیکھ کر لوگ زہر بھری باتیں بدلو کو سناتے۔
"ماں کو دیکھو کہ آنکھ کی پتلی بنائے رکھا۔ اور اولاد کو دیکھو کہ اڑنے کو پر ہوئے تو پھر سے اڑ گیا۔"

شہر کی ہوا ہی ایسی ہوتی ہے کہ ماں کی محبت ہی بھلا دے۔ کچھ تو خیال کرتا۔"

شاداں دیوانی کسی کی بات کا جواب دیتی نہ کسی سے اپنا غم بتاتی اپنی ہی دھن میں مگن رہتی۔

اتنے دن گزر گئے کہ گیہوں کی سنہری بالیاں ہواؤں سے لہرا کر سارے میں سوندھی سوندھی لپٹیں اٹھانے لگیں۔

شاداں سچ مچ دیوانی بن گئی۔ اپنے آپ میں ہنسے جاتی۔ گاؤں کے ہر جوان کو روک کر اس کی صورت دیکھتی، لوگ دکھ سے بولتے۔

"نامراد اپنے بدلو کو کھوجتی ہے۔"

مگر نامراد بدلو کو نہیں، منیرے کو کھوجتی تھی کہ ایک ہی وار میں اپنے دل کی ساری پیاس بجھا ڈالے۔

اس رات پونم کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ گاؤں کی فضائیں تو یونہی صاف ستھری، دھلی دھلی سی ہوتی ہیں۔ اس دن تو چاند تھا پونم کا اور رات تھی بہار کی۔ تارے چم چم چمک رہے تھے۔ ہوائیں جو چل رہی تھیں تو جیسے شہد میں گھلی گھلی۔ ندی پار سے گاتی جھومتی ہوائیں اپنے ساتھ کچی فصلوں کی خوشبو بھی اڑا لائی تھیں۔ شاداں کھیتوں میں، درختوں کی آڑ میں جھونپڑوں کی اوٹوں میں، ادھر ادھر یہاں وہاں کھوجتی پھر رہی تھی کہ کہیں تو منیرا ملے گا آج کی رات تو وہ رات تھی کہ بس پیا ملن کے لئے ہی بنی تھی، آج تو ہر راز عریاں ہو جانے کی سی رات تھی۔

شاداں پیڑ کی آڑ تلے تھکی تھکی کھڑی تھی۔ نیم نیچے دو بالیاں باتیں کرتی گذر رہی تھیں۔

"منیرا نہیں آیا۔؟"

ہنسی، شرم اور محبت سے ملی جلی۔ "اس کے باپ نے شہر بھیج رکھا تھا۔ آج ہی لوٹا ہے۔"

"ہوں۔ تبھی گالوں پر پھول چمک رہے ہیں۔ نا۔؟"

"پھر وہی ہنسی۔

" اچھا رابعہ، کبھی وہ نہیں آیا تو۔؟ تو تُو کیا کرے گی۔؟"

" کیا کروں گی۔؟ ساری رات کھڑی رہ کر انتظار کروں گی۔ جب چمکتا چاند اِدھر سے اُدھر ہو جائے گا تب تو وہ آئیگا اس انتظار میں بھی کتنا مزہ آتا ہے کہ بالم کی راہ دیکھی اور وہ نہ آیا۔ اور جب تڑپا کر لا کر آیا تو سینے سے سر ٹکا دیا، سارے گِلے ڈھل گئے۔ ہاں وہ ضرور آئیگا۔"

اتراتی میں املی کا گھنا پیڑ اپنے پتے سن سنا رہا تھا۔

چھنتے ہوئے اندھیرے اجالے سے شاداں سر جھکائے گزر رہی تھی کہ سامنے ہی سوکھے پتے چرچرائے اور کوئی سایہ آگے بڑھا۔ شاداں کا دل اچھل پڑا۔

"منیرا۔!"

وہ بلی کی پھرتائی سے لپکی اور اس کے راستہ میں آگئی "تو نے ہی میری کوکھ اجاڑی ہے نا۔؟"

منیرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اتنی بڑی حقیقت کو وہ کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر سن پڑ گئے۔ شاداں نے چمکدار چھرا نکالا اور زور سے سر کے اوپر گھما کر نیچے لا ہی رہی تھی کہ اکدم اس کی نگاہ ٹھٹک گئی۔ منیرے کی جیب سے سنہری پھولوں کی کلیاں جھانک رہی تھیں۔

اکدم شاداں جوان ہو گئی، سفید بال سیاہ ہو گئے چہرے کی جھریاں مٹ گئیں۔ بازو صحت مند اور قد تن گیا۔ آنکھوں میں جگ مگ جگ مگ چراغ جلنے لگے۔ وہ نیم کے نیچے کھڑی شیرے کا انتظار دیکھ رہی تھی۔ بڑی راہ دکھا کر شیرا آیا تو وہ بلکتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

" نروئی کہیں کے! میرے دل کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں۔؟" چھرا اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔

تہہ خانہ

گورے گورے ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔

بڑے سے تھال میں گیہوں کا آٹا بھگوئے ذکیہ بی ٹکی لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا بدن جھٹکے کھا رہا تھا۔ کھڑے گلے کے کرتے میں سے گلابیاں امڈی پڑ رہی تھیں۔ راشد میاں کو شرارت سوجھی، ایک کنکر اٹھا کر پھینکا جو سیدھا ان کے گلے میں سے ہوتا ہوا کسی نشیب میں جا بیٹھا۔

"اے واہ، ذرا سی لاج بھی نہیں آتی۔!"

میاں اشارے سے بولے۔ "لاج کیسی۔؟"

"ادھر اماں جان بیٹھی ہیں۔ نظر نہیں آتیں کیا۔؟" انھوں نے اشارے میں جواب دیا۔

اب کے راشد میاں زور سے بولے، ہنسی منہ پر بکھری ہوئی۔

"دکیوں جی اگر ہمیں۔"

ابھی ان کی بات منہ میں ہی تھی کہ پچھواڑے کے دروازے سے دھڑ دھڑ کرتے تینوں بچے داخل ہوئے۔ خوشی سے ان کے منہ تمتما رہے تھے۔ منّا وہیں سے چلّا کر بولا۔

"اجی اماں جی۔! اجی ابا جی! بلی نے بچے دیئے ہیں۔"

شانو نے آواز میں آواز ملائی۔ "ہاں ابا ہم نے خود دیکھے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔ بے بی بھلا کسی سے پیچھے کیوں رہتی۔؟" ہاں ابا چھب کے چھب گلابی گلابی ناک کے ہیں۔"

"سچ۔؟" راشد میاں بھی بچوں میں بچہ بن گئے۔

"ہاں۔ہاں۔" تینوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔

"آپ خود چل کر دیکھئے ابا۔ اتنے پیارے ہیں۔ہم نے دور ہی سے دیکھا ہے، ورنہ بلی تو نوچ ڈالے گی۔"

راشد میاں کے چہرے پر بھی بچوں کی سی خوشی کھیل رہی تھی۔

"اچھا اچھا چلتے ہیں بھئی۔ مگر جو بلی مار بیٹھے۔؟" بچوں کو خوش کرنے کے لئے وہ خواہ مخواہ بزدلی دکھا رہے تھے۔

"وہ نہیں مارے گی ابا۔ ہم کوئی چھیڑتے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ہم تو ایک والا سے لیں گے۔ جو پیلا پیلا ہے۔" شانو نے سب سے پہلے قبضہ جمالیا۔

"اور ہم وہ کالے دھبوں والا، ہاں۔" منے نے بھی حق جتادیا۔

"اور پھر ہم کیا لیں گے۔؟"

"بلی جو تمہاری ہے۔ راشد میاں نے فیصلہ کرنا چاہا۔

"ہش۔" پھر وہ غصے سے بولی۔ "اتی بڑی بلی ہم نہیں لیتے۔"

آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ راشد میاں ہنس کر بولے۔

"ارے بھئی ابھی سے تو نہ لڑو۔ ابھی انھیں ذرا بڑا تو ہو لینے دو۔"

ہنستے بولتے سب کے سب دروازے سے نکل گئے۔

ذکیہ بی کے ہاتھوں میں اب تک آٹا الجھا ہوا تھا۔

"ہونہہ! کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کم بخت بلی کو بھی اسی وقت بچے جننا رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی کیسے ہیں کہ بچوں میں بچہ بن جھٹ اٹھ کر چل دیئے۔" ذکیہ بی بی کا جی جل کر رہ گیا۔

ساس نے ادھر سے برچھی چبھوئی۔ "اے میں کہوں اب روٹی پکے گی یا یونہی آٹا ملتی رہو گی۔ روٹی کی بجائے سوّیاں اتارنے کا تو ارادہ نہیں ہے؟؟"

ذکیہ بی نے تلملا کر ساس کو دیکھا۔ "کبھی آپ لوگ بھوکے رہے ہوں تو کہئے نا۔ آپ کو تو وقت پر کھانا مل جائے گا۔"

میاں گودام سے نکلے تو بچے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ بے بی مارے اترا ہٹ کے کندھے پر چڑھ بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر باپ کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔

"اور ابا جی نے اسے پکارا تو بلی تک نہیں۔ پہلے تو موتی بولتے ہی بھاگی آتی تھی۔"

"اور ہاں ابّا۔" شانو بولا۔ "آپ نے پچ پچ کیا مگر وہ تو ویسی ہی بیٹھی رہی جیسے اللہ جانے کون بلاتا ہو۔ کتّی بری ہے سالی۔!"

"ارے ارے! یوں گالیاں نہیں دیا کرتے ننھے بچے۔"

باپ نے پچکار کر کہا۔

"تو پھر وہ آئی کیوں نہیں۔؟"

"بھئی اب وہ ماں بن گئی ہے نا۔ اب اسے ہم سے زیادہ اپنے بچوں کا خیال ہو گا۔ اب وہ کیا ہماری بات سنے گی بھلا۔؟"

میاں نے تو بچوں سے سرِ راہ یہ بات کہہ دی مگر یہ تیر سیدھا ذکیہ بی کے دل میں جا کر اٹک گیا۔ پار نکل جاتا تو اتنی کلپ نہ ہوتی، مگر وہ تو وہیں چھدا رہ گیا۔ دھوئیں کے بہانے انھوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھا تو ساس نے دیکھ لیا۔

"دوئی اپنی کوکھ تو بھرتی نہیں، موئے نااصل بلّی کتّوں کا بھی حسد نہ چھوٹا۔"

بہو نے تڑپ کر ساس کو دیکھا، مگر وہ اپنی کرتی کی تُرپائی کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سب کے سب گودام کی طرف بھاگے۔ اور تو اور

اب کے راشد میاں نے ذکیہ بی کو بھی گھسیٹ لیا۔

"ذرا دیکھنا تو کتنے پیارے بلونگڑے ہیں۔"

ادھر سے اماں چلائیں۔ "وہ ئی کیا کام کے موئے! اٹھا پھینکو۔"

"ارے واہ! اماں بی یہ خوب سنائی آپ نے۔" وہ ہنسنے لگے۔ "بھلا اتنے ذرا ذرا سے بلونگڑے مر نہ جائیں گے۔؟"

"اے تو کیا گلے میں باندھ کر لٹکاؤ گے۔؟ ابھی چار دن کو بڑے ہوں گے تو جگہ جگہ گو موت کرتے پھریں گے۔ خواہ مخواہ گندگی ہو گی۔"

"منا جھٹ بول اٹھا۔" واہ! بلی گندگی کہاں کرتی ہے۔؟ بیچاری پہلے تو گڑھا کھودتی ہے اور پھر اس میں......"

دادی نے پوتے کی بات کاٹ دی۔ "اے بٹیا! تو پھر بستروں میں سلاؤ۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔؟"

"یہ اماں تو بس سدا یونہی کہتی پھرتی ہیں۔ چلو ذکا۔" بچے تو بچے تھے، میاں بلونگڑوں کو دیکھ کر یوں اچھل رہے تھے جیسے سب سے چھوٹے بچے یہی ہوں۔ بلونگڑے چپس چپس دودھ پی رہے تھے۔ بند آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ماں کی گرم گود میں گھسے جا رہے تھے۔ بلی یوں مطمئن تھی جیسے اب دنیا کی کسی چیز کی حسرت باقی نہ رہ گئی ہو۔

"ارے بلی کے لئے دودھ لائیں ہم۔؟ بھوکی ہو گی۔" اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر منا اندر دوڑ گیا۔ طشتری میں دودھ لے آیا اور بلی کے سامنے آہستگی سے رکھ کر بولا۔

"لے، پوسی، پوسی، پوسی، لے لی لے۔"

بلی نے بیچ بیچ سن کے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور دوسرے ہی لمحے پھر بند کر لیں۔

"شاید گرم چائے پر دل چاہ رہا ہو گا اس کا۔" اب کے سے شانو میاں دوڑ گئے۔

چینی کی طشتری میں چائے لاکر اس کے سامنے رکھی اور بڑے پیار سے پچکار کر بولے۔

"لے موتی، یہ چائے پی لے۔"

موتی نے پچپاتی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔

"ہش۔ وہ تو پراٹھا کھائے گی۔" بے بی اندر دوڑ گئی۔ اور مٹھی میں نرم نرم پراٹھا دبائے بھاگی آئی اور بالکل اس کی ناک میں پراٹھا گھسیڑ دیا۔

پوسی نے حد درجہ ناگواری سے بے بی کو دیکھا۔ (کوئی طریقہ ہے کھلانے کا)

بچوں پر ذرا مایوسی چھاگئی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں کھاتی جی ابّا۔"

ابّا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔" وہ ماں بن کر ہر چیز سے بے نیاز ہوگئی ہے بیٹے۔ اولاد کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔" بلی نے آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا، اپنی جگہ سے ذرا ہلی اور بچوں کو اپنے نیچے کرلیا۔ پیلے بلونگڑے کی ذرا سی کمر نظر آرہی تھی۔ پوسی بڑی محبت سے اس کی کمر کو اپنی زبان سے چاٹنے لگی۔

بچے بد دل ہوگئے۔ پھر سے وہی سوال دہرانے لگے۔

"یہ کچھ کھاتی کیوں نہیں ابّا۔ ؟"

"بھوک نہ لگی ہوگی۔" راشد میاں کو خود کوئی معقول جواب نہ سوجھ رہا تھا۔

"ارے واہ! بھوک کیسے نہ لگی ہوگی۔؟ روز تو جب پوسی پوسی کرکے بلاتے تو بھاگی چلی آتی تھی۔ آج کیا ہوگیا۔؟ روز تو جب تب دسترخوان پر دھنکاری جاتی تھی اور آج تو کھانے کو سونگھتی بھی نہیں۔"

"ارے اسے گوشت کھلانا چاہیئے۔" منا پھر دوڑا اور ہاتھ میں کچے گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ اٹھائے آیا۔

"اب تو کھائے گی سالی۔!" اس نے جوش میں آ کر کہا۔

"پھر وہی گالی۔!" راشد میاں کبھی تربیت سے غافل نہ رہتے۔ مگر منّے نے اپنی گرمجوشی میں ان کی تربیت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور عین بلّی کی بند آنکھوں کے سامنے ٹکڑا یوں لٹکایا کہ ناک سے چھونے لگا۔

بلّی نے ہلکی سی کسمساہٹ کی، اپنی جگہ سے اٹھی اور دوسری کروٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں بلونگڑے دوسری طرف سے دودھ ڈھونڈھنے لگے۔

"آج تو وہ کچھ نہ کھائے گی۔" راشد میاں ہنس کر بولے۔ "اب اسے بچّوں کے سامنے کوئی چیز نہیں بھاتی۔"

ذکیہ بی کو اپنا دل پہلو میں کٹتا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے گودام سے نکل گئیں۔ گھر کی ہنستی بولتی فضا میں جیسے رکاوٹ آ گئی۔ مگر صرف ذکیہ بی کی حد تک۔ دل اندر ہی اندر جیسے کٹا جاتا۔ ادھر گھر میں تو جب دیکھو تب پوسی اور بلونگڑے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ میاں باہر سے آتے تو بچے ہاتھ پکڑ کر سیدھے گودام میں دوڑ جاتے۔ بچّے اسکول سے لوٹتے تو بستے بغل میں لٹکے ہی ہوتے اور بلّی کا طواف شروع ہو جاتا۔ ذکیہ بی کے دل میں جیسے گرہ پڑ گئی۔

"بچہ بھی دنیا میں کیا نعمت ہے۔ چاہے انسان کا ہو، جانور کا ہو سب اسی کو گھیرے رہتے ہیں۔" اپنی خالی کوکھ کا خیال آتا تو اللہ میاں پر غصہ آنے لگتا۔

"محلے میں جس کو دیکھو کمر پر کالا پیلا بچہ چڑھائے پھرتی ہے گھر بھرے پڑے ہیں اور کھانے کو دانہ دنکا تک نہیں۔ خود میاں کو تین تین ہیں۔ میری بھی گود بھر دیتا تو کیا جاتا خدا کا۔؟"

راشد میاں بڑے دل والے، بڑی محبت والے میاں تھے۔ ذکیہ بی کی خالی گود پر

انہیں کبھی اعتراض نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیوں۔؟ اللہ نے انھیں تو آل اولاد سے خوش ہی خوش رکھا تھا۔ سُونے آنگن کو تین تین بچوں کی چیخ و پکار خاصا آباد کر دیتی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عورت ہونے کے ناطے خود بی ذکیہ ہی ایک ننھے منے وجود کے لئے ترستی تھیں۔ شادی کو چھ سات سال تو ہو ہی چکے تھے۔ کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے مگر سب جی کے جی میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔ سوت کے تین تین بچے تھے مگر انھیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگتی تھی۔ اپنے ہوتے تو کلیجے سے لگائے پھرتیں۔ مگر اب تو ان کی ہنسی، ان کی چیخ و پکار جیسے کانوں میں چھید ڈالتی۔ بات بے بات دھتکارا کرتیں، خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصّہ۔

پہلے پہل شادی ہوئی تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے سمجھے کہ ہماری ہی ماں ہوگی مگر پہلی ماں ایسی تھی کہ بھول سے بھی پھٹکار نہ کرتی۔ غصے کی حرکت پر بھی پیار کرتی اور پیار کی حرکت پر بھی پیار ہی کئے جاتی۔ بھول سے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی۔ ایڑیاں گھس گھس کر جو ضد کی پوری کردی۔ وہی اماں اب کیسی ہو گئی تھیں کہ دیکھتے ہی آنکھوں میں خون اتار لیتیں کہاں تو وہ پیار دلار اور کہاں یہ روز روز کی پھٹ پھٹکار۔ بچے ہی تو تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ ماں سے کٹے کٹے رہنے لگے۔ دن بھر میں دو چار باتیں کر لیتے تو کر لیتے۔ ورنہ تینوں آپ ہی روٹھتے بھی منتے بھی۔ بہت ہوا تو شام کو باپ کے سامنے شکایت کردی۔ نہیں تو دادی جان پر ستم توڑنے لگے۔

ساس بہوؤں کی آپس میں کبھی نہیں پٹتی۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ اب یوں دیکھو تو پوتے بھی تھے اور پوتی بھی۔ اب کون ارمان بھلا

ان کے جی کو لگا رہ گیا تھا۔ مگر گھونگھٹ بھی نہ اٹھا ہو گا کہ ساس نے بات بیچھے طعنہ دینا شروع کر دیا۔

نہ کبھی ذکیہ بیگم کے دن چڑھے نہ ساس کی زبان رکی۔ مہینے پیچھے ہر بار ذکیہ بیگم کو آس بندھتی کہ ممکن ہے اب کے سے حمل رہ گیا ہو۔ مگر وہ اسی پابندی سے نماز ناغہ کرتی رہیں اور ساس اسی لگن سے طعنوں کے تیر برساتی رہیں۔ اور ادھر ہر لمحہ ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں منا، شانو اور بے بی کھٹکنے لگے۔

کہنے والوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ ایک بار یونہی ذکیہ بی کے متلی اٹھی، قے ہوئی اور چکر پہ چکر آنے لگے۔ ہاتھوں پیروں کا دم جیسے جاتا رہا۔ پلنگڑی سے لگ گئیں۔ متلی چکر میں دنوں کا حساب بھی بھول گئیں۔ اور مہینہ چڑھ گیا۔ دوسرے مہینے پلنگ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کام کاج میں چلنے، پھرنے لگیں تو ساس نے دیدے گھما گھما کے دیکھنا شروع کیا۔ متلی چکر تو تھے ہی، چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ اور چال میں یہ بہکا بہکا پن۔ دن گذرے جا رہے ہیں اور بہو ہیں کہ پابندی سے نماز پڑھے جاتی ہیں۔

ساس کو بڑا ارمان تھا کہ پانچ پوتوں کی دادی کہلاؤں۔ ذکیہ بی تو اپنے رب سے اتنی مایوس تھیں کہ اس قسم کی خوش نصیبی کا خود پر گمان ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار مہینے بعد پیٹ سامنے بڑھا چلا آنے لگا اور ہر اچھی بری چیز کے لئے طبیعت للیانے لگی کبھی کھٹے بیر ہیں تو کبھی تیز تیز مونگ کے بڑے۔ کبھی جواری کی باسی روٹی کے ساتھ اچار پر طبیعت اٹڈ رہی ہے تو کبھی اودی اودی جامنوں پر۔

ذکیہ بی کو کیسی کیسی شرم آتی کہ میاں بھلا کیا سوچیں گے کہ یہ ایسی آل کھاؤنی کیسے ہو گئی ہے کہ ہر چیز پر مر بھکوں کی طرح ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ مگر ایک دن محلے کی

دائی نے، جو یونہی اماں جان سے گپ لڑانے چلی آتی تھی۔ یہ انکشاف کر کے کہ بہو بیگم کو تو پانچواں بھر رہا ہے، ذکیہ بی کے دل کے آنگن میں سو سو گلاب کھلا دیئے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگے۔ دل کے کسی کونے سے آپی آپ صدا آنے لگی۔

"سو جا میرے پیارے سو جا رے میرے بالے

ذکیہ بی ان دنوں زمین پر نہیں آسمانوں پر چلتی تھیں۔ اور ہواؤں میں اڑتی تھیں۔ ساری تیزی تندی، ساری بدمزاجی ہوا ہو گئی۔ وہی ساس کہ جن سے لڑتے جھگڑتے ادھر کا سورج اُدھر ڈھل جاتا۔ اب ایسی پیاری ہو گئیں کہ اماں جان ہیں تو سب کچھ ہے۔ "اماں جان کے دانتوں میں زور ہی کہاں ہے کہ بیچاری کچھ سخت گرم چبا سکیں۔" کبھی ستریاں پک رہی ہیں تو کبھی نرم نرم گلتھی، کبھی چاولوں کے آٹے کا حلوہ ہے تو کبھی بادام کا حریرہ۔ بچوں سے بھی آپی آپ ملتی ہو گئی۔ جو چیز آ رہی ہے سب مل بانٹ کر کھا رہے ہیں۔ بچے بچے ہی ٹھہرے نگاہ میں نرمی دیکھی تو ادھر ڈھلک پڑے بچے ماں کے آس پاس منڈلا رہے ہیں۔ میاں سے تو تو میں میں کی بجائے پیار دلار کی باتیں ہو رہی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے میاں تو بیچارے سدا ہی کے سیدھے سادے تھے۔ یہ آپی اینٹھی جاتی تھیں۔ اب گھر پر خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ کونے کونے سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی۔

چلّہ نہا کر اٹھیں تو پھر گھر کے کام کاج گلے پڑ گئے۔ مگر اس میں بھی ایک لطف تھا۔ اِدھر اُدھر سے آ کر بچے کا منہ چوم جاتیں۔ گود میں اٹھا لیتیں سینے سے لگا لیتیں۔! پیشاب کر دیا ہوتا تو پوتڑا بدل دیتیں۔ روئے نہ روئے آپی آپ بہلاتیں۔ مناتیں۔ اور جو کبھی رو ہی دے تو کس کی ہانڈی، کہاں کی روٹی۔؟ ہانڈی جلتی ہے تو سو بار جلتی رہے، روٹی کوئلہ بنتی ہے تو ہزار بار بنتی رہے، جئے ایسا لال! لاکھوں روپے وار پھینکوں۔

محلے والیاں خواہ مخواہ ہی اتراتی پھرتی تھیں کہ دودھ نہیں اترتا، بچے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میوے کھا رہی ہیں، پھل چوس رہی ہیں۔ حریرے ڈھکوس رہی ہیں اور پھر بھی شکایت کہ دودھ سوکھتا جا رہا ہے۔ یہاں تو بی ذکیہ نے کبھی میوہ چکھا نہ پھل کی خوشبو ہی سونگھی۔ یہ تک نہ جانا کہ حریرہ کیا بلا ہے۔ بچہ پلانے کو بیٹھتیں تو لگتا کہ بس دو نہریں ہیں کہ امڈی چلی آرہی ہیں۔ کیسا بہتوئی دودھ تھا کہ دن بھر میں بچے کو چار چھ بار پیٹ بھر بھر پلانے کے بعد بھی تین تین چار چار کرتے بدلنے پڑتے۔ جب تب گود میں لیتیں محبت کی ایسی لہریں اٹھتیں کہ بنا کھلائے پئے ہی دھاریں بہہ نکلتیں۔ بچے کو پاکر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئیں۔ ساس کہہ کہہ کر مر جاتیں۔ مگر حلق سے نوالہ نہ اترتا۔ اچھا برا تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔ کون جانے کس بات میں اسکی کیا مصلحت چھپی ہے۔؟ ہم لاچار بندے تو بس یہی کہہ کر دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ اللہ کا جو کام ہوتا ہے مصلحت سے ہی ہوتا ہے۔

گرمی کے دن تھے، بدن تھے کہ جھلسے جا رہے تھے۔ اترتی دھوپوں میں بچے کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا۔ گرمی دانوں کے مارے جسم پھر پھرا گیا تھا۔ موٹا تازہ گدگدا بچہ پانی کے ٹب میں بیٹھا تو لگا چھپ چھپ پانی کے چھپاکے اڑانے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا جی کیسا خوش ہوتا ہے۔ ذکیہ بی کے دل میں کوئی جھانک کے دیکھتا۔ گلزار کھلے جا رہے تھے۔

"وَوئی دلہن غضب خدا کا! ایسی چٹکتی دھوپ میں آنگن میں بچے کو نہلائے جاتی ہو اور اتنی دیر سے پانی میں بٹھال رکھا ہے دھوپ لگ جائے گی نا۔"

"اماں جان! گرمی تو دیکھیے۔ جھلسا جا رہا تھا۔ اب کیسا خوش ہو رہا ہے۔"

"خاک خوش ہو رہا ہے۔ نمونیہ ہو جائے گا، ہاں!"

ذکیہ بی کو ہنسی آگئی۔ "نمونیہ۔؟ اوئی اماں جان۔! بھلا دھوپوں کے دنوں میں نمونیہ ہو گا۔؟"

"تم کو بھلا کیا تجربہ ہے بی بی۔؟ تمہاری نند کی بچی یونہی جاتی رہی۔ اچھی خاصی کھیلتی مالتی۔ بس نہلانا ہی بہانہ ہو گیا۔ مگر تم لوگ کسی کی مانو بھی۔ اگلے زمانے والوں کو تو تم نئے لوگ یونہی چٹکیوں میں اڑاتے ہو۔"

ذکیہ بی نے ہنستے ہنستے سفید تولیہ میں لپیٹ بچے کو اٹھا لیا اور راشد میاں نے روتے روتے سفید ململ میں لپیٹ قبر میں سلا دیا۔

دو ہی چار دنوں میں ذکیہ بیگم کا کیا حال ہو گیا۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ ہاتھ پاؤں سوکھ گئے۔ دل رہ رہ کے بس ببّو ببّو کئے جاتا۔ اپنے دیدوں دیکھتے، اپنے ہاتھوں ببّو کو نہلایا تھا۔؟ سفید ململ میں لپیٹ کر مو گرے کے ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ مگر ماتا کا مارا بے کل جی چین پائے تو کیسے۔؟ کونے کھدروں میں جھانکتی پھرتیں۔ کبھی چولھے کے پاس دیکھتیں تو کبھی دالان میں، یہاں تو نہیں چھپ گیا۔؟ وہاں تو نہیں چھپ گیا۔ اماں جان آپ نے تو نہیں دیکھا۔؟ یہیں تو سویا تھا۔ ابھی کے ابھی میں کہاں چلا گیا؟ کہاں کھو گیا۔

روتے روتے آنکھوں میں گلابی ڈھیے تیر گئے، ببّو ببّو پکارتے پکارتے ہونٹ پپڑا گئے۔ مگر ببّو کو آنا تھا نہ آیا۔ عمر بھر کے لئے کلیجے کو پھانس لگا کر چلتا بنا۔ ببّو پھول تھا۔ ذکیہ بی چمن۔ پھول گیا تو کیا چمن اور کیا چمن میں بہار! وہی دن تھے اور وہی راتیں۔ مگر بات بات پر الجھ پڑتیں، پاگلوں جیسی حرکتیں کرتیں، کاٹنے کو دوڑتیں۔ بعد میں پھر کبھی تو گود ہری نہ ہوئی۔ ان کی قسمت میں اوپر والے نے ایک ہی پھل رکھا تھا وہ بھی ادھ پکا۔

باپ کو دیکھتے ہی بچے آگے پیچھے جھول گئے۔

"ابّا! ابّا۔! بلونگڑوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"اچھا۔؟" وہ ذرا بناوٹی حیرت سے بولے۔

"ہاں ابّا۔! اور اب تو وہ ذرا دور تک گھوم پھر بھی لیتے ہیں۔"

بلّی کا ٹھکانا آجکل ذکیہ بی کے اپنے کمرے میں تھا۔ سات گھر گھمانے کے بعد اس نے چھپر کھٹ کے نیچے ہی اپنی ٹیک لگائی۔ ذکیہ بی کے چھپر کھٹ کے پاس راشد میاں کا بڑا سا پلنگ تھا۔ بچے باپ کے پلنگ پر چڑھ گئے اور سر نیچے جھکا جھکا کر رینگتے ہوئے بلونگڑوں کو دیکھنے لگے۔

راشد میاں نے بھی سر جھکا کر دیکھا۔ پوسی بڑے اطمینان سے دودھ پلا رہی تھی۔ چھوٹا بلونگڑا اس کی دم کے پاس پڑا پیاؤں پیاؤں کر رہا تھا۔

"ارے، اس کالے دھبوں والے کو کس نے ماں کے پاس سے ہٹا دیا۔؟"

راشد میاں ذرا الجھ کر بولے۔

"میں نے۔" شانو سہم کر بولا۔

"اور جو اس کی ماں اس کو ادھر ادھر ڈھونڈتی پھرے گی۔؟"

"وہ وہیں تو جد کا ہے ابّا۔ ذرا منہ موڑیگی تو آپ دکھ جائیگا۔"

"خبردار! جو بلونگڑوں کو کبھی ماں سے الگ کیا۔ وہ سارے میں چلّاتی پھرے گی۔ ہاں سن لو۔" راشد میاں کے بگڑے تیور دیکھ کر تینوں بچے سہم گئے۔

ذکیہ بی جو توے پر روٹی ڈال رہی تھیں، روٹی کے ساتھ ساتھ اپنا پنجہ بھی ڈال گئیں۔ "سی" کی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ انگلیاں جل کر کوریا ہو گئی تھیں۔

"خبردار! جو بلونگڑوں کو ماں سے الگ کیا۔" ان کے کانوں میں بس یہی گونج باقی رہ گئی۔ "خبردار! خبردار! خبردار۔!"

رات کے کھانے پر آلو کا سالن تھا، جو میاں کا من بھاتا کھاجا تھا۔؟ مسور کی دال چپاتیاں اور کھیر۔ آلو کے سالن میں غلطی سے مرچیاں زیادہ پڑ گئی تھیں۔ سوسو کر کے کھائے جا رہے تھے۔ بی بی نے کھیر کا پیالہ سامنے بڑھایا۔

"ایسا بھی کیا بس کھائے جا رہے ہیں۔ ہٹائیے رکابی سامنے سے۔ ذرا سی کھیر تو لیجئے۔ ٹھنڈک پڑ جائے گی۔"

"واہ کھیر!" راشد میاں خوشی سے بولے۔ میٹھوں میں کھیر پر دم دیتے تھے۔ پیالہ پکڑ جلدی جلدی چمچے چلانے لگے۔ زبان میں اس بری طرح جلن ہو رہی تھی کہ میٹھے سے بھی آگ بجھی نہیں۔ ابھی سوسو جاری ہی تھی کہ پیالہ پکڑ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جا رہے ہیں۔؟"، ذکیہ بی حیرت سے بولیں۔

ہنس کر بولے۔ "ذرا پوسی کو کھلا دیں تھوڑی سی۔"

ذکیہ بی ذرا برا مان کر بولیں۔ "خود آپ کے منہ کی آگ تو بجھی نہیں اور بلّی کا چونچلا سوجھ رہا ہے۔ کھائیے نا۔ آپ کا تو پسندیدہ میٹھا ہے۔"

"بلی بھی تو پسند کی ہے۔ ایسا بھی کیا ہے، بیچاری نے دو دو بچّے جنے ہیں۔ کچھ تر مال اسے بھی تو ملے۔"

باپ کے ساتھ بچّے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ہاں ابا! ہم کھلائیں گے۔ ہم بھی کھلائیں گے۔"

ذکیہ بی نے سامنے سے رکابی سرکا دی۔ حلق سے اترے تب نا!

لگتا تھا سارے گھر والوں کے دلوں پر بلّی چھا کر رہ گئی ہے۔ اماں جان نے ریشمی کترنوں سے بلونگڑوں کے لئے گلوں میں ڈالنے کو پٹے سئے، جن میں دو دو پیسے میں ملنے والے چھنکتے گھنگھرو بھی ٹانک دیئے۔ سردیوں کے دن تھے اس لئے راشد میاں نے

ماں سے سفارش کی کہ بلی کے لئے چھوٹا موٹا پرانے دھرانے کپڑوں کا نہالچہ سی دیا جائے۔ پوسی سردی سے مر نہ جائے گی۔؟

بلی خالہ کے کیا ٹھاٹ تھے۔ مزے سے گدے پر لیٹی ہیں۔ ادھر پیلا بلونگڑا اُدھر کالا بلونگڑا گھڑی دو گھڑی پڑوسیوں کے گھر کی خیر خبر لے کر گھوم گھام کر آتی ہیں، پھر پہلو میں بلونگڑے ہیں اور ان کی زبان۔ پتلی سی زبان سے اتنا چاٹتیں کہ بلونگڑے موئے گیلے گیلے ہو جاتے۔ باپ کی اجازت سے بچے بلونگڑوں کو اٹھا کر دالان میں لے آتے اور گھر بھر کو تماشہ ہو جاتا۔ شانو اپنا گیند پھینک دیتا اور بلونگڑے اس کے پیچھے لپک پڑتے۔ بستر بچھائے جاتے تو بلونگڑوں کو نئی شرارت سوجھ جاتی۔ چادروں گدوں پر لوٹنے پڑتے۔ وہ چار کھروچے جب تک بچوں کے ہاتھوں پر نہ پڑ جاتے نہ یہ مانتے نہ وہ مانتے۔ میاں ہنس کر بتاتے۔

"دیکھا ذکا۔؟ بدمعاشوں نے میرے ہاتھ بھی لہو لہان کر ڈالے۔"

ان کے لہجے میں پیار ہی پیار بھرا ہوتا۔

"سب بلی اور اس کے بچوں کے دیوانے ہیں۔ کسی کو فرصت نہیں کہ دو گھڑی کو میرا بھی حال پوچھ لے۔" ذکیہ بی نے بڑے کرب سے سوچا۔

سردیوں کی راتیں تھیں، چٹاخے کی سردی پڑ رہی تھی۔ محراب میں نیچی لو سے قندیل جل رہی تھی، سب رضائیوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے۔ بڑے سے پلنگ پر تینوں بچے آڑے آڑے سوئے تھے۔ اور خود چھپر کھٹ پر راشد میاں کے پہلو میں ذکیہ بی بی۔

ذکیہ بی بی نے منہ پر سے رضائی سرکائی اور بے چین نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ سبھی سو رہے تھے۔ رضائی کو دھیرے دھیرے کمر تک، اور پھر پیروں تک سرکا دیا۔ ہولے سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میاں نے جو پلنگ ہلتا محسوس کیا تو مُندی مُندی آنکھوں سے بیوی کو دیکھ کر بولے۔

"کیا کر رہی ہو۔؟"

" ایسے ہی، پیاس لگی ہے۔"

میاں پھر کروٹ لے کر سو رہے۔

ذکیہ بی چھپر کھٹ سے اتر کر کھڑی ہو گئیں۔ میاں کے منہ پر جھک کر اطمینان کر لیا کہ کہیں کچی نیند تو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر یونہی کھڑی رہیں۔ میاں خر خر کر رہے تھے۔

ذکیہ بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نیچے بیٹھ کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ بلی کہیں سیر کو گئی ہوئی تھی۔ دونوں بلونگڑے گادی پر خر خر کرتے پڑے تھے۔ ذکیہ بیگم کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ دل کو دبا کر انہوں نے گدی کا کونہ پکڑ کر ہولے سے اپنی طرف کھینچا۔

"پیاؤں، پیاؤں۔" دھکا کھا کر دونوں نے مری مری آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ مدھم سی روشنی میں دونوں بلونگڑے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دھکے سے ان کی نیند میں خلل آ گیا تھا اس لئے پچ مچی آنکھیں کھول کر انہوں نے ناگواری سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذکیہ بی نے گدی اس انداز سے لپیٹی کہ دونوں بلونگڑے اس میں اچھی طرح لپٹ جائیں۔ پھر تہہ کی ہوئی گدی کو لیکر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی، پیچھے دیکھتے وہ آنگن میں نکل آئیں۔ کمرے کی نیم گرم فضا سے نکل کر باہر اک دم شدید سردی میں آ کھڑی ہوئیں۔ مگر انھیں سردی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ مرزا صاحب کے گھر سے اب تک باتوں کی اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیگم مرزا کا بڑا اصرار تھا کہ تمہاری بلی کے بلونگڑے ہوں تو ہمیں دینا۔ یوں ہی تھی تو دیسی بلی، مگر یہ بڑے بڑے جھالردار بال۔ گدگدے نرم نرم، موٹے موٹے پنجے!

بھاری بھرکم بلونگڑے بھی ویسے ہی ہوئے۔ محلے بھرے میں بہت سوں کے دانت تھے۔
بیگم مرزا اس وقت ذکیہ بی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔
"اس وقت۔؟ خیریت تو ہے۔؟" وہ بوکھلا کر بولیں۔
ذکیہ بی نے بازو کے نیچے سے لپٹی ہوئی گدڑی نکالتے ہوئے کہا۔
"کیا کہوں بہن۔؟ تمہارے کہے کا کس قدر پاس تھا مجھے۔! روز سوچتی تھی لا کر دوں گی، مگر بچے اور ان کے باپ چھوڑیں تب نا۔ اب سو گئے ہیں تو لے آئی ہوں۔ اور اتفاق سے پوسی بھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر بہن۔! انھیں کہیں اندر ہی چھپا کر رکھنا۔ ورنہ بلّی تو بو پا ہی لے گی اور بچوں نے کہیں دیکھ لیا تو پھر واپس لے بھاگیں گے۔"
بیگم نے دیوانوں کے سے انداز سے بلونگڑے چھین لئے۔
"ارے۔! دونوں ہی!" ان کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔
"ہاں! مجھے معلوم تھا بہن تمھیں بلّیوں سے بڑا پیار ہے اس لئے دونوں ہی کو لے آئی ہوں۔ ایک بلّا ہے ایک بلّی۔ اب نسل چلاتی رہو۔"
ذکیہ بی نے گھبرائی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔
بیگم نے انجانے میں ایک تیر چلایا۔
"ان کی ماں تو نامراد ہائے ہائے نہ مچائے گی۔؟"
بہت دیر تک تو ذکیہ بی کو جواب ہی نہ سوجھا، پھر اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں۔
"بڑے بھی تو خاصے ہو گئے ہیں نا" بڑی مشکل سے وہ ہونٹوں تک ہنسی کو گھسیٹ کر لا سکیں۔
"اے بہن۔! بڑے چھوٹے کی نہ کہو، ہوتی آخر اولاد ہی ہے......"
ذکیہ بی نے ان کی بات پوری ہونے سے قبل ہی کہنا شروع کر دیا۔ "تو بہن رکھو کہاں رہی ہو انھیں؟"
بیگم نے سامنے ہی دالان میں دھرے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں ایک

گدیلا بچھوادونگی، مزے سے رہیں گے۔ اور اس صندوق میں اتفاق سے ایک بڑا سا سوراخ بھی ہے، ہوا جاتی آتی رہے گی۔"

ذکیہ بی جب دسمبر کی کڑکڑا دینے والی سردی میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ماتھے اور گردن پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ڈگ مگ ڈگ مگ قدموں سے چلتی وہ اپنے پلنگ تک آئیں اور میاں کے بازو پر دھپاک سے گر پڑیں۔

صبح سارے گھر میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔

بچے الگ بدحواس تھے، اماں جان الگ چنگھاڑ رہی تھیں۔ اور رات میاں تو ساکت ہی رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت پوسی کی تھی۔ میاؤں میاؤں کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔

"بلونگڑے آخر گئے تو کہاں گئے۔؟"

بس ایک ذکیہ بی تھیں کہ روز کی طرح ہر چیز سے بیگانہ خاگینہ پکاتی بیٹھی تھیں۔

"بے بی سے پوچھئے ابا۔ ایک دن یہ اپنی سہیلی زرینہ سے کہہ رہی تھی کہ بلونگڑے بڑے ہو جائیں گے تو ایک تم کو دیدیں گے۔" شانو بولا۔

"واہ وا۔! اچھے ہو جی تم۔" منا بے بی کی حمایت میں بولا۔

"وہ بے چاری تو خود اتنا پیار کرتی تھی، چپ ٹالنے کو کہہ دیا ہوگا۔"

"دیکھئے نا بھائی جان۔" بے بی نے اپنا ایک حمایتی پا کر خواہ مخواہ بسورنا شروع کر دیا۔

"ہمیں الزام دے رہے ہیں خواہ مخواہ۔"

"دادی اماں سے پوچھئے۔ وہ ہمیشہ بولتی تھیں کہ بلونگڑے گندگی کا ڈھیر ہیں۔ انہوں نے تو کسی کو نہیں دے دیئے۔؟"

"خاموش رہو بے وقوف۔" راشد نے منے کو ڈانٹ دیا۔

"بلی نہ کہیں اٹھا کرلے گئی ہو۔" راشد میاں تھوڑی دیر چپ رہ کر بولے۔

"اے واہ! سات گھر تو اس نے پھرا دیئے۔ اب کہاں لے جاتی بھلا۔؟ رات میں نے خود چھپر کھٹ کے نیچے دیکھے۔"

اور انھوں نے بے اعتباری کے انداز سے بہو کی طرف دیکھا۔

"اور میں کہوں اگر خود ہی اٹھا کرلے جاتی تو یوں کاہے کلپ کلپ کر میاؤں میاؤں کیوں کرتی؟"

بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی تھی، مگر راشد میاں کی کسی صورت تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر شک وشبہہ سے بولے۔

"کبھی بلّے وِلّے نے نہ کھا لئے ہوں۔"

"سردی کے مارے دروازے تو سارے بند کر لیتے ہیں۔ پھر بلّا آئے تو کدھر سے؟ روشن دان بھی کھلے نہیں رہتے۔"

ہر بات کا واضح جواز موجود تھا۔ پھر۔؟

"میاؤں — میاؤں — می آؤں۔"

بلی بری طرح چلا رہی تھی۔ رہ رہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جاتی۔ گودام کی طرف دوڑتی، مودی خانے کے چکر کاٹتی اور پھر جا کر گدی کو منہ سے کھینچنے لگتی جو ذکیہ بی نے جہاں کی تہاں پھینک دی تھی۔

"دکھیا کا صبر پڑے جس نے بھی اس کا کلیجہ کاٹا ہے۔"

اماں جان نے کلپ کر کوسا دیا۔

ذکیہ بی بیٹھے ہی بیٹھے سر سے پاؤں تک تھرا گئیں۔ بچے الگ رنگ رنگ کی بولی بول رہے تھے۔ راشد میاں ہر بار نئی بات سجھا رہے تھے اور اماں جان کوسنوں کی بھرمار کر رہی تھیں۔ ایک ذکیہ بی کی زبان بند تھی کہ ایک دم ساس نے ان سے پوچھا۔

"دلہن بیگم، تم نے کہاں دیکھے ہیں بلو نگوڑے۔؟"

ذکیہ بی نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر منہ سے آواز نکالی۔

"میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں، میں کیا جانوں۔؟"

صبح سے اب تک یہ پہلی بات تھی جو ان کے منہ سے نکلی، ورنہ وہ خاموش ہی تھیں۔

بلی نے پورے گھر کے چکر لگا ڈالے مگر بلونگڑے ملنے تھے نہ ملے۔ چار چار چھ چھ منٹ کو باہر سے آتی اور چھپر کھٹ کے نیچے گھس جاتی اور ایسی درد بھری آواز سے میاؤں میاؤں کرتی کہ ذکیہ بی کا دل تھرا تھرا اٹھتا۔

"رانڈ دودھ کے مارے لوتھن بن گئی ہے۔ جانور ہو یا انسان ہو، میا محبت تو اللہ نے سب کو لگا دی ہے۔" اماں جان، جو سدا بلونگڑوں کو خیرات کر دینے کے بارے میں لیکچر دیتی رہتی تھیں۔ آج مامتا کی پکار کے آگے سپر انداز ہو چکی تھیں۔

بچے اداس اداس اسکول سدھارے۔ راشد میاں منہ لٹکائے آفس چلے گئے اور اماں جان کا دل اس دن سیون میں نہ لگ سکا۔

لاکھ جانور کے بچے تھے۔ مگر دن بھر اچھل پھاند جو تھی تاگے کی گھنڈی دیکھ پاتے تو اس سے لتنے پنجے چلاتے کہ وہ کھل کھلا کر الجھ الجھ جاتی۔ کترنوں کی دھول دھانی کرتے اتنی پھیکم پھیانک کرتے کہ سارے میں کترنوں اور تاگوں کا جال بچھ جاتا۔ اماں جان بھی منہ لپیٹ کر پڑ رہیں۔ پوسی کی پکار نے ان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔

دو بجے پوسی پھر آئی۔ پیشانی کے پاس سوکھا ہوا خون جما ہوا، ناک پر مار کے نشان، منہ ایک طرف سے پھول گیا تھا۔ ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی آئی اور گدی کے پاس بیٹھ کر مری مری آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ یوں جیسے روتی ہو۔

سب اپنی اپنی بولی بول چکے تھے۔ بس ذکیہ بی کی دل کی دل ہی میں رہ گئی تھی۔ سب کی باتیں ٹک ٹک سنتی رہیں اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس خاموشی کا اتنا شدید ردعمل ہوا کہ دوپہری سے انہیں سنسنا کر بخار چڑھ آیا۔

ساس نے کانپتا دیکھا تو اٹھیں اور دالان سے اٹھا کر کمرے میں جا لٹایا اور رضائی اڑھا دی۔ ایک رضائی سے جاڑا نہ گیا تو دوسری بھی لا اڑھائی۔

بچے اسکول سے لوٹے تو گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دادی ہمیشہ کی طرح سیون نہیں کر رہی تھیں۔ اور اماں بھی چولھے کی بجائے پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔

شانو بڑی اداسی سے بولا۔ "بلونگڑے نہیں ہیں تو گھر کیسا لگ رہا ہے۔ بھائی جان!"

منا کچھ نہ بولا۔ دکھ سے سانس لیکر رہ گیا۔ جیسے جی پر بہت بوجھ ہو۔

"ہائے اللہ اپن نے تو نام بھی سوچ لئے تھے۔ تارا اور سورج۔ کیوں بھائی جان، وہ پیلے دھبوں والے بلونگڑے کا نام سورج ہی سوچا تھا نا، جو بلا تھا۔؟"

دکھے دل سے منا بولا۔ "ہاں بے بی سورج چلا گیا اور تارا بھی چلی گئی اور اب گھر کیسا اندھیارا اندھیارا سا لگتا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ چور کا پتہ نہیں چلتا۔" شانو حیرت اور پریشانی سے بولا۔

بے بی کا ننھا دل محبت اور غصے سے چور چور ہو رہا تھا۔ دانت پچ کچا کر بولی۔

"اگر مل جائے تو ٹھاں سے بندوق مار دوں۔"

منا غم سے بولا۔ "ہم تو خیران کے مالک تھے۔ اس کی ماں کا حال تو سوچو ذرا۔ ایک دن کبھی ابا دیر سے گھر پہنچتے ہیں تو دادی اماں کتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

تینوں خاموش ہو گئے۔ مگر لگتا تھا کہ ان کے معصوم دلوں سے بلونگڑوں کی یاد کبھی نہ مٹے گی۔

"اماں کچھ پتہ چلا۔؟" راشد میاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں سے پہلا سوال کیا۔

اماں جان نے اٹکل سے تیر چلایا۔ "جس کے دل کو ماں کی ممتا کا درد ہوئے وہ ڈھونڈھا کرے۔ ایسا بھی کیا موا کورا پن۔"

اماں کا شبہہ آجا کر بہو پر جا رہا تھا۔ "موئی نامراد زخموں سے چور چور تھی۔"

"کون چور چور تھی اماں۔؟" راشد میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"اے وہی تمہاری بلی۔ جانے کدھر کدھر کھوجتی پھر رہی ہے کہ سارا منہ سجالائی۔ ناک الگ سوجی ہوئی، پیشانی الگ۔ زخموں زخم۔ خون بھی بہہ رہا تھا۔"

"ہوں"۔ ایک بہت لمبی ٹھنڈی سی سانس آپی آپ راشد میاں کے حلق سے نکل پڑی۔

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ گلی کی مسجد سے مغرب کی نماز کی اذان بلند ہوئی۔

شانو سرگوشی میں منے اور بے بی سے بولا۔

"بھائی جان! ادے بی۔! چلو مسجد میں چل کر دعا مانگیں کہ اللہ ہماری بلی کے بچے......"

دل برداشتہ بے بی بولی۔ "اللہ میاں ہماری دعا کائے کو سننے لگے۔"

"بچ بچ"۔ منا گھبرا کر بولا۔ "ایسا نہیں کہتے، گناہ ہوتا ہے۔"

دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ تینوں آگے پیچھے بھاگنے لگے۔

"اے ناہرادو! یہ کون کھیلنے کا وقت ہے۔؟" پیچھے سے دادی اماں چلائیں۔

آنسوؤں میں نتھرتی بے بی کی بے بس آواز آئی۔

"دادی اماں! ہم اللہ میاں سے دعا مانگنے جارہے ہیں۔"

رات کے نو بجے سردی اپنے زور پر تھی۔ ادھر ذکیہ بی کا بخار اپنے شباب پر تھا کہ وہ رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنکھیں سرخ، ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، بال الجھے الجھے۔

میاں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"کیا کر رہی ہو۔؟"

"! ایسے ہی جی گھبرا رہا ہے۔ ذرا باہر جاؤں گی۔"

"مگر اس وقت اتنی سردی ہیں؟ تمھیں بخار ہو رہا ہے نا۔؟"

"تو کیا ہوا۔؟" وہ کانپتی آواز میں بولیں اور جلتی جلتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

دروازے پر آتی رات گئے انھیں کھڑا دیکھ کر بیگم مرزا حیرت سے بولیں۔
"تم؟ ارے، یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا۔؟ کیا بات ہے بہن؟ خیریت تو ہے؟"
وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے بولیں۔ "بلو نگوڑے کہاں ہیں۔؟"
"وہیں ہیں۔ کیوں۔؟" پھر ہنس کر بولیں۔ "وہ تمہاری پوسی آئی تھی شاید بچوں کی بو پا گئی کہ بار بار صندوق کے گرد گھیرے ڈالتی تھی، سر پٹختی تھی۔ میں نے بھگا بھگا دیا۔ بہت ستانے لگی تو غفورے نے دو ایک پتھر ایسے کس کے مارے کہ منہ الگ سوجا اور ٹانگ الگ لنگڑا گئی۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔
"اور بلو نگوڑے۔؟" ذکیہ بی نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔
"وہ۔؟ موئے اداس اداس سے ہیں۔ دودھ دیا مگر منہ تک نہیں لگا رہے ہیں۔ بری بری آوازوں سے رو رہے ہیں۔"
ذکیہ بی نے منت بھری آواز سے کہا۔ "کہاں ہیں وہ۔؟ ایک نظر دیکھ لوں۔؟"
"وو ئی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہوئی۔؟ یہیں تو ہیں۔"
مرزا صاحب کی اماں دالان کے کونے میں رضائی میں سکڑی سا۔ سوسو، سی سی کرتی پڑی تھیں۔ دونوں کو صندوق کے پاس جاتا دیکھ کر بولیں۔
"بن ماں کے بچوں کی بھی کوئی زندگی ہے موئی! ماں کی گود کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"
کئی سال ایک لمحے میں گزر گئے۔ اسی ایک لمحے میں ذکیہ بی دلہن بنیں، سوتیلے بچوں کی ماں بنیں۔ ڈائن، کوکھ جلی ماں بنیں۔ پھر بہو کی ماں بنیں، اور اب پھر ان کی گود خالی تھی۔
بیگم نے آہستہ سے ڈھکنا کھولا۔
"میاؤں میاؤں۔ می آؤ۔ امی آؤ۔ امی آؤ۔"
بہو جب روتا تھا تو یونہی "امی آؤ" کہتا تھا۔

بخار سے سنسناتا جسم کانپ کانپ اٹھا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے بلونگڑوں کو اٹھا لیا۔ چونک کر بولیں۔

"ارے دو ہی دن میں اتنے دبلے کیسے ہو گئے۔؟"

دالان کے پرے کونے سے مرزا صاحب کی اماں کی آواز آئی۔

"جانوروں کی بات ہے نہ انسانوں کی، سب محبت کا سوال ہے بٹیا۔ ماؤں سے بچے چھٹیں یا بچوں سے مائیں۔"

ذکیہ بی کچھ نہیں سن رہی تھیں۔ بلونگڑوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر بولیں۔

"بہن میں انھیں لئے جا رہی ہوں۔!"

بیگم مرزا کا مزاج جاتا رہا۔ "وہ کیوں بہن۔؟"

منہ سے کچھ کہے بغیر ذکیہ بی جلدی جلدی دروازے کی طرف لپکنے لگیں۔ ان کی خاموشی سے بیگم کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"اے واہ! خود ہی دیئے اور خود ہی لئے بھی جا رہی ہیں کیسی دوغلی زبان ہے بی تمہاری! کوئی یوں دو منہ کا سانپ پالتا ہے اپنی زبان میں۔؟"

دروازے سے نکلتے نکلتے پیچھے مڑے بغیر تیز، مگر کانپتی ہوئی آواز سے بولیں۔

"تم نے کبھی بچے جنے ہیں۔؟"

وہ بے تابی سے گھر میں داخل ہوئیں۔ بلونگڑے ان کی چھاتی سے چمٹے ہوئے تھے۔

"ہتے، شانو، بے بی۔ دیکھو بیٹو، دیکھو میرے بچو، یہ تمہارے کھلونے!"

ٹو یا کر پوسی چوکس ہو گئی۔ گدی پر سے جھکولا لے کر اچکی اور بلونگڑوں پر ٹوٹ پڑی۔ دیوانہ وار چوم چاٹ کر انھیں گیلا کرنے لگی۔

تینوں بچے کسی اندرونی احساس سے متاثر ہو کر اک دم جاگ پڑے "آہا تارا!

آپا جی سورج !" نیند بھری آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بری طرح چلّانے لگے۔
" اماں جی ! ابا جی ! یہ کہاں سے آئے ؟ کہاں ملے ؟ کہاں تھے ؟"
تینوں کے تینوں بلّی اور بلونگڑوں کے آس پاس ناچ رہے تھے۔
ذکیہ بی کھڑی کانپتی جارہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام رکھا تھا۔
راشد میاں نے اٹھ کر ان کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔
" میں جانتا ہوں ذکا دو دن سے تمہارے دل پر کتنا بوجھ تھا۔"
ذکیہ بی نے گھبرا کر میاں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

" ہاں، جب تم بلونگڑوں کو لے جارہی تھیں تب میں جاگ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر چپکا بنا پڑا رہا۔ اگر میں تمہارا راز کھول دیتا تو میرے بن ماں کے بچوں کو کبھی ماں نہ ملتی۔"

سہمے سہمے انداز سے ذکیہ بی راشد میاں کو دیکھ رہی تھیں۔
" میں جانتا تھا ذکا تم بہت دنوں یہ ظلم نہ کر سکو گی۔ میرا ایمان ہے ذکیہ کہ ہر عورت کے دل میں ایک تاریک تہ خانہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر وقت پڑنے پر اس تاریکی میں مامتا کی مشعل ضرور جگمگا اٹھتی ہے۔ !"
" میں ۔ م ۔ م میں ....." جذبات کی شدت کے مارے ذکیہ بی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔" جب میں پوسی کی پکار سنتی تھی تو مجھے خود اپنی تڑپ اور مامتا یاد آتی تھی۔ جب میں نے سوکھے مارے بلونگڑوں کو روتے دیکھا تو ...... تو ...... میں نے سوچا کہ ماؤں اور بچوں کے لئے ایک دوسرے کے وجود کس قدر ضروری ہیں۔ میرا دل پھٹ جاتا۔ میں

یقیناً مرجاتی اگر میں ......"

راشد میاں نے پیار سے ذکیہ بی کا سر تھپ تھپایا۔

" تم جی بھر کر رو لو ذکا۔ آج تمھاری آنکھوں سے جتنے آنسو بہہ جائیں اچھا ہے۔"

" مگر مجھے رونا نہیں آرہا ہے۔" انھوں نے بے بسی سے کہا۔ اور بچوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر راشد میاں کے سینے سے لپٹ کر پھپک پھپھک کر رونے لگیں۔



بازگشت

مرغا جو پر پھٹ پھٹا کر اڑا تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھا۔ انھوں نے تلملا کر پیچھے دیکھا، نیلم اور نیکی دور کھڑے ہنس ہنس کر دیکھ رہے تھے۔

"کیوں بے نامعقولو، یہ مرغے کو کس نے اڑایا۔؟"

"جی میں نے۔" نیکی ذرا سا پیچھے کو ہٹ کر بولا۔

ڈپٹی صاحب کفن پھاڑ کر چیخے۔" اور کم بخت بولتا بھی ہے کہ 'میں نے' ٹھیر تو سہی ذرا، خیر......"

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ پیچھے پیچھے اور بچے آگے آگے۔ دونوں بھلا کیا ان کے ہاتھ لگنے والے تھے؟ یہ بھنّاتے ہوئے بہو کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور تیزی سے بولے۔

"میم صاحبہ سنتی ہو۔؟ تمہارے بچوں نے میرے آنگ پر مرغے کو ہشکا دیا۔ جو کبھی گندگی کر دیتا۔؟"

ناہید بغیر بات کی اہمیت کو سمجھے سادگی سے بولی۔

"تو آپ نہا لیتے۔"

"ہائیں! بس نہا لیتا اور کچھ نہ کرتا۔؟"

"بھلا آپ کیا کر لیتے؟" وہ سادگی سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"ارے گندگی جو کر دیتا تو اس نامراد نیکی کا گلا دبوچ دیتا۔"

"اچھا۔؟" ناہید نے بھولپن سے پوچھا۔

"ہاں اور کیا سمجھ رہی ہو تم۔؟ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میرے ہاتھوں کسی کا خون ہو کر رہے گا۔"

ناہید نے بے بسی سے سسرے کو دیکھا، پھر جھلا کر بولی۔

"پپا آپ سے کئی بار کہا ہے کہ اپنی طرف کا دروازہ بند رکھا کریں۔ آپ سے خود تو ہوتا نہیں، بچوں پہ تہمت دھرتے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب نے دیدے گھما کر بہو کو گھورا، پھر چلائے۔

"تجھ سے کچھ ہوتا نہیں۔؟ مجھ سے کیا نہیں ہوتا، ذرا بتانا تو؟"

"اونہہ! ہوتا ہوگا بابا بہت کچھ۔ مگر اس وقت تو ہمراسر آپ کا قصور ہے۔"

"میرا۔ یعنی کہ میرا۔ یعنی کہ میں نے مرغے کو اپنے ہاتھ سے اپنے کندھے پر بٹھایا اور خود ہی تمہارے پاس شکایت لے دوڑا۔؟"

ناہید کو ہنسی آگئی۔

"اف پپا آپ بھی غضب کرتے ہیں! میں بھلا یہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے مرغے کو کندھے پر بٹھایا۔؟"

"پھر کیا کہہ رہی تھیں۔؟"

"اگر آپ دروازہ بند رکھا کریں تو یہ جھگڑے کھڑے ہی کیوں ہوا کریں۔؟"

"تو مطلب تمھارا یہ ہے کہ سارے جھگڑے محض دروازہ بند کر دینے سے ہی سلجھ جائیں گے؟"

"یقیناً۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"اور جو تمہارے لاڈلے دروازہ دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں۔؟"

"کون۔؟ پنکی اور نیلم۔؟" ناہید حیرت سے بولی۔ "ان کی بھلا یہ مجال کہ آپ کے

دروازے پر جاکر شور مچائیں ۔ ! "

" ہاں ہاں تو پھر مطلب تمہارا یہ ہے کہ میں خود ہی دروازہ دھپ دھپاتا ہوں ۔ اور کہتا ہوں کہ بچے پیٹ رہے ہیں ۔ کیا باتیں کرتی ہو تم بھی ۔ ؟ "

" اف خداوند ! چت بھی میری پٹ بھی میری ۔ آپ نے تو پپّا جینا دوبھر کر دیا ہے ۔ بچوں سے یوں لڑتے ہیں جیسے ان کے دادا نہ ہوں بازو برابر کے بچّہ ہی ہوں ۔"

" میں ۔ ؟ میں لڑتا ہوں ۔ ؟ "

" پھر کون لڑتا ہے ۔ ؟ "

" دیکھو میم صاحب میرا منہ نہ کھلواؤ ۔ پھر جب بولنے پر آتا ہوں تو کفن پھاڑ کے بولے ہی جاتا ہوں ۔"

" آپ نے بولنے میں کمی ہی کیا کی ہے ۔ ؟ ہمیشہ ہی کفن پھاڑ کر بولتے ہیں ۔ کوئی حد ہے ۔ ! "

ابھی ڈپٹی صاحب گرما گرمی میں کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ پچھواڑے کے پیچھے کے باغیچے سے تیز تیز آواز آئی ۔

" بولو مٹھو پیارے ۔ "

" بولو مٹھو میاں ۔ "

ڈپٹی صاحب کے کان ادھر ہی لگ گئے ۔ ناہید بھی گردن اونچی کر کے سننے کی کوشش کرنے لگی ۔ غالباً پنکی کی آواز تھی ۔

" پپا فول ۔ پپا فول ۔ "

تیزی سے ڈپٹی صاحب اچھلے اور پھر بیٹھ گئے ۔

" سنو میم صاحب ، سنو ۔ یہ کم بخت مٹھو کو کیا بولنا سکھا رہے ہیں ۔ ' پپا فول ۔ پپا فول ' ۔ یہ تمہاری تربیت ہے ۔ ؟ بڑوں کو یوں کہا کرتے ہیں ۔ "

ناہید گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "مائی گاڈ۔! پپا میں نے ہرگز ایسی تربیت نہیں کی۔ یہ تو آپی آپ ......"

"ہاں ہاں آپی آپ۔ کہہ دو نا میں نے ہی سکھایا ہے۔"

ناہید نے کچھ رک کر سسرے کو دیکھا، پھر ملائمت سے بولی۔

"ہو سکتا ہے آپ ہی نے سکھایا ہو۔ آپ ہی تو دن رات ہر کس و ناکس کو فول فول کرتے رہتے ہیں۔ بچوں نے سوچا ہو گا۔ پپا تو کہتے ہیں، چلو اپن بھی کہو۔"

خوں خوں کرتے ہوئے ڈپٹی صاحب لپکے۔

"ابھی انھیں مزہ چکھاتا ہوں۔" ان کے پیچھے ناہید ہائیں ہائیں کرتی لپکی، مگر وہ تب تک چھلانگیں مارتے ہوئے صحن میں اتر چکے تھے۔

لپڑ دھپڑ کی آواز سُن کر ڈائننگ روم سے سراج نکل آیا۔ ناہید سیڑھیوں کے پاس کھڑی بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔

"کیا ہوا۔؟" وہ قریب آکر بولا۔

"ہوا کیا۔؟ آپ کے پپا نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ کوئی بات بھی ہے۔ بچوں سے برابری والوں کا سا سلوک ہے۔"

"اوہنہہ۔!" سراج زچ ہو کر بولا۔ "یہ تو روز کی کہانی ہے اس وقت مگر کیا ہو رہا تھا۔؟"

ناہید کو ذرا سی ہنسی آئی۔ "مجھے تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ میں بیٹھی امبرائڈری کر رہی تھی۔ دندناتے ہوئے آئے اور بولنے لگے، میم صاحب تمہارے بچوں نے میرے آنگ پر مرغا ہشکا دیا۔ ابھی یہ بات نبٹی بھی نہ تھی کہ پچھواڑے سے نیلو اور پنکی کی آواز ان کے کان میں پڑ گئی اور ان کے مرچیں لگ گئیں۔"

"کیوں بچوں نے کیا کہا۔ ؟"

"مٹھو کو بولنا سکھا رہے ہیں۔ 'پپا فول، پپا فول'۔"

ناہید نے ہنس کر میاں کو دیکھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر پپا کب تک یہ دشمنی نبھائیں گے حد ہے کوئی۔"

"الگ گھر کیوں نہیں کر لیتے۔ ؟" ناہید تیزی سے بولی۔

"جانے کیسے پپا ہیں، حیران کر کے رکھ دیا ہے۔"

بات کیا ہوتی۔ سیراج میاں ماں کے بعد باپ کے ہی ہاتھوں پلے۔ جب باپ نے بیک وقت ماں اور باپ بنکر پالا ہو تو محبت کا کیا پوچھنا۔ بالشت برابر کے کپڑے تھے تب سے بہو کا ارمان تھا۔ پڑھایا، لکھایا۔ پالا پوسا اور بیٹے کو شیر جیسا بنا دیا۔ ڈپٹی تھے، رسوخ سے کام لیا، کچھ لیا کچھ دیا۔ اور بیٹے کو پانچ سو کی سروس پر چڑھا دیا۔

باپ دورے پر تھے۔ بیٹے اپنی سروس پر۔ آخر کو آدم تھے، حوا کی تلاش تو ہونی ہی تھی۔ آدم نے تڑپ تلک کر اپنی پسلی سے ایک حوا برآمد کر لی تھی، انھوں نے پسلی کو چیرنے پھاڑنے کی ضرورت نہ سمجھی، اوپر والے صاحب کی تیز طرار کانونٹ کی پڑھی لکھی فارورڈ بٹیا ناہید سے چپکے چپکے شادی رچا ڈالی۔

ہر بار باپ بیٹے سے ملنے آیا کرتے تو گھر میں وہی اکیلے مردوں کا سا سونا پن ہوا کرتا۔ کونے میں ادھر اُدھر، یہاں وہاں سگرٹوں کے ٹوٹے، ماچس کی تیلیاں، راکھ۔ پھٹے ہوئے کاغذ۔ کھونٹیوں سے لٹکتے کپڑے، کچھ میلے، کچھ اجلے۔ ٹائیاں میز پر، جوتے کرسیوں پر۔ اور وہ انہیں کے عادی ہو چکے تھے۔ اب کے جو پلٹے تو کایا ہی کلپ دیکھی۔ سب سے پہلے جو پھاٹک سے داخل ہوئے تو آنگن اور مردانے صحن کو ملانے والے دروازے میں ہرے رنگ کا پردہ اڑ رہا تھا، چونک کر دیکھا۔ سے جھپکا جھپکا کر دیکھا۔ پھر نظر اٹھی تو سامنے بیٹے کا کمرہ

پڑتا تھا داخل ہوئے تو سارا سامان سلیقے سے سجا سجایا۔ اب وہ جوتے کہاں تھے جو کرسیوں پر رلتے ہوتے تھے۔ میزوں پر پڑی رہنے والی ٹائیاں ہینگر میں لٹک رہی تھیں۔ سگرٹوں کے ٹوٹے جمع کرنے کی جھلمل کرتی ایشٹرے میز کے بیچ رکھی ہوئی تھی۔ اور ایشٹرے کے نیچے ہلکے کریم کلر کا ٹیبل کلاتھ جس پر بہترین اور نفیس امبرائڈری اور پھر تو نظر اٹھانے کی بھی کیا ضرورت رہ گئی۔ ! وہ تو آپی آپ، اپنے آپ اٹھتی ہی چلی گئی۔ وہ کپڑے جو سدا یہاں وہاں جھولتے رہتے تھے۔ اب اپنے جائز مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ناول رسالے، جو ادھر ادھر بکھرے رہتے تھے۔ کونے میں شلیف میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ یوں حیران حیران نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے کہ پردہ ہلا۔ پردہ ہلتا تو یہ دیکھتے بھی نہ مگر وہ سنہری چھلّے، جن میں پردہ اٹکا ہوا تھا، کھن کھنائے اور انھیں تو چونک ہی جانا پڑا۔ اس جنت کی سیر پوری ہوئی بھی نہ تھی کہ ان کی نگاہیں اٹھیں اور جیسے جنت کی حور نکل آئی پردے کے پیچھے سے۔

" لو بھئی جنت تھی تو تھی ہی، حور بھی آ ٹپکی۔" انھوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ آتے ہی پٹ سے بولی۔

" اف پپا آپ۔ ارے بیٹھئے نا۔ سراج نے مجھ سے آپ کا بار بار ذکر کیا ہے آپ کی تصویریں بھی بتائی ہیں اور دیکھئے ہم نے آپ کی بڑی سی تصویر یہاں لگا بھی رکھی ہے نا۔" اس کی انگلی کی گردش کے ساتھ ان کی آنکھ بھی گردش میں آگئی اور دیوار پر دیکھا کہ وہ خود بیٹھے ہیں۔ ہنستے ہوئے! بھنا کر انہوں نے خود کو دیکھا۔ بھلا وہ کب ہنس رہے تھے۔

" آپ بیٹھئے تو، میں اتنے میں آپ کے نہانے کا انتظام کروا لوں۔!"

" سراج میاں کدھر جا مرے .... یہ تو آپ سب مرحلے طے کئے جا رہی تھی۔ ہونہہ پپا! میں کب اس کا باپ ہوں؟ اور یہ تیسرے کے گھر میں یوں رانی بنی کیوں

گھوم رہی ہے۔؟ لاحول ولاقوۃ! آج کل کی لڑکیوں کو شرم وحیا ہے کہ نہیں۔؟ آخر ہماری بھی مائیں بہنیں تھیں، انگلش پڑھی تھی، باہر کی دنیا بھی دیکھی تھی، مگر یوں تیرا سیرا گھر جھانکتی نہ ہوتی تھیں۔ آنے دو بچہ کو، ابھی خبر لیتا ہوں۔ ہونہہ، یہ سروس ہو رہی ہے۔!"

ابھی یہ غلطاں پیچاں ہی تھے کہ پھر پردہ چھن چھنایا اور پھر وہ پری پیکر نمودار ہوئی۔

"مائی گڈنس!" سینے پر ہاتھ لے جا کر بولی، آپ ابھی تک بیٹھے ہی نہیں۔؟ میں تو آپ کے لئے پانی بھی لگوا آئی۔ سراج آتے ہوں گے۔ بیٹھے شیو کر رہے تھے۔ بھلا آپ کے سامنے یوں کیسے چلے آتے۔؟"

واہ، بے باکی سے ہنسنا تو دیکھو۔ اور سراج کا ذکر یوں کرتی ہے جیسے ساتھ کا کھیلا ہو۔ ارے بھئی کرتا رہے عمر بھر شیو، تمہیں کیوں فکر ہوتی ہے۔

بیٹھے پیچ و تاب کھاتے رہے کہ کم بخت کو ادھر آنے تو دو۔ پھر دیکھتا ہوں۔ کم بخت آیا تو اس ہیئت کے ساتھ کہ نگاہ نیچے سے اوپر نہ ہوتی تھی۔ اور پہلے تو آنے کی خبر پاتے ہی لپکا چلا آتا تھا۔ سلام دعا تو دور رہی، دیکھتے ہی للکارے۔

"کیوں میاں کس کنکالہ کو پکڑ لائے۔؟"

"کنکالہ۔؟" بیٹے کے دیدے الٹے سیدھے گھومے، حلق کا تھوک بمشکل اندر گیا، کھنکھارے اور بولے۔

"وہ — وہ تو جی۔ آپ کی بہو ہے۔"

"ہائیں۔! بہو۔؟"

بس یہی دو الفاظ ان کے منہ سے نکلے اور پھر جو چپکی لگی تو زبان کھلی ہی نہیں — دھاں پھوں۔ دھاں پھوں کرتے سارے میں پھرا کرتے۔ وہ تو کاوے نے ساری روداد

سنادی کہ کیسے میاں جی بٹیا کے "عسک" میں پھنسے، کیسے بڑے صاحب نے بٹیا کو "آجادی" دے رکھی ہے کہ جو چاہے کرتی پھرے۔ رہا ڈپٹی صاحب کا معاملہ تو دور کی بات تھی۔ بٹیا تو اچھی تھی ہی۔ مگر چراغ لیکر ڈھونڈھتے تب بھی ایسا داماد نہ ملتا۔ اگر داماد مل بھی جاتا تو ایسا نہ ملتا جو بٹیا کو اتنی چاہت سے بیاہ لے جاتا۔ اکلوتی اولاد کو اکلوتے باپ کی ذرا تو یاد نہ آئی۔ اور بھئی بوڑھوں کا کیا ہے صرف سہرا دیکھ لینے سے ایسا کون ارمان پورا ہو جاتا ہے۔ اصل چیز تو "گھر" زندگی ہے سو کبھی نہ کبھی دیکھ ہی لیں گے۔

سو آج دیکھ رہے تھے۔۔!

کس کا بیٹیا۔؟ کہاں کی بہو۔؟ جو حالات کا پتہ چلے۔ اور حالات بھی ایسے تو کیا جی ٹھیرے؟ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔ وہ تو ڈپٹی صاحب کا بیٹا تھا! اپنے زمانے میں اچھے اچھوں کے تین پانچ کروا دیئے۔ بیٹے کو کیا خاطر میں لاتے؟ مگر برا ہو تبادلے کا، باپ بیٹے پھر آن ملے۔ اور اب تو لنڈ منڈ، گول گول پوتا بھی ساتھ آیا۔ جب ایک ہی شہر میں دونوں کی سروس چلے تو الگ گھر کیسے رہ سکتے ہیں؟ اور پھر باپ کی پنشن ہو گئی تو جاتے بھی کہاں۔؟ رہتے تو یہیں تھے، مگر سدا انگاروں پر چلا کرتے۔ اپنے وقتوں میں انھوں نے بھی انگلش بگھاری تھی اور صاحب لوگوں کی دنیا دیکھی تھی۔ مگر وہ جو پرانے وقتوں کی خوبو تھی تو جاتی کیسے، بہو بیٹے کا کیا حال تھا کہ بس توبہ۔!

اس طرف سسر کا کمرہ، اس طرف بہو بیٹے کا۔ دنیا نے کیا ترقی کی کہ ساری شرم و حیا ہی جاتی رہی۔ بیٹے آفس کو جا رہے ہیں اور علی الاعلان میم صاحب سے کہہ رہے ہیں "واہ بھئی وا، آج تو الوداعی "کس" دیا ہی نہیں"۔ اور پھر چٹاخ پٹاخ شروع ہو جاتی۔ "ارے نا معقولو، یوں پیار کرنے کو کون منع کرتا ہے۔؟ مگر ذرا یہ تو سوچ لو کہ

دیوار آڑ ہی بڈھے باپ کا کمرہ ہے۔ لاحول ولا۔!"

ڈپٹی صاحب کا دل کبھی بہو بیٹے سے نہ مل سکا۔ پوتا تھا وہ الگ گنوں کا پورا۔ ایک آیا سدا اس کے ساتھ لگی رہتی، مگر وہ جب دیکھو تب دادا کے کمرے کو گھسا آتا۔ ماں باپ پپا پپا پکارتے تھے۔ سو آپ بھی دادا کو پپا کہنے لگ گیا۔ ان کی نماز کی جگہ، قرآن شریف جانماز سب الگ تھلگ کونے میں ہوتی۔ یہ جاتا اور عین جگہ موت کر آجاتا۔ بہو سے تو باپ مارے کا بیر تھا۔ نام تو کبھی لیا ہی نہیں۔ ترقی پسند گھرانے کی بٹیا کو سوائے میم صاحب کے اور کیا کہہ کر پکارا جا سکتا ہے۔ پوتے کی خطا پر بہو یاد آتی۔

"دیکھو میم صاحبہ تمہارے بچے نے جانماز پر پیشاب کر دیا۔"

"پپا" وہ بڑی منمنانی آواز سے بولتی، "میں نے سکھا تو نہ دیا ہوگا۔"

"اور کیا میں نے سکھایا ہے۔؟" الٹ کر وہ ہر بار یوں ہی جواب دیا کرتے۔

بہو بیٹے تو جیسے تھے سو تھے۔ پوتے پر بھی ان کا کیا حق چلا۔؟ مسلمانوں کا گھرانا اور نام دیکھو کیا الٹ پلٹ رکھ چھوڑے تھے۔ ایسا کیا اب سوائے پنکی کے دنیا بھر میں کوئی نام ہی نہ ملا۔

اور تو اور جب وہ کانچ کی گڑیا جیسی بچی پیدا ہوئی تھی کلو کے ہاتھوں سندیسہ کہلوا بیا کہ مریم نام رکھیں۔ تہیں صاحب دہاں تو وہی ہوگا جو جی میں آئے گا۔

"ارے کلوے تو کیا جانے رے نام وام؟ یہ بیٹے صاحب فرما رہے تھے! اس کی آنکھیں تو دیکھ کیسی نیلی نیلی ہیں۔ بس اس کا نام تو نیلم ہی ہوگا۔"

دادا نے مارے غصے کے کبھی نیلم پری سے ہٹ کر کچھ نہ کہا۔ یوں بات ہی کیا کرتے؟ جو کبھی شکایت کا موقع آتا تو بس نیلم پری ہی بول جاتے۔

اپنے کام میں مگن رہتے۔ دن بھی گذر جاتا پڑھنے لکھنے میں رات بھی۔ اب جو پنشن

ملی تو گویا مرنے کا پروانہ آگیا اب تو سارا سارا دن گھر پر ہی پڑے رہتے۔ کبھی کتاب الٹ رہے ہیں، کبھی وہ رسالہ، کبھی پرانے پرانے دوستوں کے خط نکال نکال کر پڑھتے تو کبھی طالب علمی کے زمانے کی تصاویر لے کر بیٹھ جاتے۔ کلوا بار بار یاد کیا جاتا۔

"ابے دیکھ، یہ جب کی تصویر ہے کہ ہیں بیس سال کا تھا۔

"تو نے پہچانا یہ کون ہے۔؟ ابے میں ہی تو ہوں۔ ڈرامے میں میں بادشاہ بنا تھا۔"

یوں ڈھیر سارا الم غلم آس پاس دکھائی پڑے تو بھلا بچوں کو چین کیسے آئے۔؟ ادھر سے پنکی اُدھر سے نیلم۔ کبھی یہ اٹھائیں، کبھی وہ پٹخ دیں۔

"میم صاحب سے بولو اپنے بچوں کو بلوائیں۔ میں الٹے ہاتھ کی جھاڑ دونگا۔ ہاں۔"

"میم صاحب سے کہہ دو، رونے چلانے کی آواز آئے تو پھر دوڑتی نہ آئیں۔ ہاں۔"

اور کبھی ایسا ہو جاتا کہ دادا جی نے دانت پیس کر ایک آدھ جماہی دی، ادھر سے سراج دوڑا آتا، ادھر سے ناہید بلبلاتی ہوئی نمودار ہوتی۔ سراج تو بگڑے تیور دیکھ یونہی ٹھٹک جاتا، ناہید ماں کا دل لئے لئے کانپ جاتی۔

"پپا، کوئی حد ہے۔؟ گال تو دیکھئے کس قدر لال ہو رہا ہے۔"

یہ ایسا طعنہ چھوڑتے۔" باپ گورے، ماں گوری، اولاد کیوں ڈھیڑوں کے ایسی آئے۔؟ وہ تو گال ہی خود بخود لال ہیں۔"

ناہید پاؤں پٹختی چلی جاتی تو یہ ہاتھ جھلا جھلا کر وارننگ سی دیتے۔

"بچو! جو اب کے آئے تو یاد رکھنا، ہاں، خون نکل پڑے گا منہ سے۔"

چیلیں جوں گوشت پر منڈلاتی ہیں یہ دادا پر منڈلاتے۔ ادھر ان کا ٹھینگی پٹارہ کھلا کہ دونوں موجود۔ دادا کی جھڑکی گھرکی سن ہی رہے ہیں اور شرارتیں کر ہی رہے ہیں۔ اور بڑے میاں آجا کے۔ میم صاحب، صاحب کرتے دوڑے جا رہے ہیں۔

"میم صاحب تمہیں اپنے کام دھام سے فرصت ہو تو دیکھ جاؤ کہ ان نامعقولوں نے میری داڑھی کی کیا گت بنا رکھی ہے۔"

دادا کو داڑھی رکھنی تو قیامت ہو گئی۔ آجا کے کم بخت داڑھی کی شامت۔ نیلم تو اسے باربی موٹی جھاڑو ہی سمجھتی۔ کئی بار اصرار ہو چکا تھا کہ وہ سفید کالی جھاڑو ان کے استعمال کو دیدی جائے، مگر پپا سنتے کب تھے۔؟

"سنا میم صاحب تمہاری نیلم پری نے میری داڑھی مٹھی میں پکڑ لی۔ آخر تمہارے ہاں تہذیب، تربیت سکھائی جاتی تھی کہ نہیں۔؟"

"پپا۔؟ بائی گاڈ میں آپ کی شکایتیں سنتے سنتے بور ہو چکی ہوں۔ دیکھ لیجئے گا ایک آدھ دن میں خودکشی کر لوں گی۔"

"تم سے پہلے میں کیوں نہ کر لوں۔؟" اور جب وہ تیز تیز قدموں سے صحن میں کھدے کنوئیں کو دوڑتے تو خیال آتا کہ پہلے اپنی کتابیں تو سمیٹ لوں۔ کون جانے میرے مرے بعد پوتا پوتی کیا حشر کر دیں ان کا۔؟ کتابیں سمیٹتے رکھتے۔ قفل لگانے تک مرنے کا خیال اچھا خاصا دور ہو چکا ہوتا اور پھر ایسے شیطانوں کے پیچھے مرنا اور وہ بھی خودکشی کرنا، کس قدر وسیی بات تھی۔ ان سے تو گن گن کر بدلے لینے کو کئی سو سال زندہ رہنا چاہئے۔ ہاں، یہ ہوئی نہ کوئی بات۔

دو چار مہینے میں ہی پتہ چل گیا کہ پوتا پوتی سے تو دل ملتا نہیں۔ اور وقت تو کاٹے سے کٹتا نہیں۔ بیٹے بہو سے تو آگے ہی دل میلا تھا۔ کم بخت پنشن بھی کیا موقعے سے ملی تھی۔ اس دن ٹہلتے ٹہلتے صدر گئے۔ آتے آتے دائیں ہاتھ میں پنجرہ لٹکالائے پنجرے کے اندر میاں مٹھو براجمان۔ ہرے ہرے پر، لال لال چونچ، بیچ میں لگی میخ پر ادھر سے اُدھر اُدھر سے ادھر پھدک کے جارہے تھے۔ ابھی پھاٹک کے اندر داخل

ہوئے بھی نہ تھے کہ ٹیں ٹیں، ٹائیں ٹائیں کی آواز سارے میں مچ گئی۔ ناہید نے سوئیٹر بنتے بنتے سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی میں پردہ جھول رہا تھا اٹھ کر آئی۔ دیکھا تو سسرے مٹھو سنبھالے چلے آرہے ہیں۔

"ہونہہ! اب مٹھو سے دل بہلائیں گے۔" اس نے جل کر سوچا اور پھر سے آکر صوفے میں دھنس گئی۔ نیلم پری اور بنکی کسی معرکے کو سر کرنے میں جتے ہوئے تھے۔ نئی نوالڑی آواز جو سنی تو ادھر ہی لپکے آئے۔

"ارے پپا یہ کیا ہے۔؟"

"پپا اسے کیا بولتے ہیں۔؟"

"ارے پپا......"

"تمہارا سر۔!" وہ جل کر بولے۔

"ہمارا سر۔؟ پھر ہمارے سر کو کیا بولتے ہیں۔؟"

کلوا انگوٹھی سے ہاتھ پونچھتا برآمد ہوا۔

"ارے مالک یہ مٹھو کاہے خرید لائے۔؟"

(ہوں تو مٹھو نام ہے اس چڑیا کا۔؟)

دونوں آگے پیچھے ڈرائینگ روم کو دوڑ گئے۔

"ڈیڈی، ممی، پپا مٹھو لائے ہیں۔!"

"پپا مٹھو لائے ہیں۔!"

اب ڈپٹی صاحب خالی وقت میں مزے سے مٹھو کو باتیں کرنا سکھاتے رہتے۔

"مٹھو میاں روٹی چاہیئے۔"

"مٹھو میاں کو غصہ آگیا۔"

"ڈپٹی صاحب، مٹھو کو پانی پلائیے۔"

بیچ بیچ میں پنکی اور نیلم گھس گھس کر اپنی ٹانگ اڑاتے۔

"نیلم بی بی مٹھو کو روٹی کھلاؤ۔"

"پنکی صاحب، مٹھو میاں کو غصہ نہ دلائیے۔"

تاؤ میں آکر ڈپٹی صاحب نے مٹھو کو سکھا دیا۔

"پنکی فول، نیلم پری نامعقول۔"

پنکی نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔

"مٹھو پیارے بولو، دپپا فول، پپا فول"

آدھی بات مٹھو کے منہ میں، آدھی بات پنکی کے منہ میں تھی کہ پپا اٹھے اور پوتے پر لپک پڑے۔ پوتا بھی ڈپٹی صاحب کا تھا۔ آگے آگے پنکی، پیچھے پیچھے پپا۔ دونوں بھاگتے بھاگتے سراج کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو اسے قہقہہ لگاتے ہی بن پڑی۔ بیٹے کے ہنسنے پر ذرا اپنی پوزیشن کا خیال آیا تو دھیرے سے چھڑی ٹیک اپنے کمرے کو ہولئے۔

"نامعقول کہیں کے۔" انہوں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے دل کی جھان اتاری۔

"ایسے بیہودہ بچے تھے کہ مٹھو کو چین نہ لینے دیتے۔ اچھا یہ بات ہے دیکھوں گا بچو جی۔! جو ادھر آئے تو ٹانگ ہی توڑ ڈالوں گا۔"

کلوا ناشتے کے لئے انڈے خرید کر لایا تو ڈپٹی صاحب کی نیت میں فتور آگیا۔ ایسے بڑے بڑے انڈے! واہ بھئی واہ! بچے نکالنے چاہئیں۔ ایسے انڈے تو بس لیگھارن مرغیاں ہی دے سکتی ہیں۔۔ یا پھر منار کا۔

"چلو انڈے بٹھاتے ہیں۔"

بیکار آدمی کا دماغ تو یوں ہی شیطان کی دوکان ہوتا ہے۔ انھیں کام تھا بھی کیا؟ پتہ پوچھ خود ہی انڈے خریدنے چلے۔ اکیس انڈے، ان پر بٹھانے کو ایک کڑک مرغی اب نکلیں گے بچے اور ترسیں گے وہ بے ہودے سراج زادے۔

مرغی کی وہ خاطریں ہوتیں کہ بس اپنی بیگم کی ہی کی ہوں گی۔ جب کہ وہ خود بچہ دینے والی رہی ہوں گی۔ روزانہ انڈوں کی گنتی ہوتی۔ اس کے سونے جاگنے، کھانے پینے کا خیال رہتا۔ جب تک یہ دانہ چگتی بیٹھے انڈوں کی رکھوالی کرتے کہ پنگی اور نیلم پری انڈوں کو خرد برد نہ کردیں۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے رہتے کہ اندر چوں چوں تو نہیں ہو رہی ہے۔؟

اکیسویں دن تو سچ مچ ہی چوں چوں، چیں چیں کی آواز سنائی دینے لگی۔ بس خوشی کا عین میں وہی حال تھا کہ جیسے سراج میاں پیدا ہوئے ہوں۔ مرغی تو خود ہی اپنے بچوں کے حق میں شیرنی ہوتی ہے مگر یہ کیا کم تھے۔ چیل اٹھا کر نہ لے جائے، اس مارے آگے پیچھے ہی رہا کرتے۔ یہ چیل کے بجائے شکرا ہو کر رہ گئے۔

"اب جلیں کمبخت چوزے دیکھ دیکھ کر۔" وہ دانہ چگاتے چگاتے مزے سے سوچتے۔ بچے کس کی ماننے والے تھے۔؟ ڈیڈی ممی ناں ناں کرتے ہی رہتے اور یہ دادا کی گود میں گھسے ہی جاتے۔ کسی چوزے کی دم پکڑ کر اچھال دی، کسی کو اپٹے دے دی۔ دادا کو دق کرنے کسی کو جنگلے سے باہر نکال دیا۔ کسی کو باغ کی راہ بتا دی کہ کھودتے رہو اور دادا جی کو جلاتے رہو۔

ایسی بے ہودی ماں تھی۔ یہ مرغی بھی۔! سارے بچوں کو لیکر باغ میں گھس جاتی اور پنجوں سے ساری زمین کھودنی شروع کر دیتی۔ ماں کی قیادت میں بچے بھی کھودا کھادی

شروع کر دیتے اور ڈپٹی صاحب کا ناک میں دم آجاتا ہنکالتے ہنکالتے۔

مرغیوں کو بند کرتے تو اکھڑے اکھڑے پودے اور بچی کچائی گھاس دعوت دیتی کہ آؤ میاں ہمیں قرینہ دو۔ پائنچے کھونس، آستینیں چڑھا یہ لوگ گارڈ ننگ پر تل جاتے۔

بیچ بیچ میں ننکی اور نیلم پری اپنی خدمات پیش کیے جاتے۔

"پپا، لائیے گڑھا ہم کھودیں۔"

"لائیے زمین کھرپ دیں۔"

باپ کی طرف سے ایسا غصہ دل میں بیٹھا تھا کہ کسی بات کا ٹھیک سے جواب نہ دیتے۔ رہ رہ کے ممی کو طعنے پڑتے۔ اور خود بچوں پر گالیاں۔ مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھتے تو پامسٹری کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتے۔ اب بڑھاپے میں پامسٹ بننے کا شوق چرایا تھا۔

ایک دن کتابیں الٹتے پلٹتے بیٹھے تھے کہ دونوں جان پر وارد ہو گئے۔

"پپا یہ آپ دن بھر کیا پڑھتے رہتے ہیں۔؟" ننکی بولا۔

"اور جھک کر ہتھیلی میں کیا دیکھتے رہتے ہیں۔؟"

نیلم پری تو بس ننکی کے نقشِ قدم پر چلتی تھی۔

"تمہارا سر۔!" ان کا سدا ایک ہی جواب ہوتا۔

"واہ، آپ کی ہتھیلی میں ہمارا سر کہاں سے آئے بھلا۔؟" ننکی حیرت سے بولا۔

"پپا جھوٹ بولتے ہیں۔" نیلم نفرت سے بولی۔

اور جیسے انھیں قائل کرنے کو ننکی بولا۔ "سعید انکل سے آپ کہہ رہے تھے کہ نئیں کہ ہاتھ دیکھ کر آگے کا حال بتاتے ہیں۔"

اس نے شرارت سے اپنی ہتھیلی بڑھا کر کہا۔ "پپا کل میں کیا کروں گا۔؟ بتائیے تو۔"

دادانے گھور کر ہتھیلی کو دیکھا اور بولے۔ "ڈنڈے کھانے کی آرہی ہے کیا۔؟"

پنکی ہتھیلی بڑھائے ہی تھا تو دانت اُچکا کر بولے ۔کل تو آپ مٹھائی کھائیں گے جناب، ای ای۔"

دوسرے دن پنکی اور نیلم صبح ہی صبح اٹھ بیٹھے۔ دادا کی کہی بات تو پوری ہونی ہی تھی۔ دونوں ان کے کمرے میں گھس گئے۔ داداجان ناشتے کے لئے اودولٹین، بسکٹ اور مسکہ سلائس لاکر رکھتے ہی تھے۔ دونوں نے انھیں بالکل سچا پامسٹ بنا دیا اور سچوٹی جتانے کو ان کے پاس پہنچ بھی گئے۔

" پپا آپ تو سچ مچ ہی سچا حال بتاتے ہیں۔"

انھوں نے چشمے میں سے گھورا۔ نیلم نے بات کی وضاحت کردی۔

" کل آپ نے کہا تھا نہیں کہ مٹھائی کھائیں گے۔؟ آج تو سچ مچ کھالی۔ وہ آپ کے کمرے میں کریم بسکٹ۔ جیلی اور مکھن تھا کہ نہیں۔"

پپا لپک کر اٹھے اور الماری کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ قسمت کا حال کتنا سچا بتایا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے میں سرخ سرخ آنکھیں لئے چنگ رہے تھے۔

میم صاحب تمہارے صاحب بہادر کی تنخواہ پورے ساڑھے سات سو ہے۔ اپنے لاڈلوں سے کہو اپنے باپ کا کھائیں۔ باپ کے باپ کا کیوں کھا جاتے ہیں۔؟"

"کیا ہوا پپا۔؟" وہ پلّو سنبھالتی ہوئی بولی۔

" تمہارا سر۔! ایک سرے سے سارا خانوادہ ہی اوندھا ہے۔ شوہر دیکھو تو اس رنگ کے، بیوی دیکھو تو اس رنگ کی، اور بچے دیکھو تو ایسے۔ آخر تم لوگ مجھے جینے دوگے کہ نہیں۔؟"

" ہم نے بھلا کیا منع کیا ہے آپ کو جینے سے۔؟"

"ہاں ہاں میں تو خود ہی گویا مرنا چاہتا ہوں نا۔" ان کی اس طرح کی الٹ پلٹ باتوں سے ناہید زچ آ چکی تھی۔

"میری کسی چیز کو چین نہیں۔ کمرہ دیکھو تو کباڑ خانہ۔؟ باغ دیکھو تو اگھل بگھل۔؟ مرغیاں دیکھو تو پر نچی۔؟ مٹھو دیکھو تو گالیاں سکھا رکھی ہیں بے ہودوں نے۔؟ بلی دیکھو تو لنگڑی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟" وہ چیخ کر بولے۔

ناہید نے کچھ جواب نہ دیا تو جھلا کر بولے "یہ تعلیم یافتہ گھرانے کی بات ہے۔ ہونہہ۔! بچوں سے یہ تک نہیں سکھایا کہ بڑوں سے کیا سلوک کرتے ہیں نامعقول کہیں کے۔"

سراج ان کے پیچھے ہنستا ہوا نکلا اور بیوی سے بولا۔

"کیوں برس رہے تھے پپا۔؟"

ناہید الجھ گئی۔ "خوب ہیں آپ کے پپا بھی۔ کوئی بات سی بات ہو۔ جانے کیوں گرم ہو رہے ہیں ہر دم؟"

"ارے ڈارلنگ میں نے ستر بار تم سے کہا ہے کہ بوڑھے آدمی ہیں۔ ان کی بات کا نوٹس نہ لیا کرو۔ دراصل میں نے تو میرج کر کے انھیں مستقل ناراض کر دیا ہے۔ ویسے برے آدمی نہیں ہیں۔ یقین کرو۔"

"بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کلیجہ چھلنی کر دیا ہے میرا تو۔" سراج ہنس دیا۔ بولا

"چپ اوپر سے بتانے کو ایسا کرتے ہیں۔ بیچ بیچ تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"ہاں آپ تو اپنے پپا کی سائیڈ لیں گے ہی۔ بتانے کو بھی کوئی اتنے سالوں تک غصہ بنایا کرتا ہے۔ شادی ہو گئی۔ بچے ہو گئے۔ بچے باتیں کرنے لگ گئے اور جناب کا غصہ ہی نہیں اتر چکتا۔ اپنی تو جان ضیق میں ہے۔ آپ تو ٹھیرے باہر کے آدمی۔ دن بھر گھر میں وہ ہاہا مچا رہتا ہے۔ ادھر مرغیاں کڑکڑا رہی ہیں۔ ادھر سے مٹھو نے، مٹھو پیارے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بلی میاؤں میاؤں کرتی لپک رہی ہے

تو مرغے وقت بے وقت اذانیں دے رہے ہیں۔ اچھا خاصہ انیمل فارم کھول رکھا ہے آپ کے پیا نے تو۔"

سراج ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا۔ ادھر پچھواڑے سے ابھی تک ڈپٹی صاحب کے کڑکڑانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

اب کبھی ننکی اور نیلم بیری ڈپٹی صاحب کو ستانے آن ٹپکتے تو وہ بھی بہرے بن جاتے مزے سے مگن رہتے۔ باجری اور جوار کی کوٹھی مرغیوں کو چگاتے رہتے۔ دونوں پیچھے سے مرغیوں کو ایسے ہنکاتے کہ کبھی تو پیا کے کندھے پر کبھی سر پر۔ اس وحشت میں کسی نہ کسی مرغی سے خطا ہو جاتی اور پیا بیچارے گویں نہا جاتے۔ دیدے سرخ کرکے پیچھے لپکتے، تب تک دونوں اڑنچھو ہو جاتے۔ باغبانی کرنے کو کیاری میں پہنچتے تو جھارے سے جا بیجا پانی انڈیل دیتے۔ مٹھو کو باتیں کرنی سکھانے تو دونوں گالیاں سکھانے تیار ہو جاتے۔ کتابیں لے کر بیٹھتے تو پیچھے سے کرسی کو ایسے دھکے دیتے کہ بس کتابیں رکھتے ہی بن پڑتی۔ کبھی بلی کو پیار کرنے کا موڈ سوار ہوتا تو نامراد اس کی دم کھینچ کر ہنگامہ کھڑا کر دیتے، ڈپٹی صاحب کی جان زچ آچکی تھی۔

اس دن سہ پہری کو ناہید اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ سراج آفس کا کوئی اہم کام کر رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب حسب معمول اپنی الٹھا ہنج میں جتے ہوئے تھے اور ننکی اور نیلم باغ میں روندن مچا رہے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کوئی مرغی ان کی ممی کی کیاری کے گلاب کو بھی چگ گئی تھی۔ اس سے بدلہ لینا ضرور تھا۔ وہ جدھر جدھر جاتی دونوں بھی پیچھے پیچھے ہی جاتے۔ اس مقابلہ بازی میں باغ کی وہ گت بن گئی کہ پیا کا بھلا خاصا باغ کھنڈیرا بن گیا۔ ڈپٹی صاحب کی وہ حالت کہ بس انگاروں پر بیٹھے ہوں جیسے۔ دونوں کو دیکھ دیکھ ایک تو ان کے تنک تنک چلتے ہوئے بہو کے کمرے پر وارد۔

یوں ہی آگ لگا کرتی۔ بہو تھی تو تھی۔ بیٹا بھی اس کے رنگ میں رنگ گیا کم بخت! سیر سپاٹے کو جاتے وقت جب گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ہاتھ اور آنکھوں میں آنکھیں۔ لاحول ولا۔ اور جو میاں کو پیار آتا تو وہ کافوری پنجہ اپنے منہ تک لے جاتا اور ۔۔۔ کوئی بے شرمی سی بے شرمی ہے۔ ارے یوں محبت کرنے کا شوق ہی ہے تو شوق سے کرو۔ مگر یہ تو سوچو کہ گھر میں بڈھا باپ بھی ہے۔ ہر پھیر وہ یہی سوچے جاتے۔ آخر ہماری بھی شادی ہوئی تھی۔ ہم بھی تو ہائی سوسائٹی میں موو (MOVE) کرتے تھے، مگر اس بے ڈھنگے پن سے؟ بس ماں باپ کے کاربن تھے۔ یہ دونوں تو ذرا جو کوئی کام میں ڈھنگ ہو۔

"ہیم صاحب میں نے کہہ دیا۔ اپنے بچوں کو دیکھو ورنہ ......" ناہید سونے کے قریب تھی، یوں کفن پھاڑ کر وہ چلائے تو اس کی آنکھ چٹ سے کھل گئی۔ گھبرا کر بولی۔

"کیا ہے پپا۔؟"

"دونوں نے میرا سارا باغ روند ڈالا۔ کیا تمہارا کام نہیں ہے کہ انہیں تنبیہ کرو۔"

"آپ ہی نے انھیں سر چڑھایا ہے تو میں بھی کیا کروں۔؟" وہ جھلا گئی۔

"میں نے؟" وہ چیخ کر بولے "ارے میں نے یا تم نے اور تمہارے صاحب بہادر نے۔؟"

"آپ نے۔ آپ نے۔ آپ نے اگر پہلے سے ہی آپ یوں محبت نہ کرتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ آپ کے منہ آتے۔؟"

ڈپٹی صاحب کو بچھو کاٹ کھا گیا۔ "محبت؟ ارے میں ان حرامزادوں سے محبت کرتا ہوں۔؟ تھو۔ لاحول ولا۔! یہ نکمے محبت کے قابل ہیں بھلا۔؟"

حرام زادے! کیا یہ حرامی پلے تھے۔؟ باقاعدہ شادی ہوئی تھی تب پیدا ہوئے تھے۔ پھر یہ پپا کیا کہہ رہے ہیں۔؟

ناہید کا چہرہ بھبھک گیا۔

"پپا آپ کی بُری بھلی بات برداشت کرلی۔ مگر آپ یہ گالیاں بھی دینے لگے ؟"

"ہاں ہاں دونگا۔ دونگا۔ دونگا۔" پھر وہ بالکل بچوں کے انداز میں چلائے۔

"ای ـــ ای ـــ ای"

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ناہید کو یوں بوڑھے سارے آدمی کو زبان چڑاتا دیکھ ہنسی کا دورہ پڑ جاتا، مگر اس سمے وہ ادور ہو رہی تھی۔ اس نے وہ ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا جو نپولین کے پاس بھی نہ تھا۔ آنسو۔!

سراج فونٹین ہاتھ میں تھامے تھامے بیزاری سے باہر نکل آیا۔

"پپا، آخر آپ گھر میں سدا طوفان کیوں اٹھائے رہتے ہیں۔؟" اس کے لہجہ میں حد درجہ ناگواری اور بیزاری چھلک رہی تھی۔

کبھی کبھار جواب دینے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ صرف گھور ہی لیا جائے، سو ڈپٹی صاحب بھی محض گھور کر رہ گئے۔

سراج ابنی ہی کہے گیا۔" اور حیرت اس بات پر ہے کہ بچوں سے آپ یوں کھٹے کھاتے ہیں جیسے کوئی برابری والے ہوں۔"

"پھر کیا ہاتھ لمبے کر کر کے عورتوں کی طرح تمہاری میم صاحب سے لڑا کروں۔؟"

"کیوں، میم صاحب سے لڑنا ایسا کیا ضروری ہے؟" وہ تیکھا ہو گیا۔

"اس لیے کہ وہ مجھے پسند نہیں۔"

ناہید نے میاں کو دیکھا، جیسے۔ "اب کہئے نا۔؟"

سراج فونٹن گلے میں اٹکا کر، اکھاڑے میں اترنے کے سے انداز سے بولا۔

"بھلا یہ تو بتایئے کہ اس کی کون سی بات پسند نہیں۔؟ اس میں کیا کمی ہے۔؟"

"تم نے اتنی فارورڈ ہیوی کرکے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔" وہ بغیر جھجک کے بولے۔
"فارورڈ ہے اسی لئے ٹکی ہوئی بھی ہے۔ ورنہ آپ کی تکا فضیحتی سے تنگ آکر تو کبھی کی رفو چکر ہوگئی ہوتی۔"

"میں۔" وہ چیخے۔ "میں تکا فضیحتی کرتا ہوں۔؟"

"اور کون کرتا ہے پھر۔؟" سراج تیزی سے بولا۔ "میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر ناہید سے آپ کو کیا شکایت ہے۔؟ آپ کا کون کام پورا نہیں ہوتا؟ ناشتے میں دیر ہوتی ہے یا کھانا نہیں ملتا۔ یا نہانے کو گرم پانی نہیں میسّر؟ یا پھر اور کوئی شکایت ہے۔؟"

تھوڑی دیر بڑے میاں سوچتے رہے پھر رسان سے بولے۔

"ایسی تو کوئی شکایت نہیں۔"

"تو پھر برسوں سے یہ جھگڑے رگڑے کیوں چل رہے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب تیزی سے پیچھے پلٹے اور صفائی دینے کے انداز سے بولے۔ ان مردودوں کی وجہ سے۔ ان دو کمینوں کی وجہ سے۔ اگر اکیلی میم صاحب کا واسطہ ہوتا تو شاید میرا غصّہ اتر بھی جاتا۔ مگر انھوں نے۔" ان نامعقولوں نے میرا بھیجا آؤٹ کر رکھا ہے۔"

"کبھی ماں پر غصہ، کبھی بچوں پر۔ بات ایک ہی ہے۔ دراصل آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپکے گھر سے چلے جائیں۔" ناہید بہت دنوں سے یہ بات کہنی چاہتی تھی آج بول ہی گئی۔

"ہاں ہاں تمہارے باپ کا گھر نہیں میرا گھر ہے، چلی جاؤ۔ چلی جاؤ ابھی اسی وقت کون روکتا ہے۔؟ شہر میں بہت سے فلیٹ خالی ہیں۔"

سراج نے ناہید کو دیکھا، ناہید نے سراج کو۔

تھوڑی دیر عجیب ہیبتناک خاموشی طاری رہی، پھر سراج رسان سے بولا۔

" تو یہ بات تھی پپا۔ ! ہمیں پہلے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہم یوں آپ کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں، ورنہ آج سے سالوں پہلے گھر خالی کر چکے ہوتے " تھوڑی دیر رک کر وہ دھیرے سے بولا۔

"ہم کل یا پرسوں یہاں سے چلے جائیں گے ۔"

کئی سالوں بعد آج وہ دن طلوع ہوا کہ ڈپٹی صاحب کو سکون ملا۔ روزانہ تو صبح ہی سویرے دونوں پوتا پوتی ہلور مچانے آن موجود ہوتے تھے۔ آج ناہید کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تھا اس لئے اس نے دونوں کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔

" جو کمرے کے باہر قدم رکھا تو پیر کاٹ ڈالوں گی "

دونوں مرے مرے ہاتھوں سے سامان پیک کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب مزے سے فخر سے اپنے کاموں میں مگن رہے۔ گردن اونچی کر کر کے فاتحانہ انداز سے دیکھے جاتے، جیسے۔

" دیکھا کیسے بھگایا کم بختوں کو۔ ! "

دوپہر کے کھانے کے لئے ممی نے دروازہ کھلوایا تو دونوں کو چھٹی سی مل گئی۔ پھر دادا کے آگے پیچھے ہونے لگے۔ پنکی تالی پیٹ کر بولا۔

" اباجی، ہم نوئے گھر کو جا رہے ہیں "

" اور وہاں آپ تو ہوں گے بھی نہیں " نیلم نے لقمہ دیا۔

ڈپٹی صاحب کا پارہ چڑھ گیا " میں کون مرا جاتا ہوں تمہاری قربت کو۔"

غصے غصے میں سراج فلیٹ ڈھونڈ آیا۔ نوکروں اور مالکن نے مل کر پیکنگ ختم کی۔ دن بھر سارا الٹبرا اٹھانے میں ٹوٹ گیا۔ دونوں رہ رہ کر مڑ مڑ کر دیکھتے کہ اب پپا آئیں گے، تب پپا آئیں گے اور ہاتھ پکڑ کر روک لیں گے۔

" ارے تم دونوں بھی بس بچے سے ہی نکلے۔ کیا یوں گھر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ؟ "

مگر وہ تو وہیں کرسی پر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔ بس نماز ادا کرنے کو اٹھے، پھر کرسی پر

بڑا جان۔ ایک ایک کر کے سارا سامان بندھ گیا مگر ڈپٹی صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ٹرک میں سامان لد گیا۔ پھر اسکوٹر پھاٹک میں داخل ہوا تب بھی وہ وہیں جمے رہے۔ بیٹیا دیدے گھما گھما کر دیکھتا رہا مگر وہ ہلے تک نہیں۔

سب مرحلے طے ہو گئے تو بچے بیٹیا بہو ملنے کو آئے دور ہی سے رکھائی سے بولے۔

"جاؤ اللہ خوش رکھے! اور خوش کیوں نہ رکھے گا۔؟"

اسکوٹر میں بیٹھتے بیٹھتے تو سچ مچ ناہید کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"یوں گھر چھوڑنا کتنا برا لگ رہا ہے نا سجو۔" وہ دکھ سے بولی۔ "یہاں ہم نے کتنے خوشگوار دن گزارے۔"

سراج کی خود حالت غیر ہو رہی تھی۔ مگر وہ بھرم قائم رکھنے کو بولا۔

"کاہے کے خوشگوار دن تھے۔؟ دن رات تو کل کل میں گزرتے تھے۔"

مگر اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ "ہائے بیچارے پپا اکیلے کیسے رہیں گے۔؟ ان کے کھانے پینے کی کیا برابری ہو گی۔؟ جانے کیوں مجھ کم بخت کے منہ سے گھر چھوڑ دینے کی بات نکل گئی؟ سارا قصور میرا ہی تو ہے۔!" وہ پھپھک پڑی۔

سراج جھلا گیا کیسی عورت ہے یہ۔؟ خواہ مخواہ اپنے سر قصور منڈھ رہی ہے۔ تیزی سے بولا۔

"یہ خیال تو انھیں آنا چاہیئے تھا۔ کمال کرتی ہو۔"

اسکوٹر پھاٹک سے نکلنے لگا تو اس نے جھک کر دیکھا۔ شاید پپا روک ہی لیں، شاید ان کے چہرے پر غم کی چھاپ ہو۔! مگر اسکوٹر زن سے باہر نکل گیا۔

دوسرا دن ڈپٹی صاحب کے لئے عید بن کر آیا۔ صبح ہی صبح اٹھے۔ مگر یہ کیا؟ پانچ منٹ، دس منٹ، بیس منٹ، آدھا چھوڑ پورا گھنٹہ گزر گیا مگر بیڈ ٹی اب آتی ہے نہ جب۔!

"ہونہہ! ہم کب کسی کی پرواکرتے ہیں۔" جھلا کر اٹھے اور باورچی خانے کو چلے۔

ماما کو پھٹکار بتائی مگر وہ قطعی بے خبر تھی۔ یہ ساری دھوم دھام تو کلوے کے ذمہ تھی جو اچھا خاصا صاحب لوگوں کا بیرا بن گیا تھا۔

دھوپ تیز ہوئی تو انگنائی میں نکل آئے۔ کتابیں ٹٹولنی شروع کیں۔ ایک دو منٹ تو بڑی مستعدی سے پڑھتے رہے۔ پھر طبیعت بھن بھن کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے میں کتاب شلیف پر پہنچ چکی تھی اور یہ خود چلا چلا کر ماما کو آواز دے رہے تھے کہ ناشتہ میں کیا دیر باقی ہے۔؟

"آج کس قدر سکون ہے" انہوں نے بشاشت سے سوچا۔ چلو ذرا مرغیوں کی خبر لے آئیں۔ باجری جواری کی کوٹھن لے کر دڑبے کے پاس پہنچے۔ بڑے سکون سے مرغیوں نے دانہ چگا۔ پھر مٹھو کی باری آئی۔ کٹوری کا پانی بدلا۔ ہری مرچیں کھلائیں۔ کچھ باتیں کیں۔ چلنے کو ہوئے تو وہ تیزی سے بولا۔

"پپا فول، پپا فول"

یہ بھنّا کر مڑے اور بری طرح چلائے۔" ابے بول 'پنکی فول'۔ 'پنکی فول'۔ یہ گالی اس کمبخت نے ہی سکھائی تھی نا۔؟ اور پھر نامراد نیلم پری۔!"

مٹھو اچھل اچھل کر بولنے لگا۔

"پنکی فول، پنکی فول"

پھر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ باغ کو چل دیئے۔ جھارا اٹھا کر پانی دیا۔ پودوں کی کاٹ چھانٹ کی۔ پھر بلّی کی خبر گیری پر جٹ گئے۔ سارے مرحلوں سے نبٹ کر وہ مزے سے آرام کرسی پر دراز ہو کر پامسٹری پر تل گئے۔

دوسرا دن بھی وہی سکون اور اطمینان لے کر طلوع ہوا۔ باجری کھاتے میں کوئی مرغی گڑبڑا کر نہ اچھلی، اور اچھل کر ان کے کندھوں پر نہ بیٹھی۔ باغ میں پانی دینے کا

کا جھارا یونہی رکھا ہوا تھا۔ مٹھو سیدھے سادے سبھاؤ میں کہہ رہا تھا۔
"ڈپٹی صاحب مٹھو پیارے کو روٹی دیجئے۔"

کتابیں پیچھے سے دھکے دے دے کر گرائی جا رہی تھیں نہ اچھالی جا رہی تھیں۔ انھوں نے دو چار صفحے الٹ کر کتابیں واپس رکھ دیں اور بلی کو گود میں لے کر اس کی نرم نرم ریشم پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

تیسرا دن تو اس سے بھی زیادہ پُر سکون نکلا مرغیاں خاموشی سے دانہ چگتی ہی رہیں۔ تو اُنھیں تنک کر غصہ آگیا۔ "بھلا ایسی صلاحیت بھی کس کام کی۔؟ مگر وہ کیا سنتیں۔ ؟ مزے سے چگتی رہیں۔ پودے اپنی جگہ جھومے جا رہے تھے، نہ پتے نچے ہوئے نہ پھول ٹوٹے ہوئے۔ مٹھو بھی اِدھر اُدھر اچک کر روایتی انداز سے مٹھو پیارے، مٹھو پیارے کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔ بلی لنگڑا کر چل رہی تھی۔ نہ دادا کی کرسی پیچھے سے گھسیٹی جا رہی تھی۔ سارے میں ایسی خاموشی کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ مرغیاں تھیں سو پرلی طرف، بلی سو رہی تھی۔ پودے خاموش، کتابیں سوئی سوئی۔ مٹھو۔ وہ الگ پروں میں سر دبائے اونگھ رہا تھا۔

اک دم ڈپٹی صاحب تیزی سے اٹھے۔ پہلے تو مرغیوں کے پیچھے خوب دوڑے اتنا کہ سانس الٹ گئی۔ پھر جھارے میں پانی بھر کر کیاریاں بھگونے لگے۔ اپنے ہاتھوں پودوں کو کھسوٹا۔ پھر بلی کی شامت آگئی۔ اس کی دم پکڑ کر ایسے گھسیٹے دیئے کہ وہ بلبلا گئی۔ شلیف سے کتابیں جان جان کر گرانی شروع کر دیں۔ سارا گھر درہم برہم ہو گیا۔ اک دم لپک کر وہ مٹھو کے پاس پہنچے اور پنجرے کو زور سے جھلا دیا۔ سہما سہمایا مٹھو بری طرح جاگ پڑا اور ڈپٹی صاحب

کی صورت دیکھ کر چیخنے لگا۔

"پنکی فول، نیلم فول۔"

دونوں ہاتھوں سے انھوں نے پنجرے کی سلاخیں تھام لیں اور مٹھو کے کان میں چیخے۔ "بول، پپا فول، پپا فول۔" مٹھو نے کنمنا کر انھیں دیکھا اور پھر دونوں مل کر زور زور سے چلانے لگے۔

"پپا فول، پپا فول۔"

اور ٹپ ٹپ موتی ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر داڑھی میں جذب ہونے لگے۔



کانچ کا دِل

رانی دلہن پورے دنوں سے تھی۔

بی ساس کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہوگیا تھا۔ بڑے گھر میں یہ کوئی پہلا زچگی خانہ تو تھا نہیں جو یوں سیابی پھول کی طرح کھلی پڑتیں۔ مگر یہ بھی تو قسمت کی خوبی ہی تھی ناکہ اوپر تلے کے چار بیٹوں میں سے کسی نے تو اماں بیگم کو پوتے کی دادی نہ بنایا۔ لے دے کے انگنائی، صحنائی اور گھر بھرے میں لڑکیاں ہی لڑکیاں بھرا گئیں۔ اماں تو رہ رہ کر سوچتیں۔ "ہے ہے، جب بہو کو دیکھو ٹپاٹپ بیروں کی طرح بیٹیاں جنے جا رہی ہیں۔ آخر ان کا کیا ہوگا.؟ اور خاندان کا نام کیسے چلے گا۔؟" مگر وہ صرف سوچ تو سکتی تھیں لیکن لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روک کہاں سکتی تھیں۔

دھنیا دائی محلہ چھوڑ پورے گاؤں میں مشہور تھی جہاں کسی نئی نویلی پر اس کی نظر پڑی اس نے جھٹ وہیں بتا دیا۔

"میں کہوں بہو پوت جنے گی۔"

اگر کسی کو بیٹی ہونے کی بات سنا دی تو کیا مجال جو بیٹا سر اٹھا کر چلے۔ وہ تو چال دیکھ کر بات پہچانتی تھی۔ خود اس کی اپنی بہو نے ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر ڈالے تھے۔ میا کو بٹیا رانی کا وہ ارمان تھا کہ نچلے والے بیٹے کو سدا رنگین کپڑے پہنا کر زیور سے لادے رکھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، اور تو اور چھن چھن کرتی جھانجھیں بھی پیروں میں ڈال دیں۔ بڑی بوڑھیاں ٹوکتی بھی تھیں کہ"

کی تو عقل الٹ گئی ہے۔ بچپنے ہی سے اسے بیٹی کا سوانگ دے رکھا ہے۔ بھلا اس پر کیا اثر پڑے گا۔ ساری عمر ماں کے کوٹھے سے لگا ہانڈیاں دھوتا اور روٹیاں بیلتا رہے گا۔ بہو ان کے طعنے خوب سمجھتی تھی۔ مگر ممتا کے مارے جی کو ننھی منی سی کلی کی لگن تھی تو پوری بھی کیسے پڑتی۔؟ مگر اگلے برس جب بہو کو حمل ٹھہرا اور وہ سہم سہم کر قدم اٹھانے لگی اور املی گھلی پھر پھر کر کچے پکے بیر للچانے لگی تو ساس نے ایک دن اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہہ دیا۔

"میں کہوں اب ننھے کے انگ پر سے ریشم اور زیور اتار لے۔"

بہو نے چکرا کر ساس کو دیکھا تو ساس ہنسی اور بولی۔ "اور کیا یہ دیکھ، رات کو نیند میں میں نے تیرے گلے سے گلسرا اتاری اور تو کسمسائی تک نہیں۔ نیند ایسی ٹوٹ کر آئے تو بیٹی کو ساتھ لاتی ہے۔ اور پھر تیرا پیٹ تو دیکھ، ابھی سے پھیلا پھیلا سا ہے۔ بیٹا پیٹ میں رہے تو پیٹ اونچا رہتا ہے نا، اس لئے۔"

"اچھا۔؟" بہو ذرا خفگی اور شرارت سے بولی۔ "تو اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ بیٹی ماں باپ کی ناک کٹاتی آتی ہے تو پیٹ بھی چپٹا چپٹا ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے نا تیرا۔؟"

ساس تو اپنے چھ پوتوں کی دادی کہلائے جانے پر نازاں تھی ہنس کر برا مانے بغیر بولی۔

"اور بتا تو سہی، کون بیٹی نے ماں باپ کا مان رکھا ہے۔؟ آئی بھی ہے تو مہمان کے سمان۔ جاتے جاتے آنکھ میں آنسو اور دل میں درد ہی تو دیکر گئی ہے نا۔ بول جھوٹ کہتی ہوں؟"

بہو کچھ نہ بول پائی۔ مگر جب جاپے کے دن قریب آئے تو اس کو ساس کی بات رہ رہ کر یاد آتی رہی۔ اور جب کچے پکے دردوں سے گذر کر اس نے سکون کا سانس لیا تو دادی ہنس ہنس کر محلے والوں سے کہہ رہی تھی۔

"اے میں کہوں چوڑی والی کو بلاؤ ری، گھر میں سہاگن براجی ہے۔"

مگر رانی دلہن کے حق میں دھنیا دائی کی پیش گوئی بھی الٹی ہی پڑی۔ پیٹ دیکھو تو آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ اور جنم دیا بیٹی کو۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار یہی ہوا۔ گھر میں لڑکیوں کی فوج کی فوج تیار ہو رہی تھی۔ نہ جیٹھانیاں، دیورانیاں سبھی لڑکیوں والی تھیں۔ اس خاندان میں ہی بیٹوں کا کال تھا۔ ہاتھ کی بات تھی نہیں۔ یاسین درود پڑھ پڑھ کر بیٹوں کی پیدائش کی دعائیں مانگیں بھی۔ مگر اجڑے گھر میں کبھی تو دیا نہ جلا۔

اب کے پھر رانی دلہن پورے دنوں سے تھی۔ اور ساس کا دل پھر نیچے اوپر ہو رہا تھا دھنیا دائی کی بات پر یقین تھا نہ پیٹ کی ابھار نے انھیں امید بندھائی تھی۔ بس ان کا دل رہ رہ کر آپ ہی آپ کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو اب کے پوتا ہو گا ہی۔ مگر رانی کے دل پر تو ایسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے کہ سورج کی کرن بھی انھیں چیرتی تو اجالا نہ ہو پاتا۔ اور اسے اطمینان یوں بھی تھا کہ کچھ وہی ایک تو بیٹیوں والی ماں نہ تھی، یہاں تو سارے ملے ایک ہی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر چلے آ رہے تھے۔ نہ ساس نے کبھی رانی سے اپنی امید اور دل کی بات بتائی، نہ رانی نے ہی سوچا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ جب ایک رات سوتے سوتے رانی جاگی تو گھبرا کر یہی کہنے لگی۔

"ہائے اماں یہ کیسا درد ہے۔؟ پیٹھ سے اٹھ اٹھ کر لہریں سارے جسم کو پکڑے لے رہی ہیں۔ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا۔"

"ایسا پہلے کبھی تو نہ ہوا۔" اماں کے سارے جسم نے کان بن کر بس اتنی ہی بات سنی اور وہ بستر پر کل کے کھلونے کی طرح پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

کمرے میں اجوائن، عود اور دھوئیں کے غبار میں ملی جلی گرم گرم خون کی بو تھی۔ اور رانی کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کی لہریں۔ دائی نے اندھیرے سے اٹھا کر ہاتھوں کو

اونچا کیا اور جیسے آپ ہی آپ اس کی چیخ حلق سے یوں پھوٹی کہ رانی کا سارا جسم کانپ گیا۔
"اے دلہن میں کہوں بیٹا ہے۔ پورا کا پورا جیتا جاگتا بیٹا۔"
اور پھر 'ہیاں'، یا 'یاں'، 'ہاؤں'، ہاؤں' کی خوشگوار آواز سچ مچ بیٹے کی آواز۔
"میں آگیا ہوں۔ میں آگیا ہوں۔" اجالے لے کر، اور خوشیاں لے کر۔ ناک اونچی کرنے والا۔ خاندان کا نام چلانے والا۔
دائی پھرتائی سے باہر نکلی اور چیختی ہوئی اماں کے پاس پہنچی۔
"اری بی بی، سنا تم نے؟ بیٹا ہے بیٹا! چاندی کے کنگن پہنونگی، ہاں۔"
"اری دھیرے بول نامراد۔ ساری عمر بچے جناتے گذری، اتنا نہیں معلوم زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو دم چھوٹنے لگتا ہے۔ وہاں تو آگے ہی ندیاں بہہ گئی ہیں۔ اتنی خوشی کی خبر سنے گی تو جی کیا بولے گا۔ کتنے برسوں بعد تو آج اندھیرے میں چاند چمکا ہے۔"
اماں دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ رانی شطرنجی پر کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ایک ہاتھ زمین پر دوسرا کولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اب کے سے پھر لڑکی ہوئی ہے۔
"شرمندگی اور غم کے مارے اس نے منہ پھیر رکھا ہے۔ اب اُسے میں پہلے تو یہ کہوں گی کہ لڑکی ہوئی ہے۔ اور جب وہ رونے پر آئے گی تو بتا دوں گی کہ وہ تو آج خاندان کی سب سے قابلِ عزت اور قابلِ احترام شخصیت بن چکی ہے۔ سنا رانی تم نے ہمنا!"
ساس نے، جو پہلے ایک ماں تھیں اور اب ایک پوتے کی دادی۔ دھیرے سے بہو کا شانہ ہلا کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر رانی نے ساس کی طرف نہیں دیکھا، کسی کی طرف نہ دیکھا۔ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ خود ہی خدا کے حضور شکریہ پیش کرنے چل دے!۔

رات کی سیاہی صبح سے بدلی، صبح کی روشنی پھر تاریکی میں روپوش ہوئی، مگر اماں اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ آنکھیں پھٹی ہوئیں اور سانس رکی ہوئی۔ وہ ساروں کی باتیں سن رہی تھیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوں کہ کسی بات کی خبر نہ تھی۔ ایک ایک نے آآ کر ہلایا۔ پکارا۔ پچھتاوے دلائے، مگر نہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلا، نہ ٹکٹکی ٹوٹی۔ جس جگہ رانی نے صبح کا بھرپور اجالا بکھیر دیا تھا اب وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچیاں ڈھائیں ڈھائیں پھیر رہی تھیں اور بچہ پالنے میں پڑا روئے جارہا تھا۔ "ہیاں۔ ہیاں۔ می ہیاں۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔ تم کہاں چلی گئیں؟ تم نے میرے لئے دعائیں مانگیں، منتیں مانیں اور دعاؤں کا سہارا لیا اور اب جب تم تک چل کر آیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب میں کس کے پاس رہوں گا۔؟ کون مجھے میٹھا رس پلائے گا۔؟ سب مجھ سے دور دور بھاگ رہے ہیں۔ کسی نے میرے منہ میں کل سے دودھ کا قطرہ بھی نہیں ٹپکایا ہے۔ ابھی میں روتا ہوا آیا تھا کہ ہنسیوں اور مسکراہٹوں کی گود میں پلوں گا۔ مگر میرے آگے پیچھے، یہاں وہاں، اِدھر اُدھر، آس پاس آنسو ہی آنسو ہیں، چیخیں ہیں، آہیں ہیں۔ بے نور آنکھیں ہیں، اور تاریکیاں ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو کھالیا ہے۔ تائیاں، چچیاں مجھ سے دور دور بھاگ رہی ہیں۔ ایک دو دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا ساتھ ہے، کون دیگا؟ کون مجھے پیار سے گلے لگائے گا۔ امی دادی اماں مجھ سے بات نہیں کرتیں۔ ابو مجھے صرف دیکھ سکتے ہیں، سنبھال نہیں سکتے۔ پھر میں کہاں جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ ہیاں۔ ہیاں۔ می ہیاؤں۔"

رانی مسکرائی۔ دو ہاتھ سوکھے مارے مگر محبت کی آگ سے تپتے ہوئے ہاتھ، جن میں خون کی رمق بھی نہ تھی، جن میں چوڑیوں کی چھنک نہ تھی۔ پالنے کی طرف بڑھے

اور انھوں نے ایک ننھے منے گیلے گیلے وجود کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی منجھلی پھوپھی"، رانی جیسے سرگوشی میں بولی۔

پھوپھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کیسی آواز تھی۔؟ یہ کیسی سرگوشی تھی۔؟ یہ کون ان سے اس قدر قریب ہو کر گزر رہا تھا۔؟ انھوں نے کانپ کر بچے کو گلے لگا لیا۔

"میرے بچے! میرے بچے! میری جان!" ان کی آواز کانپ رہی تھی اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

منجھلی پھوپھی اماں کی سب سے چھوٹی نند تھیں۔ جب اماں بیاہ کر آئی تھیں تب تو وہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔ عمر میں وہ اپنے بڑے بھتیجے سے بھی دو چار برس چھوٹی ہی تھیں۔ بھتیجوں کے بیچ وہ گڑیا سی بہن نظر آیا کرتیں۔ سمجھنے والے انھیں بھی اماں کی بیٹی ہی سمجھتے۔ اماں تو پتہ نہیں کون سا خون، کون سا اثر لائی تھیں کہ چھ سات بیٹوں کے ساتھ ساتھ چار بیٹیوں کی بھی اماں بن بیٹھیں، ورنہ یہاں تو نسل در نسل یہی ہو رہا تھا کہ ایک آدھ لڑکا ہو گیا سو ہو گیا۔ جس سے خاندان چلتا رہا۔ جب اماں کی ساس مریں اس وقت تک سب اولادیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ بس ایک منجھلی نند ہی باقی رہی تھیں۔ ساس نے اُسے جیسے بہو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کچھ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ بھی سدا بھائی بھاوج ہی میں گھلی ملی رہی۔ دن بیتے اور اماں نے بیٹے بیٹیوں کے گھر بسانے شروع کیے تو منجھلی کو بھی ماں بن کر بیاہا۔ مگر رفو کو بھاوج کا ساتھ کچھ ایسا بھایا تھا کہ دور رہ ہی نہ سکی۔ جاڑوں کی ایک رات اس کے میاں نہا کر پنکھے کی ہوا میں سوئے اور صبح اٹھے تو سارا جوڑ جوڑ جکڑا ہوا تھا۔ تین چار دنوں میں رفو کیا سے کیا ہو گئی۔ بھاوج نے لال کپڑوں سے وداع کیا تھا۔ اور بھائی جب لائے ہیں تو سر سے پاؤں تک سفید برف کی کلی بنی ہوئی تھی۔ جی کھول کر ہنسنا رفو کو راس نہ آیا۔ اس کے ہونٹ سل گئے، ارمان گھٹ گئے اور وہ جلی شاخ کی طرح جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تاروں بھرا آسمان سر پہ جگمگاتا اور وہ دل میں اندھیرے لئے سسکتی رہتی۔

جاڑے، گرمی، برساتیں، خزاں، بہار سب اس کے لئے ایک جیسی بات تھی۔ اور جیسے جیسے دن بیتے وہ بھتیجوں، بھتیجیوں کے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے کو جیتی گئی۔ کوئی قصور نہ ہونے پر بھی ڈانٹ دیتا اور وہ خاموش اور معصوم آنکھوں سے دیکھ کر گویا اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرلیتی۔ میاں اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر مرے تھے۔ سارا پیسہ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ چاہتی تو اپنا ایک گھربار کرسکتی اور مزے میں جی سکتی تھی۔ مگر وہ انہی لوگوں میں جیتی آئی تھی، وہ ان سے ہٹ کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ وہ تو بھری بہار میں اجڑ کر رہ گئی تھی۔ کون اسے دیکھنے اور نہارنے والا بیٹھا تھا۔؟ پہنتی اوڑھتی بھی تو کس کے لئے۔؟ سارا پیسہ انہی بچوں پر اٹھا دیا کرتی۔ وہ مشین کی طرح ہر کام انجام دیا کرتی لیکن لیکن اتنے دنوں بعد اب پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

ننھا شمیم ابھی دو ہی چار دنوں کا تھا۔ بے چارے نے ماں کا دودھ چکھا بھی نہ تھا۔ اس کی زندگی کا کیا بنے گا؟ کیا یہ پھول کمہلا کر رہ جائیگا۔؟ رقو نے بے بسی سے ان ماؤں کی طرف دیکھا جن کی چھاتیاں دودھ سے لبریز تھیں اور محض دو گھونٹ اس ننھی سی جان کی زندگی کا سامان مہیا کرسکتے تھے۔ مگر اپنے خون سے کسی دوسرے کے لگائے پودے کو سینچنے کا ظرف کتنی ماؤں میں ہوتا ہے۔؟!

منجھلی پھوپھی نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ ماما کے سوتے تو مدت ہوئی وہاں خشک ہوچکے تھے۔ پھر پھر انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ انھوں نے روئی کی بتی بنائی اور گائے کے دودھ میں بھگو بھگو کر ننھے کے منہ میں ٹپکانے لگیں۔

زندگی کا یہ پہلا دور تھا جب وہ خوشی خوشی جینا سیکھ رہی تھیں۔ بچپن تو جیسا بتیا سو بتیا، بڑی ہوئیں تو ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیاہ کر میکے سے سسرال آئیں تو چند ہی

دنوں میں ساری خوشیاں جل کر خاک ہوگئیں۔ نہ وہ کسی کے لئے جی سکیں، نہ کوئی ان کے لئے زندگی کا سامان کرسکا۔ اب ان کی زندگی ایک نئی، پر بہار اور رنگین راہ پر چل پڑی تھی۔ وہ جیتی تھیں ننھے کے لئے، مسکراتی تھیں ننھے کے لئے۔ اور پھر ننھا تو سبھی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ کئی دن گزرنے پر اماں بی ہوش میں آئیں تو دیکھا کہ شمو نند کی گود میں رہ رہ کر ہمکتا تھا اور کوئی لینے کو ہاتھ بڑھاتا تو وہ منہ پھیر کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیتا۔ تینوں پوتیاں تو اماں ہی کی نظرِ شفقت کی مرہونِ منت تھیں۔ پوتا تو پورا بی نند کا تھا ایک دن اماں نے چار عورتوں میں بیٹھ کر کہا بھی۔

"اب رفو بیگم جانیں اور شمیم میاں۔ میں نے ان کی گود میں ڈال دیا۔ اب وہ ان کی ماں ہیں اور وہی ان کے بیٹے۔"

رفو پھوپھی کا دل جیسے اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں آنکھوں سے نکل پلکوں پر کپکپانے لگا۔

"میرا بیٹا! میرا بچہ!"

شمیم میاں ڈھیر ساری بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ کوئی انھیں پوچھتا نہ پوچھتا، ماں اور دادی کی تو آنکھوں کے تارے تھے ہی تھے۔ بس کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا۔ ابھی ایک برس کے نہ ہوئے ہوں گے، ضد کا وہ عالم تھا کہ کسی چیز کے پیچھے پڑ جاتے تو مچل مچل کر زمین آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ بڑے ابا ایک بار کہیں سے شیشے کا ایک گلدان لائے تھے۔ قیمتی اتنا نہ تھا جتنا خوبصورت تھا۔ اور پھر چیز جب پرانی ہو جائے اور وہ کسی بزرگ کے ہاتھ کی لائی ہوئی ہو تو وہاں قیمت کا سوال رہ بھی نہیں جاتا۔ وہ ایک قابلِ احترام چیز بن جاتی ہے۔ ایک دن کہیں شمو میاں نے وہ گلدان دیکھ لیا۔ ڈیڑھ پونے دو برس کے ہو رہے تھے۔ کھڑے تو ہوتے ہی تھے، ذرا دور تک چل بھی لیتے تھے۔ گلدان سنگھار میز کے پرلی طرف رکھا ہوا تھا۔ پھدپھداتے ہوئے گئے۔

اور گلدان اٹھالیا۔ قریب تھا کہ زمین پر دے مارتے کہ تائی بی نے دیکھ لیا اور چلّا کر دوڑیں۔

"ہے ہے ابامیاں کے ہاتھ کا لایا ہوا ہے"۔

ہاتھ سے گلدان جھپٹنا تھا کہ شمو نے چیخ بیخ کر حالت تباہ کر لی۔ لاکھ کھلونے دیئے جا رہے ہیں۔ لالچ دیا جا رہا ہے، مگر بہلائے نہیں بہلتے۔ منجھلی پھوپھی کہیں باورچی خانے میں ان کے دودھ دلیئے کی برابری کر رہی تھیں چیخ چاخ سنکر لپکی آئیں۔

"ہوا کیا۔؟" وہ تیزی سے بولیں۔ "ذرا چھوڑ کر جاؤں تو جیسے سب اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آخر بن ماں کا ہے۔"

تائی تنک کر بولیں۔ "بن ماں کا ہے تو جو چاہے کر لینے دیں۔؟ ابھی گلدان توڑ دیا ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں۔"

پھوپھی کو دیکھ شمو اور زور زور سے رونے لگا۔ رفو بیگم نے آگے بڑھ کر گلدان اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور دوسرے ہی لمحے خوشی خوشی شمو نے تڑ سے زمین پر دے مارا۔ معصوم مسرت کا سامان اسی تڑ میں پوشیدہ تھا۔

سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ تو سر سے اونچی جا رہی ہیں۔ ایسے تو بن ماں کے بچے کو ڈیڑھ کوڑی کا کر دیں گی۔ کیا بچے کی ضد ایسے ہی پوری کی جاتی ہے۔! دادی اماں کے کانوں تک شکایت جانے سے پہلے ہی منجھلی پھوپھا نے ایک نہ دو' چار گلدان منگوا کر میز پر سجوا دیئے۔

یہ پہلا وقت تھا جب منجھلی پھوپھی کا دل پوری طرح ایک ماں کی طرح تڑپا تھا۔ اور وہ اپنے جگر گوشے کے لئے سب سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ یہ ایک ہی ننھی بالکل ننھی سی بات تھی۔ مگر جیسے جیسے شمو بڑا ہوتا جا رہا تھا پھوپھی کی محبت دیوانگی اختیار

کرتی جا رہی تھی۔ ان کی زندگی نے محبت کا لفظ سنا ہی نہ تھا۔ محبت کرنے، چاہنے اور چاہے جانے کی اس لذت سے وہ یکسر محروم تھیں جو کبھی تو بیوی بن کر ملتی ہے اور کبھی ماں بن کر۔

شمو اپنی بہنوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی جان، نہ کسی بات کی سمجھ نہ اپنے پرائے کی تمیز۔ سب بچیاں کھیل رہی تھیں۔ چھپا چھائی کا کھیل ہو رہا تھا، ڈھولا ڈھائی بھی چل رہی تھی کسی نے سر پر ایک دھول جمائی۔ اس نے اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا اور پھر بے بسی سے پکارا۔

"امی"۔

رفو پھپھی دالان میں کرسی پر سوئٹر بنتی بیٹھی تھیں۔ اس کے اس طرح پکارنے پر پہلے تو وہ چونکیں، پھر ان کا پورا وجود تھرا گیا۔ امی ــ امی ــ امی ــ!

آج ایک ننھے سے وجود نے اپنی زبان سے پہلی بار ایک لفظ ڈھالا تھا، اور وہ لفظ تھا امی۔ ! اور امی کون تھی۔؟ سوئیٹر پھینک کر وہ لپکیں اور قریب پہنچتے ہی رک کر بے تابی سے شمو کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

"میں تیری ماں ہوں۔ ہاں تیری ماں ہوں۔ ایک بار پھر امی کہہ دے۔ کہہ دے میرے بچے! میرے بیٹے!" سینے سے ابال سا اٹھ رہا تھا۔ وہ پھپھک پھپھک کر روئے جاتی تھیں اور شمو کو اپنے سینے سے بھینچے جاتی تھیں۔ آج ایک معصوم وجود نے انھیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آج تک وہ ایک عام عورت تھیں مگر اب ان کے قدموں تلے بھی ایک جنت تھی۔ ہاں وہ ایک ماں تھیں۔

ایک ماں کا نازک اور موم دل لئے اب وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں کہ کہیں ان کے پیروں تلے کسی کا معصوم دل کچل کر نہ رہ جائے۔ ماں بننے کی پہلی پہلی لذت

سے گزر کر اب وہ اس دور سے گذر رہی تھیں جب کہ ان کی اولاد نے انھیں ماں کہہ کر پکار بھی لیا تھا۔ اب ان کے سینے میں بجائے گوشت پوست کے دل کے 'کانچ کا دل' تھا۔ جو ہلکی سی ٹھیس سے بھی چور چور ہو جاتا۔

رفو پھوپھی سے اب نا ممکن تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے وجود سے، اپنے دل سے، اپنی آنکھوں سے اپنے راج دلارے کو اوجھل کرتیں۔ ان کی سسرال سے ایک بار کسی عزیز کی شادی کا بلاوا آیا۔ انکار کرتیں تو کیسے۔؟ سسرال کا معاملہ تھا۔ اور شمو کو ساتھ لے جائیں تو کیسے؟ وہ تو انھیں امی کہتا تھا۔ اگر کوئی الٹی — سیدھی بات منہ سے نکال دیتا تو چار لوگوں میں کیا عزت رہ جاتی؟ اکیلا پن کیسے برداشت کرتیں؟ مگر ٹال نہ سکیں اور اکیلے ہی جانا پڑا۔ گئی تھیں کہ رات ہونے سے پہلے ہی آجاؤں گی۔ مگر وہاں وداعی میں اتنی دیر تھی کہ تارے کھل گئے۔ چاند چمک اٹھا ان کے اپنے دل میں بھی چاند کا عکس تھا۔ اور آنکھوں میں تارے۔ لاکھ ناں ناں کی مگر رکنا ہی پڑا۔

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے چلنے کی سوچی۔ رات بھر نیند ہی کہاں لگی تھی، جو اٹھنے نہ اٹھنے کا سوال پیدا ہوتا۔ وہ تو گھڑیاں گنتی بیٹھی تھیں۔ اسی جاگل نے ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے ڈال دیئے تھے۔ نیند کا نشہ الگ، جاگی جاگی آنکھوں کی گلابیاں ذہن سوا الگ۔ ان کی سوئی سوئی جوانی جیسے آج گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھی تھی۔ انگ انگ چٹخا پڑرہا تھا۔ اور جس وقت وہ چارپائی سے اتری ہیں اور زمین پر پاؤں رکھا ہے، ایک لمحے کو انھیں خود محسوس ہوا جیسے دیکھتے ہی دیکھتے زمین ان کے وزن سے چٹ چٹ بول جائے گی۔

ململی ساری کے آنچل سے سر کو ڈھانپے قاتل آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی نوکر کو کھوجتی پھرتی تھیں کہ سامنے سے اشرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے پہلے تو یونہی لاپروائی

سے دیکھا، مگر ایک نگاہ جو پڑ گئی تھی جیسے چپک کر ہی رہ گئی۔ یہ رفو بھابھی تھیں۔؟ رفو بیگم۔؟
رفو دلہن۔؟ رفو بیوہ۔ کتنے برس بیوگی کو ہو رہے تھے۔؟ پرانے خیالات رکھنے والے
لوگوں سے یہ کہاں ممکن تھا کہ اس قسم کی بات کا تصور بھی کر سکتے کہ بیوہ بہو کو پھر سے بیاہ
لائیں۔ کیا ہوا اشرف اگر مرنے والے کا چچا زاد بھائی تھا۔؟ تھا تو ہر لحاظ سے قابل!
اتنے دن گذر گئے مگر اشرف نے بھی کہیں شادی نہ کی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ دل میں بس رفو کی
یاد کا دیپ جلائے ہی بیٹھا ہو۔ مگر سوچا ضرور تھا کہ اگر یہ چراغ اسی کی تاریک کٹیا میں
جل اٹھتا تو۔؟
ایک قدم ــ دوسرا قدم ــ تیسرا قدم۔ رفو عمر کے اس دور میں تھی جب پھل کچے پن
کی حدوں سے گذر کر پکنے لگتا ہے۔ گدرایا گدرایا سا، رس بھرا۔ اور پہلے سے کہیں میٹھا۔
آنکھیں! اُف یہ آنکھیں! شاعر ایسی ہی قاتل آنکھوں پر شعر کہتے ہوں گے۔ آنگن
میں پلنگ ہی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ کوئی کروٹ لے
رہا تھا۔ کوئی کسمسا رہا تھا۔ اشرف کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا۔ لپک کر آگے بڑھا اور
بے چینی سے یوں بولا۔ جیسے برسوں سے یہی ایک بات کہنے کو بے چین تھا۔
"رفو، اکیلی کب تک زندگی بسر کرو گی۔؟ یہ سفر تو بہت ہی لمبا ہے اور تمہارے
ساتھ تو کوئی دوسرا ساتھی بھی نہیں۔"
رفو ایک لمحے کو سر سے پاؤں تک تھرتھرا اٹھی۔ بیوگی کے اتنے سارے بھیانک
سال۔ روتے گاتے، آنسو بہاتے، سسکتے ہوئے لمبے اور اکتا دینے والے سال۔
اس کی آنکھوں کے آگے سے ایک لمحے میں گذر گئے۔ سہارا۔؟
قبول کر لوں۔؟ ساتھی بنا زندگی کٹتی بھی تو نہیں۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ ادھر
روتے سسکتے اتنے سارے سال اور محرومیاں تھیں، جوان زندگی اور بے خواب راتوں

کے جان لیوا ستم تھے اور ادھر ایک ننھا منا چاند تھا۔ ہنستا مسکراتا۔ امی ! امی !

وہ چونکیں، پھر بڑے رسان سے دھیمے سروں میں بولیں۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں اشرف بھائی۔ مجھے زندگی سے اب کوئی گلہ نہیں۔ میں نے تورانی کے بچے کو گود لے لیا ہے۔"

ایک پھول کے لیے رفو پھوپھی سارے بھرے پرے باغ کو —— لہلہاتے باغ کو، ہنستے مسکراتے، لہکتے مہکتے باغ کو ٹھکرا آئیں۔

اب ان کا دماغ شمو کے علاوہ اور کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ عورت محبت کرنے پر آتی ہے تو اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔ چاہے وہ اولاد ہو یا شوہر، اپنا ہو یا پرایا۔ بس دل کی بات ہے۔ عورت نے دنیا میں شکست ہمیشہ اس محبت اور ممتا بھرے دل کے ہاتھوں کھائی ہے۔

دن ایسے ہی سر سر گزرے جا رہے تھے۔ اپنی جوانی اور حسن کی ساری رعنائیاں رفو پھوپھی نے، جیسے شمو کو دے ڈالیں۔ ابھی ابھی وہ گھٹنوں چلتا تھا۔! ابھی ابھی وہ پلنگ کی پٹی کا سہارا لے کر کھڑا ہونے لگا تھا۔! ابھی ابھی اس نے اپنے گلابی اور نرم ہونٹوں سے رفو پھوپھی کو امی کہہ کر پکارا تھا۔ ابھی ابھی وہ اپنی تین پہیوں والی سائیکل پہ بیٹھ کر مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا؟ ابھی ابھی اس نے اپنا بستہ اٹھایا تھا اور قاعدہ اٹھا کر الف بے اور اے، بی، سی، ڈی پڑھا تھا۔ ابھی ابھی اس نے گلابی چہرے اور ہنستی آنکھوں کے ساتھ آکر اپنی امی کو سنایا تھا "امی امی میں چھٹی کلاس میں فرسٹ آیا ہوں۔" ابھی ابھی اس نے میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ آکر استادوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اور ابھی وہ کالج سے سائیکل پر واپس لوٹا تھا اور بڑے پیار سے اپنی امّی سے کہہ رہا تھا۔

"امی، آپ نہیں سمجھتیں، آپ کی وجہ سے مجھے کتنی فکر لگی رہتی ہے۔ بھلا کوئی بات

بھی ہے کہ میں اتنا بڑا ہو کر یوں آپ سے کام لوں۔ کیا میں ایک چائے کی پیالی بھی اپنے ہاتھوں نہیں بنا سکتا۔؟"

رفو پھوپھی مسکرائیں۔ "بیٹے تو نہیں جانتا، تیرا کام کر کے، تیری ہنستی صورت دیکھ کر میرا دل کتنا بڑھ جاتا ہے۔ آخر ایک ماں اور اپنے بچے کے لئے کر ہی کیا سکتی ہے؟"

اک دم شمو ذرا رکا اور آہستگی سے بولا "امی۔ آپ ہی میری امی ہیں نا۔؟"

رفو پھوپھی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولیں۔ "کیوں اس میں تجھے کوئی شک ہے؟ وہی چڑیلیں زرینہ، شاہینہ وغیرہ تجھے ستا رہی ہوں گی نا؟"۔

"نہیں امی"۔ شمو ہنس کر بولا۔ "ویسے تو سب ہی کہتے رہتے ہیں، آجکل سے نہیں بہت زمانے سے کہ آپ میری امی نہیں پھوپھی ہیں"۔

"تو اس میں کیا فرق پڑتا ہے پگلے؟ بہر حال میں تیری ماں تو ہوں نا؟ کیا اتنی بات تیرے لئے کافی نہیں ہے۔"

شمو کا چہرہ اتر سا گیا۔ روہانسا ہو کر بولا۔ "امی ایسی بات نہ پوچھئے۔ دادی اماں سناتی رہتی ہیں کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے۔ رات کو رات نہیں سمجھا، دن کو دن نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ ہر ہر سکھ میرے لئے صرف کر دیا۔ اور تو اور آپ اپنی ساری جائداد بھی میرے نام کرائیں۔ سچ کبھی کبھار میں خود کو بے حد گناہگار محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا"۔

رفو پھوپھی نے اکدم لپک کر اپنا سوکھا ہوا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"خدا کے لئے چپ رہ جا شمو۔ ایسی بات کرتے تجھے ذرا سی شرم نہیں آتی۔ آخر میرے دل کا احساس کر۔ آخر میں کس کے لئے جی۔ اور کس کے لئے مروں گی؟" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

شمو رکا اور بے بسی سے بولا۔ "کہنے جیسی بات تو نہیں ہے امی۔ مگر واقعی آپ اپنی زندگی سنوار بھی سکتی تھیں۔ میرے وجود نے آپ کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔"

رفو پھوپھی تڑپ اٹھیں "شمو! ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کا منہ تمتما رہا تھا اور زندگی کا ہر سر بیتا لمحہ جیسے ٹھٹھک گیا تھا، رک کر، چمکار چمکار کر کہہ رہا تھا۔ "سچ کہنا، کیا کبھی تمہیں بیتے دنوں پر افسوس نہیں ہوتا۔؟ کیا اپنی پھولوں بھری جوانی کو یوں برباد کرتے تمھیں کوئی کڑھن نہیں ہوتی؟"

اس رات شمو نے جب جب بھی پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر امّی کے پلنگ کی طرف دیکھا، پلنگ کو ننھی ننھی سسکیوں سے لرزتا پایا۔

شمیم میاں ایم، بی بی، ایس کے تھرڈ ایر میں تھے کہ ان کی لیلی پھڑکی۔ اڑتے اڑتے یہ بات رفو پھوپھی کے کانوں تک بھی آگئی۔ رفو پھوپھی کے دل کو کیا کیا ارمان لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے تو طے کر رکھا تھا کہ کسی اچھے شریف خاندان کی بجید پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ زندگی نے جو جو ستم ان کے ساتھ کئے تھے گن گن کر ان ظلم و ستم کا بدلہ لیں گی اور بہو بیٹے اور پوتے پوتیوں سے بھرے پُرے آنگن میں بیٹھ کر ہنستی ہنستی ہی اس دنیا سے دوسری دنیا کو جائیں گی۔ مگر لکھا تھا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی، کیونکہ شمو میاں نے جس جگہ دل لگایا تھا وہاں کسی کی مرضی نہ تھی۔ پتہ نہیں اپنے کون سے پروفیسر کی لڑکی پر ریجھ گئے تھے۔ خاندان کی بات تو جانے ہی دو۔ بٹیا رانی ابھی میٹرک بھی نہ کر سکی تھیں اور مزے سے سائیکل پر دوپٹہ اڑاتی اسکول آیا جایا کرتی تھیں۔

اگر صرف رفو پھوپھی کا واسطہ ہوتا تو شمو میاں کو اتنی لگ لگاہٹ بھی نہ ہوتی۔ مگر یہاں تو پورے خاندان سے ٹکر لینے کا سوال تھا اور پھر ابھی تعلیم بھی ادھوری

تھی اور نوکری کا کوئی ٹھاؤ ٹھان ہی نہ تھا۔ یوں پیسہ تو اتنا تھا کہ چاہتے تو چار لوگوں کو کھلاتے تب بھی عمر بھر گھر بیٹھے کھا سکتے تھے۔ مگر گھر میں بیٹھا مرد بھی کہیں بھلا لگتا ہے۔

رفو پھوپھی لاکھ بے خبر تھیں۔ مگر چہرے کی آڑی آڑی رنگت اور بہکی بہکی چال ڈھال سے بھانپ گئیں کہ شمو میاں نے ضرور کہیں دل اٹکا لیا ہے۔ اِدھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کی، ان کا خیال غلط نہ تھا۔ اماں بیگم کی سرکار میں جب پیشی ہوئی تو وہ کفن پھاڑ کر چلا اٹھیں۔ اور الٹے جب رفو پھوپھی نے ہی بیٹے کی پشت پناہی کی تو وہ چلا اٹھیں۔

"جائداد کا حبہ حبہ بھی آگے ہی اس کے نام کر دیا ہے اور اوپر سے بہو بھی وہ اونچے خاندان کی لا رہی ہے۔ اری دیکھنا تجھے دانے دانے کو ترسا دیں گے۔ پتہ نہیں اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ پنچ اور پنچ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ عمر جیسی عمر ایسی ہی نا سمجھی میں گزار دی۔"

مگر رفو پھوپھی چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ عشق تو شمو میاں نے کیا تھا۔ ہجر و فراق کے اثرات ان کی صورت سے ہویدا تھے۔ رنگ پیلا۔ الجھے الجھے بال، ہونق چہرہ کوئی دیکھتا تو یہی کہتا اب تب ہو رہی ہیں۔ اس ضد ضد میں ہی سال بھر نکل گیا۔ مگر شمو میاں کا جی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ وہی ایک لگن تھی، وہی ایک رٹ۔ تھک ہار کے بڑے بوڑھے بھی چپ ہو رہے۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے آگے گھاس پھوس ٹکتا ہی کب ہے۔؟

رفو پھوپھی نے اپنے جہیز اور چڑھاوے کے سارے جوڑے اور پورا زیور یوں ہی اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ بڑے جتن سے تمام چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

گوٹے کناری پر نیا کپڑا لگوا رہی تھیں، اور زیور کے فیشن بدل چکے تھے تو ڈیزائن بدلوانے پر مصر تھیں۔ رہی سہی ساری پونجی انہوں نے شادی کے ہنگاموں پر لگا دی۔ وہ سچ مچ کی ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا۔؟ ان کے سینے میں ماں کا دل تو دھڑکتا تھا۔! یہ وہی تو تھیں نا جنہوں نے رات رات بھر جاگ کر، روئی کی بتی بنا بنا کر اپنے شمو کو دودھ پلایا تھا، اس کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ نوکروں کی فوج ہونے کے باوجود ارمانوں کے ساتھ خود ہی تو موت کے بھرے پوتڑے، رومالیاں دھوئی تھیں۔ یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے شمو کی ہلکی سی بیماری پر اپنے آپ پر رات رات بھر کی نیند حرام کر لی تھی۔ یہ وہی تو تھیں نا جنہوں نے اپنی زندگی کی ہر ہر خوشی، ہر ہر سکھ، ہر ہر پیار بھرا لمحہ شمو پر قربان کر دیا تھا۔ کیا ایک ماں اسی وقت ماں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے سینے سے ایک بچے کو دودھ پلا دے۔؟ کیا محض اپنے بطن سے پیدا کر دینے والی ماں ہی کہلا سکتی ہے؟ نہیں تو اپنی جان نثار کر دینے والی دکھی روح کو اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ کیا سات آسمانوں کے اوپر رہنے والا اتنا نا انصاف تھا کہ وہ انہیں ماں پن کی عزت اور لذت سے محروم کر دیتا؟ شادی کے دن رفو پھوپھی کی خوشی دیکھی، نہ جاتی تھی۔ اپنے ہاتھوں انہوں نے ہر کام نپٹایا تھا۔ مہمانوں، رشتہ داروں، دوستوں، نوکروں سے گھر بھرا پڑا تھا۔ مگر وہ ہر ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے، اپنی خوشی سے کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ہوا جو شمو نے ان کی پسند سے شادی نہ کی۔ زندگی کسے گزارنی تھی۔ شمو کو یا انھیں۔؟ یہ تو اچھا ہی تھا نا کہ میاں بی بی نے ایک دوسرے کو پہچان کر ہاتھ بڑھایا تھا۔ پھر وہ اپنے جگر گوشے کی خوشی پر کیسے نہ خوش ہوتیں۔

شادی پورے زور شور سے ہوئی۔ برات بینڈ باجے کے ساتھ دلہن دولہا کو لے کر گھر آئی۔ راستہ بھر آتشبازیاں چھوٹتی رہیں اور رفو پھوپھی خود اپنے ہاتھوں پیسے لٹاتی رہیں۔ آج کوئی رفو پھوپھی کی خوشی دیکھتا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر

جوانی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکراتیں۔ ان کے پژمردہ اور پیلے چہرے پر آج گلابیاں اڈ رہی تھیں۔

دلہن کا کمرہ بھی خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ پھولوں کی بہتات سے کمرے پر کسی خطۂ باغ کا گمان ہو رہا تھا۔ مقیش کے تاروں اور چاندی کے پتلے پتلے پھولوں سے مسہری جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ چھپر کھٹ پر دلہن سر نیہوڑائے بیٹھی تھی اور رفو پھوپھی آتے جاتے پر مسرت انداز سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کب چاند چڑھے اور یہ کلی پھول بن کر مہکے۔

کھانے دانے اور ریت رسموں سے فارغ ہونے پر جب دولہا کو اوپر لایا گیا تو اچانک رفو پھوپھی نے محسوس کیا کہ سہرے کی لڑیوں میں سے جھانکتا ہوا شمو کا چہرہ کچھ اداس اداس سا نظر آ رہا ہے۔ آج کا دن مسرتوں، ارمانوں، آرزوؤں کا دن اور شمو کے چہرے پر پژمردگی؟ وہ بے کل بے کل سی، بولائی بولائی سی اِدھر اُدھر پھرنے لگیں کہ بھیڑ چھنٹے اور موقع ملے تو وہ شمو سے کچھ بات کریں مگر دلہن دولہا کے آس پاس وہ جھوڑ جھمکا تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے بجتے سب ماؤں نے اپنے بچوں کو سلایا۔ مہمان بیبیاں مع پاپا کر اپنے جھروکوں میں گھسیں۔ باجے والوں نے شطرنجیوں اور ٹاٹوں میں لپیٹ لپیٹ کر باجے رکھ دیئے اور چھت خالی ہو گئی۔

شمو اکیلا کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ دلہن اندر کمرے میں تھی۔ رفو پھوپھی بے تابی سے لپکی ہوئی آئیں اور چھوٹتے ہی بولیں۔ ”شمیم صاف

”میرے لال۔ کیا بات ہے۔؟ چہرہ یہ اُترا اُترا سا کیوں ہے۔؟“

ٹال گیا اور چہرہ نیچا کر کے بولا۔ ”کوئی بات نہیں امی۔ آج تو میں حد سے سوا خوش ہوں۔

آپ جی نہ کڑھائیے ۔"

مگر رفو پھوپھی کا جی نہ مانا۔ وہ گلے کا ہار ہوگئیں اور قسمیں دے دے کر اُس کی اُداسی کا سبب پوچھنے لگیں۔ شمیم نے جیسے حلق میں پھنسا ہوا گولہ نیچے اتارا اور اٹک اٹک کر بولا۔

"جی کچھ تو نہیں ہیں بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آج میری اماں ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں۔"

"میری اماں۔ !"

"میری اماں۔ !"

"میری اماں۔ !" تو پھر وہ کون تھیں ۔؟؟

رفو پھوپھی کا سر گھومنے لگا۔ زمین، آسمان سب گھومنے لگے ۔ تاروں بھرا آسمان چکر کھانے لگا۔ پھولوں بھری زمین چکر کھانے لگی۔

انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر ہر لمحہ وہ بے سدھ ہوتی جارہی تھیں۔ چٹ سے ان کو اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑنا چاہا، مگر اسی لمحے ان کے ہاتھوں کا سارا زور ختم ہوگیا اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑیں۔

ختم شد

بے مثال ادیبہ — واجدہ تبسم

لاجواب ادارہ — اوُرسیز بُک سینٹر

وہ شخص تنہا نہیں جس کے پاس واجدہ تبسم کی یہ کتابیں ہیں

۱۔ شہرِ ممنوع چوتھا ایڈیشن اولین کہانیاں ۲۵ روپے

۲۔ آیا بسنت سکھی طویل کہانیاں ۲۰ روپے

۳۔ اُترن دکنی زبان میں حیدرآبادی ماحول پر کہانیاں ۲۰ "

۴۔ نتھ کا بوجھ گھریلو کہانیاں ۲۰ "

۵۔ پھول کھلنے دو ۔ قومی یکجہتی پر کہانیاں ۲۰ "

۶ زخمِ دل اور مہک رومانٹک کہانیاں ۲۰ "

۷۔ بند دروازے بچوں کی کہانیاں ۱۲ "

۸۔ جیسے دریا نمایاں ترین کہانیاں ۲۰ "

۹۔ مولسری کی چھاؤں ڈھکی چھپی کہانیاں ۲۰ "

۱۰۔ نتھ اترائی طوائفوں پر کہانیاں ۲۰ "

۱۱۔ چشمِ خوں فشاں زوالِ حیدرآباد پر ناول ۲۰ "

۱۲ صبحِ رخسار شعری مجموعہ ۲۰ "

ملنے کا پتہ :- ۶/۵ ریلوے بلاک ۱۳۱ فلیٹ نمبر ۱۰
سنتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

فون: ۵۷۸۲۶۳